بإسمہٖ تعالیٰ

سلسلۂ معارف القرآن

حضرت زکریا۔ حضرت یحییٰ۔ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کا تذکار جلیلہ۔
سلسلۂ انبیائے کرام پر نگہِ بازگشت۔ اور اقوام عالم کے عروج و زوال کے
ابدی اصول

پرویز

شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

قرآنی حقائق کو عام فہم اور بصیرت افروز انداز میں پیش کرنے کے لئے معارف القرآن کا جو سلسلہ آج سے تقریباً بیس سال پہلے شروع کیا گیا تھا اس کی پہلی جلد سنہ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں خدا کے تصور اور اس کی صفات سے متعلق بحث تھی۔ اس سلسلہ کی دوسری اور تیسری کڑی سنہ ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ دوسری جلد میں انسان، آدم ملائکہ۔ ابلیس۔ شیطان۔ جن۔ وحی وغیرہ عنوانات کے علاوہ حضرت نوح۔ حضرت ہود۔ حضرت صالح علیہم السلام کے کوائف حیات۔ شامل تھے۔ تیسری جلد حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک کے انبیاء کے تذکار جلیلہ پر مشتمل تھی۔ چوتھی جلد جو حضور خاتم النبیینؐ کی سیرت طیبہ سے متعلق تھی معراج انسانیت کے عنوان سے سنہ ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی۔

اس سلسلہ کی پہلی تین جلدیں عرصہ سے نایاب تھیں۔ جب ان کی اشاعت نو کا سوال سامنے آیا تو ان کے مضامین پر نظر ثانی کے علاوہ ان کی ترتیب بدلنے کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ اس سلسلہ کی ترتیب نو یوں قرار پائی۔

(۱) **ابلیس و آدم** — انسان۔ آدم۔ ملائکہ۔ ابلیس۔ شیطان۔ جن۔ روح۔ وحی۔ رسالت وغیرہ عنوانات کے متعلق حقیقت کشا بحث۔

(۲) **جوئے نور** — حضرت نوحؑ سے لیکر حضرت شعیبؑ تک انبیاء کرام کا تذکرہ جلیلہ۔

(۳) **برق طور** — حضرت موسیٰؑ اور دیگر انبیائے بنی اسرائیل کے کوائف حیات اور بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان۔

(۴) **شعلۂ مستور** — زیر نظر کتاب جس میں حضرت زکریاؑ۔ حضرت یحییٰؑ۔ اور حضرت عیسیٰؑ کے سوانح زندگی کے علاوہ سلسلۂ انبیاء کرام پر نگہ باز گشت اور اقوام سابقہ کی موت و حیات کے ابدی اصول مذکور ہیں۔

اس سلسلہ کی پہلی کڑی (یعنی اللہ سے متعلق جلد) کی اشاعتِ نو کی باری ابھی نہیں آئی۔ لیکن وہ نظرثانی کے بعد طباعت کے لئے تیار ہے۔ اور امید ہے کہ اس جلد کے فوری بعد وہ بھی آپ کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گی۔ اب اس کا عنوان "من و یزداں" ہوگا۔ اس میں انسان اور خدا کے تعلقات پر ایسے انداز سے روشنی ڈالی گئی جو اس سے پہلے شاید آپ کی نگاہ سے نہ گذرا ہو۔

جیسا کہ میں اس سلسلہ کی سابقہ جلدوں میں لکھ چکا ہوں۔ ان مجلدات میں ایک تو قرآن کریم کی آیات ہیں جو ایک خاص ربط کے ماتحت درج کی گئی ہیں اور دوسرے ان آیات کی وضاحت ہے۔ جہاں تک ان کی وضاحت کا تعلق ہے وہ میری فکر کا نتیجہ ہے جس میں سہو و خطا کا امکان ہر وقت ہے۔ لہٰذا اگر آپ کو میری اس فکر سے کہیں اختلاف ہو تو آپ متعلقہ آیات کا مفہوم خود متعین کریں۔ میرا مقصد درحقیقت یہ ہے کہ آپ براہِ راست قرآن پر غور کریں۔

چونکہ میرا اپنا ترجمۂ قرآن ابھی تک شائع نہیں ہوا اس لئے آیات کے ترجمہ میں مروجہ تراجم ہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ بجز ایسے مقامات کے جہاں کسی تبدیلی کو ناگزیر سمجھا گیا ہے۔

آیات کے حوالہ میں اوپر سورت کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا۔ مثلاً ۳/۲۰ کا مطلب ہے سورۂ آل عمران کی بیسویں آیت۔ اگر کوئی آیت حوالہ کے مطابق نہ ملے تو ایک دو آیات آگے پیچھے دیکھ لیں۔ کیونکہ قرآن کریم کے مختلف نسخوں میں آیات کے شمار میں قدرے اختلاف ہوتا ہے۔

آخر میں چند الفاظ کتاب کے نام کے متعلق بھی ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ جیسا کہ سلسلۂ معارف القرآن کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو گیا ہوگا، حضرات انبیاء کرامؑ آسمانی انقلاب کے داعی ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا مشن یہ ہوتا ہے کہ طاغوتی قوتوں کو شکست دے کر ان کی جگہ ایک ایسا معاشرہ قائم کریں جو قوانین خداوندی پر متشکل ہو۔ حضرت عیسیٰؑ بھی اس سلسلۂ زریں کی ایک اہم کڑی تھے اور ان کا مقصدِ رسالت یہی آسمانی انقلاب تھا۔ لیکن اس انقلابی جدوجہد کی صرف ایک جھلک ہمارے سامنے آتی ہے جس کے بعد آپ ہجرت کر جاتے ہیں۔ ہجرت کے بعد کے واقعات قرآن نے بیان نہیں کئے۔ اس اعتبار سے کتاب کا عنوان شعلۂ مستور تجویز کیا گیا ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی امت نے بھی انقلابی دعوت کی بجائے خانقاہیت کی زندگی کو مقصودِ دین قرار دے لیا اور اس طرح یہ برقِ خاطف غاروں میں چھپ کر رہ گئی۔ یہی مستور شعلے نبی اکرمؐ کے عہد میں اس درخشندگی و تابندگی سے بے نقاب ہوئے کہ ان سے ساری فضائے عالم مرقعِ نور و نار بن گئی۔ نار، باطل کے ہر خس و خاشاک کے لئے اور نور، ہر نگۂ بصیرت طلب کے لئے۔ تفصیل اس اجمال کی آپ کو "معراج انسانیت" میں ملے گی۔

والسلام

پرویز

مئی سنہ ۱۹۵۸ء

۲۵-بی۔ گلبرگ کالونی۔ لاہور

فہرست مشمولات

شعلۂ مستور

اصحاب کہف از صفحہ ۱۴۵ تا صفحہ ۱۶۰

تلک الرسل از صفحہ ۱۶۱ تا صفحہ ۲۱۴

تلک امۃ قد خلت صفحہ ۲۱۵ تا صفحہ ۲۴۲

وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝ (۱۹/۱۵)

قافلۂ بہار را طائرِ پیش رس نگر!

حضرت زکریّا و یحییٰ علیہما السلام

وہ کاروانِ رشد و سعادت، جو صبحِ ازل خراماں خراماں سوئے منزل روانہ ہوا تھا۔ اب رفتہ رفتہ منزل کے قریب آتا جا رہا ہے۔ اس کعبۂ مقصود سے ایک پڑاؤ ادھر مقام مسیح ناصری (علیہ السلام) ہے اور جس مقدس سنگِ میل پر ہم اب پہنچے ہیں وہ اس مقام کا گویا نشانِ راہ ہے۔ یعنی حضرت زکریاؑ جن کی کفالت میں حضرت مریمؑ کو تفویض کیا گیا۔ (۳/۳۶) اور حضرت یحییٰؑ (یوحنا) جنہوں نے قریہ قریہ میں (حضرت) مسیحؑ کی منادی کی سورۂ آل عمران میں ہے۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۖ إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ○ (۳/۳۸)

اسی جگہ کا یہ معاملہ ہے (یعنی قربان گاہ کا) کہ زکریا نے اپنے پروردگار کے حضور دعا مانگی تھی " خدایا! تو اپنے خاص فضل سے مجھے پاک نسل عطا فرما (جو مریم کی طرح نیک اور عبادت گزار ہو) بلاشبہ تو ہی ہے کہ دعائیں سننے والا اور التجائیں قبول کرنے والا ہے!"

اللہ نے اس دعا کو قبول فرمایا اور ایک فرزند صالح کی بشارت دی۔

فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا

وَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (۳/۳۹)

پھر ایسا ہوا کہ فرشتوں نے زکریا کو پکارا، اور وہ محراب میں کھڑا مصروف دعا تھا۔ "خدا تجھ یحییٰ کی (یعنی ایک لڑکے کی جو پیدا ہوگا اور اس کا نام یحییٰ رکھا جائے) بشارت دیتا ہے۔ وہ خدا کے حکم سے ایک ہونے والے ظہور کی تصدیق کرنے والا جماعت کا سردار، پارسا و مرتاض، اور خدا کے صالح بندوں میں سے ایک نبی ہوگا۔

بیٹے کی خوشخبری اس بشارت پر حضرت زکریا متعجب ہوئے۔ جیسے اس سے پیشتر حضرت ابراہیم کی بیوی بیٹے کی خوشخبری پر حیران ہوئی تھیں۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِىَ الْكِبَرُ وَ امْرَاَتِىْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝ (۳/۴۰)

زکریا نے جب یہ سنا تو کہا "خدایا! میرے یہاں لڑکا کیسے ہوسکتا ہے جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے؟" حکم الٰہی ہوا "اسی طرح اللہ اپنے قانون مشیت کے مطابق جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

آپ نے عرض کیا کہ بار الہا! اس بشارت کی نشانی کیا ہے؟ فرمایا کہ اللہ کے حضور اور خشوع و خضوع سے جھکو اور روزہ رکھو۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّىْۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِىِّ وَ الْاِبْكَارِ (۳/۴۱)

اس پر زکریا نے عرض کیا "خدایا! اس بارے میں میرے لئے کوئی بات بطور نشانی کے ٹھہرا دے"۔ ارشاد ہوا "نشانی یہ ہے کہ تین دن تک بات چیت نہ کرو مگر صرف اشارہ سے (یعنی روزہ رکھو جیسا کہ اُس زمانے میں دستور تھا) اور اپنے پروردگار کا کثرت کے ساتھ ذکر کرو۔ اور صبح و شام اس کی حمد و ثنا میں مشغول رہو۔

یہودیوں میں روزہ میں بات چیت بھی منع تھی۔ لوقا کی انجیل میں اس واقعہ کا تذکرہ ان الفاظ میں آیا ہے۔

یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ابیاہ کے فریق میں سے زکریاہ نام کا ایک کاہن تھا اور

---

[1] ان الفاظ کا مطلب دوسرا بھی ہوسکتا ہے لیکن اس کے لئے میرے لغت کا انتظار کیجئے۔ اس مقام پر (حسب معمول) مروجہ ترجمہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اس کی بیوی ہارون کی اولاد میں سے تھی اور اس کا نام الیشبع تھا۔ اور وہ دونوں خدا کے حضور راستباز اور خداوند کے سارے حکموں اور قانون پر بے عیب چلنے والے تھے اور ان کے اولاد نہ تھی کیونکہ الیشبع بانجھ تھی اور دونوں عمر رسیدہ تھے۔

جب وہ خدا کے حضور اپنے فریق کی باری پر کہانت کا کام انجام دیتا تھا تو ایسا ہوا کہ کہانت کے دستور کے موافق اس کے نام کا قرعہ نکلا کہ خداوند کے مقدس میں جاکر خوشبو جلائے۔ اور لوگوں کی ساری جماعت خوشبو جلاتے وقت باہر دعا مانگ رہی تھی۔ کہ خداوند کا فرشتہ خوشبو کے مذبح کی دہنی طرف کھڑا ہوا اس کو دکھائی دیا۔ اور زکریاہ دیکھ کر گھبرایا اور اس پر دہشت چھا گئی۔ مگر فرشتے نے اس سے کہا۔ اے زکریاہ خوف نہ کر۔ کیونکہ تیری دعا سن لی گئی اور تیری بیوی الیشبع تیرے لئے بیٹا جنے گی۔ تو اس کا نام یوحنا رکھنا۔ اور تجھے خوشی و خرمی ہوگی۔ اور بہت سے لوگ اس کی پیدائش کے سبب خوش ہوں گے۔ کیونکہ وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا اور ہرگز نہ مے نہ کوئی اور شراب پئیگا۔ اور اپنی ماں کے پیٹ ہی سے روح القدس سے بھر جائے گا۔ اور بہت سے بنی اسرائیل کو خداوند کی طرف جو ان کا خدا ہے پھیرے گا۔ اور وہ ایلیاہ کی روح اور قوت میں اس کے آگے آگے چلے گا۔ کہ والدوں کے دل اولاد کی طرف اور نافرمانوں کو راستبازوں کی دانائی پر چلنے کی طرف پھیرے اور خداوند کے لئے ایک مستعد قوم تیار کرے۔ زکریاہ نے فرشتے سے کہا، میں اس بات کو کس طرح جانوں کیونکہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی عمر رسیدہ ہے۔ فرشتے نے جواب میں اس سے کہا میں جبرئیل ہوں جو خدا کے حضور کھڑا رہتا ہوں اور اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ تجھ سے کلام کروں اور تجھے ان باتوں کی خوشخبری دوں۔ اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہولیں تو چپکا رہے گا اور بول نہ سکیگا۔ اس لئے کہ تو نے میری باتوں کا جو اپنے وقت پر پوری ہوں گی یقین نہ کیا اور لوگ زکریاہ کی راہ دیکھتے اور تعجب کرتے تھے کہ اسے مقدس میں کیوں دیر لگی۔ جب وہ باہر آیا تو ان سے بول نہ سکا۔ پس انہوں نے معلوم کیا کہ اس نے مقدس میں رویا دیکھی ہے۔ اور وہ ان سے اشارے کرتا تھا اور گونگا ہی رہا۔ پھر ایسا ہوا کہ جب اس کی خدمت کے دن پورے ہوئے وہ اپنے گھر گیا۔

لوقا کی انجیل (۱ ۵ — ۲۳)

(قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ حضرت زکریاؑ کی قوت گویائی سلب ہو گئی تھی) اس کے بعد حضرت یحییٰؑ (یوحنا، بپتسمہ دینے والے) کی ولادت کا ذکر ہے۔

اور وہ لڑکا بڑھتا اور روح میں قوت پاتا گیا۔ اور اسرائیل پر ظاہر ہونے کے دن تک

جنگلوں میں رہا۔ (لوقا کی انجیل ۱)

سورہ مریم میں ہے۔

إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ نِدَاءً خَفِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّي وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا وَلَمْ أَكُنْ بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝ وَإِنِّي خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَرَائِي وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا فَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۝ يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝ (۱۹:۶)

جب ایسا ہوا تھا کہ زکریا نے چپکے چپکے اپنے پروردگار کو پکارا اس نے عرض کیا "پروردگار! میرا جسم کمزور پڑ گیا ہے، میرے سر کے بال بڑھاپے سے بالکل سفید ہو گئے۔ خدایا! کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں تیری جناب میں دعا کی ہو اور محروم رہا ہوں، مجھے اپنے مرنے کے بعد اپنے بھائی بندوں سے اندیشہ ہے (کہ نہیں معلوم وہ کیا کریں) اور میری بیوی بانجھ ہے (اس لئے بظاہر حالات اولاد کی امید نہیں) پس تو اپنے فضل خاص سے مجھے ایک وارث بخش دے۔ ایسا وارث جو میرا بھی وارث ہو اور خاندان یعقوب (کی برکتوں) کا بھی۔ اور پروردگار! اسے ایسا کر دیجیو کہ (تیرے اور تیرے بندوں کی نظر میں) پسندیدہ ہو!"

ہم اس سے پیشتر (برق طور میں) حضرت داؤد علیہ السلام کے تذکرہ میں دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کو حضرت داؤد علیہ السلام کا وارث کہہ کر پکارا ہے۔ یہاں حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے وارث کے لئے بحضور رب العزت دعا مانگی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام رہبانیت کی زندگی بسر نہیں کیا کرتے تھے۔ ان کے اہل و عیال ہوتے تھے اور وہ اولاد کے لئے بھی آرزو رکھتے تھے۔ انبیاء بنی اسرائیل کے سلسلہ میں یہ حقیقت بھی سامنے آ چکی ہے کہ ان میں (اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق) بعض حالات میں باپ بھی نبی ہوتا تھا اور بیٹا بھی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ نبوت، باپ سے بیٹے کی طرف وراثتاً منتقل ہوتی تھی۔ نبوت یکسر وہبی طور پر ملتی ہے۔ اس میں نہ ذاتی کسب و ہنر کو کوئی دخل ہوتا ہے۔ نہ حسب و نسب کا کوئی تعلق۔

بہرحال حضرت زکریاؑ نے دعا مانگی جس کے جواب میں ارشاد ہوا۔

يَا زَكَرِيَّا إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ اسْمُهُ يَحْيَىٰ لَمْ نَجْعَلْ لَهُ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝ (۱۹:۷)

(اس پر حکم ہوا) "اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی (پیدائش کی) خوشخبری دیتے ہیں۔ اس کا نام یحییٰ رکھا جائے۔ اس سے پہلے ہم نے کسی کے لئے یہ نام نہیں ٹھہرایا ہے۔"

انجیل لوقا میں ہے۔

اور آٹھویں دن ایسا ہوا کہ وہ لڑکے کا ختنہ کرنے آئے اور اس کا نام اس کے باپ کے نام پر زکریا رکھنے لگے۔ مگر اُس کی ماں نے کہا۔ نہیں۔ بلکہ اس کا نام یوحنا رکھا جائے۔ اُنھوں نے اس سے کہا کہ تیرے کنبے میں کسی کا یہ نام نہیں۔ اور اُنھوں نے اس کے باپ کو اشارہ کیا کہ تو اس کا نام کیا رکھنا چاہتا ہے اس نے تختی منگا کے یہ لکھا کہ اس کا نام یوحنا ہے۔ اور سب نے تعجب کیا۔ اُسی دم اُس کا مُنہ اور زبان کُھل گئی اور وہ بولنے اور خدا کی حمد کرنے لگا۔ (لوقا کی انجیل ۱/۵۹-۶۴)

اس سے بھی ظاہر ہے کہ یہ نام بالکل نیا[1] تھا۔ اس بشارت پر حضرت زکریا نے عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ کَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْکِبَرِ عِتِیًّا ○ (۱۹/۸)

زکریا نے (متعجب ہوکر) کہا "پروردگار! میرے یہاں لڑکا کیسے ہوسکتا ہے؟ میری بیوی بانجھ ہوچکی اور میرا بڑھاپا دور تک پہنچ چکا"۔

ارشاد ہوا۔

قَالَ کَذٰلِکَ ۚ قَالَ رَبُّکَ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُکَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَکُ شَیْئًا ○ (۱۹/۹)

ارشاد ہوا "ایسا ہی ہوگا۔ تیرا پروردگار فرماتا ہے ایسا کرنا میرے لئے کچھ مشکل نہیں ہے۔ میں نے

---

[1] سمیاً کے معنی نظیر اور مثیل کے بھی ہیں۔ مثلاً اسی سورۂ مریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق بیان ہوا ہے کہ۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِیًّا ○ (۱۹/۶۵)

آسمان اور زمین کا پروردگار جو آسمان و زمین میں ہیں، سوائے پیغمبر! اسی کی عبودیت (اطاعت و محکومیت) اختیار کرو۔ اس کی عبودیت کی راہ میں جو کچھ پیش آئے اسے استقامت سے برداشت کر۔ کیا تیرے جانتے کوئی دوسرا بھی اس کی نظیر ہے (یعنی اُس جیسا ہے؟)

اگر حضرت یحییٰ کے متعلق (آیت ۷ میں جو متن میں لکھی جاچکی ہے) بھی یہی معنی لئے جائیں تو آیت متذکرہ صدر کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ پیدا ہونے والا لڑکا بے نظیر ہوگا۔ انجیل متی میں ہے کہ حضرت یحییٰ کے متعلق حضرت عیسیٰ نے فرمایا۔

میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو عورتوں سے پیدا ہوئے ہیں ان میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے کوئی بڑا نہیں ہوا۔

اس سے پہلے خود تجھے پیدا کیا۔ حالانکہ تیری ہستی کا نام و نشان تک نہ تھا"

حضرت زکریاؑ نے اس کے لئے نشانی کی درخواست کی تو فرمایا۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝ (۱۹/۱۰)

اس پر زکریا نے عرض کیا "خدایا! میرے لئے (اس بارے میں) ایک نشانی ٹھہرا دے"! فرمایا "تیری نشانی یہ ہے کہ تین رات لگاتار لوگوں سے بات نہ کرے"

چنانچہ حضرت زکریاؑ ہیکل سے نکل کر باہر آئے اور لوگوں سے اشارہ سے بات کی۔

فَخَرَجَ عَلٰي قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِـيًّا ۝ (۱۹/۱۱)

پھر وہ قربان گاہ سے نکلا اور اپنے لوگوں میں آیا (جو حسب معمول اس کا انتظار کر رہے تھے) اس نے ان سے اشارہ سے کہا۔ "صبح و شام خدا کی پاکی و جلال کی صدائیں بلند کرتے رہو"

حضرت یحییٰؑ

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں وہ فرزند عطا فرمایا جسے بچپن میں ہی فہم و بصیرت عطا کر دی گئی اور جسے حکم دیا کہ وہ قوانین الٰہیہ پر کاربند رہے۔

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝ (۱۹/۱۲)

"اے یحییٰ! (خدا کا حکم ہوا، کیونکہ وہ خوشخبری کے مطابق پیدا ہوا اور بڑھا) "کتاب الٰہی کے پیچھے مضبوطی سے لگ جا" چنانچہ وہ ابھی لڑکا ہی تھا کہ ہم نے اسے علم و فضیلت بخشدی۔

آپ کو ان تمام خصوصیات حسنہ سے نوازا گیا جو باعث شرف انسانیت ہیں۔

وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ۝ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝ (۱۹/۱۳—۱۵)

نیز اپنے فضل خاص سے دل کی نرمی اور نفس کی پاکیزگی عطا فرمائی۔ وہ تقویٰ شعار اور ماں باپ کا خدمت گزار تھا۔ سخت گیر اور نافرمان نہ تھا۔ اس پر سلام ہو (یعنی سلامتی ہو) جس دن پیدا ہوا، اور جس دن مرا، اور جس دن پھر زندہ اٹھایا جائے گا!

سورۂ انبیاء میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَ زَكَرِيَّا إِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّ أَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِيْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ز وَ وَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَ أَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ط إِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ط وَ كَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝ (۲۱/۸۹-۹۰)

اور (اسی طرح) زکریا (کا معاملہ یاد کرو) جب اُس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا "خدایا! مجھے (اس دنیا میں) اکیلا نہ چھوڑ اور (ویسے تو) تو ہی (ہم سب کا) بہتر وارث ہے!" (تو دیکھو) ہم نے اس کی پکار سن لی۔ اُسے (ایک فرزند) یحییٰ عطا فرمایا، اور اس کی بیوی کو اس کے لئے تندرست کردیا۔ یہ تمام لوگ نیکی کی راہوں میں سرگرم تھے، (ہمارے فضل سے) امید لگائے ہوئے اور (ہمارے قانون مکافات سے) ڈرتے ہوئے ہمیں پکارتے تھے، اور ہمارے آگے عجز و نیاز سے جھکے ہوئے تھے!

یہاں وَ أَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ کا ٹکڑا قابلِ غور ہے۔ حضرت زکریا نے عرض کیا تھا کہ میری بیوی عقیم ہے اس لئے اس کے ہاں بچہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کی بیوی میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کردی (وَ أَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ) كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ (۳/۴۰) اللہ اپنی مشیت کو اس طرح پورا کر دیا کرتا ہے۔

حضرت زکریا اور یحییٰ (علیہما السلام) کا نام دیگر انبیائے کرام کے زمرہ میں سورۂ انعام میں آیا ہے۔

وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيْسٰى وَ إِلْيَاسَ ط كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (۶/۸۵)

اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، اور الیاس کو کہ یہ سب صالح انسانوں میں سے تھے۔

تورات میں زکریاہ نبی کا ایک صحیفہ بھی موجود ہے لیکن ان کا زمانہ بہت پہلے کا ہے۔ اس لئے حضرت یحییٰ کے والد (حضرت زکریا) اُن سے الگ شخصیت ہیں۔

فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ

(احیائے بنی اسرائیل کی آخری کوشش)

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشتِ پرے داری
بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

حضرت
عیسیٰ علیہ السلام

اُمم سابقہ کے احوال و ظروف پر جن کا تذکرہ جوئے نور اور برق طور میں آچکا ہے۔ نگاہ ڈالیے۔ ایک حقیقت واضح طور پر سامنے آجائے گی کہ جب کسی قوم کی سرکشی و عدوان اپنے انتہائی نقطہ تک جا پہنچے تو ان کی آخری ہلاکت اور بربادی سے پیشتر اتمام حجت کیا جاتا ہے۔ لِیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (۸:۴۲) تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے، اتمام حجت کے بعد ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلائل و براہین کے ساتھ زندہ رہنے اور اس طرح دنیا پر یہ حقیقت آشکارا ہو جائے کہ قوموں کی موت و حیات یونہی اتفاقیہ نہیں بلکہ خاص قوانین کے تابع واقع ہوا کرتی ہے۔ بنی اسرائیل کی خود فریبی اور خدا فراموشی کی داستان برق طور میں گزر چکی ہے۔ جس طرح اس شوریدہ بخت قوم نے خدا کی نعمتوں کو ٹھکرایا اور اس کے قوانین کی جگہ انسانی رسوم و ضوابط کو آئینِ زندگی بنا لیا۔ اس کی مثال (ان سے پیشتر) بہت کم دکھائی دے گی۔ ("ان سے پیشتر" اس لئے کہ ان کے بعد مسلمانوں نے تو اس باب میں کمال کر دکھایا ہے) بخت نصر کا طوفانِ سلب و نہب ایک بہت بڑی تنذیر تھی جس کے بعد یہ کچھ سنبھلے۔ لیکن اس کا اثر زیادہ دیر تک نہ رہا۔ انھوں نے رفتہ رفتہ پھر وہی روش اختیار کر لی۔ اب ان کی آخری تباہی کا وقت آچکا تھا۔ (لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) اس آخری تباہی سے پہلے

آخری حجت

اتمام حجت ضروری تھا۔ اس کے لئے خدا کا ایک عظیم المرتبت رسولؑ، درخشندہ دلائل اور تابندہ براہین کے ساتھ، ان کی طرف مبعوث ہوا جس کے نفسِ مسیحائی میں یہ قوت عطا کی گئی تھی کہ وہ ان کے عروقِ مردہ میں پھر سے خونِ زندگی دوڑا دیتا۔ اس اولوالعزم پیغمبر نے اپنی حقیقت کشا تعلیم اور مجاہدانہ سعی و عمل سے "خدا کی بادشاہت" کے فراموش کردہ تصور کو پھر سے اجاگر کرنے کی کوشش کی۔

لیکن اس قوم نے جس کی شامت اعمال خدا کے اٹل عذاب کی شکل میں ان کے سر پر منڈلا رہی تھی، نہ صرف آپؑ کی زندگی بخش تعلیم ہی کی مخالفت کی بلکہ رومی حکام سے سازش کر کے، ان کی جان تک کے درپے ہو گئے۔ اس اتمام حجت کے بعد، ان کی کوئی تدبیر خدا کے عذاب کو ان سے نہ ٹال سکی۔ چنانچہ اس حادثۂ عظیمہ کے تھوڑے عرصہ بعد (جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے) یروشلم کی دوسری اور آخری تباہی ظہور میں آ گئی۔

اس جوشِ مخالفت میں یہودیوں نے قانونِ احترامِ انسانیت کی ہر شق کو توڑا اور خدا کے اس برگزیدہ رسولؑ کی شانِ اقدس کے خلاف ایسے ایسے مکروہ اتہامات تراشے جن کے تصور سے روح کانپ اٹھے۔ آپ کی پیدائش کو (معاذاللہ۔ معاذاللہ۔ نقل کفر کفر نباشد) ناجائز تعلقات کا نتیجہ بتایا۔ آپ کی حیاتِ طیبہ کو عجیب و غریب افسانوں کا مجموعہ بنا کر پیش کیا اور آخر الامر آپ کی وفات کو (خاکم بدہن) ایک ملعون (مصلوب) کی موت کا نقاب اڑھا دیا۔ اس تفریط کا لازمی ردعمل افراط تھا۔ چنانچہ آپ کے متبعین (عیسائیوں) نے تقابل کی ضد میں آپ کو ابن اللہ (خدا کا بیٹا) قرار دیا۔

افراط و تفریط کا گہوارہ

اور آگے بڑھے تو آپ کو مقام الوہیت تک ہی پہنچا دیا اور واقعۂ تصلیب کو نوعِ انسانی کے وراثتی گناہوں کا کفارہ قرار دے کر شرک اور کفر کے ایک ایک گوشے کو (پناہ بخدا) آپ کی طرف منسوب کر دیا۔ نزولِ قرآن کے وقت خدا کا یہ مقرب بندہ اسی افراط و تفریط کے گہوارہ کی آماجگاہ بن رہا تھا، خدا کا سچا پیغام ہونے کی جہت سے قرآن کا اولین فریضہ تھا کہ اس مقدس رسولؑ کے صحیح مقام سے دنیا کو آشنا کرائے اور مخالفت و معاندت کے گھناؤنے پردوں اور فرطِ عقیدت کے نگاہ فریب نقابوں کو الگ کر کے حقیقت کو اس کی اصلی شکل میں پیش کرے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم میں کسی اور رسول کی پیدائش۔ ذاتی کوائفِ حیات اور زندگی کے آخری مراحل کے متعلق اس شرح و بسط سے تذکرہ نہیں آیا جیسا حضرت عیسیٰؑ کے متعلق آیا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو حضرت عیسیٰؑ کی ذاتِ اقدس یہودیوں کے جوشِ انتقام اور عیسائیوں کے وفورِ عقیدت کی افسانوی چادروں میں اسی طرح لپٹی رہتی جس طرح ان کے لٹریچر میں آج تک لپٹی چلی آ رہی ہے۔ چونکہ یہ ایک نہایت اہم مبحث ہے اس لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ آپ کی حیاتِ طیبہ کو خود اناجیل میں کس طرح پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ حقیقت خود بخود ابھر کر سامنے آ جائے گی کہ قرآن نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے وہ کس قدر بلند اور خدا کے ایک سچے رسول کے شایانِ شان ہے۔

اناجیل کی تفاصیل

اناجیل اربعہ (متی۔ مرقس۔ لوقا۔ یوحنا) عیسائیوں کے نزدیک مستند صحفِ مقدس ہیں، یہ اناجیل کس طرح وجود پذیر ہوئیں اور ہم تک کس طرح

سمجھیں۔ یہ تفصیل طویل ہے۔ اس کے متعلق معراج انسانیت کا پہلا باب "ظہر الفساد" دیکھئے جہاں تمام مزعومہ کتب سماوی کی مفصل تاریخ سامنے آگئی ہے) سر دست صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ ان اناجیل کو نہ حضرت عیسیٰؑ نے خود لکھا اور نہ لکھوایا۔ بلکہ آپ کے بعد آپ کے شاگردوں (حواریوں) نے از خود روایتاً مرتب کیا یعنی یہ کتابیں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کی تاریخ ہیں۔ لیکن تاریخی اعتبار سے بھی یہ مجموعے اس قدر ناقابل اعتماد ہیں کہ خود عیسائی مورخین و محققین ان کے بیانات پر بھروسہ نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ اس دعوے کو بھی محل نظر سمجھتے ہیں کہ یہ اناجیل جن حواریوں کی طرف منسوب ہیں درحقیقت اُنہی کی تالیف ہیں۔ بایں ہمہ چونکہ حضرتِ عیسیٰؑ کے کوائف حیات کے متعلق عیسائیوں کے ہاں سب سے معتبر یہی ماخذ ہیں اس لئے ہمیں لامحالہ انہی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ اناجیل اربعہ کے علاوہ (جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے) آئندہ اوراق میں کہیں کہیں آپ کو ایک اور انجیل (برنباس) کا بھی حوالہ ملے گا۔ یہ انجیل ان متروک اناجیل میں سے ہے جنہیں عیسائیوں نے ایک عرصہ تک دنیا کے سامنے نہیں آنے دیا کیونکہ اس کا اکثر حصہ دیگر اناجیل سے مختلف اور عیسائیت کے مسلمات کے خلاف ہے۔ اس کا ایطالوی نسخہ وائنا کے کتب خانہ میں موجود ہے جو شروع بیسویں صدی میں بعض مستشرقین کی کوششوں سے دنیا کے سامنے آگیا اور مختلف زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہوگئے (برنباس حضرت مسیح کے ایک حواری تھے)

اناجیل کی رُو سے حضرت عیسیٰؑ کے مختصر کوائف زندگی حسب ذیل ہیں۔ لوقا کی انجیل میں اس تذکرہ کی ابتدا یوحنا (بپتسمہ دینے والے) کی بشارت سے ہوتی ہے جس کے بعد مذکور ہے کہ حضرت زکریا کی بیوی (الیشبع) کے حمل کے پانچویں مہینے حضرت مریمؑ کو ولادت حضرت مسیح کی بشارت ملی (جس کی تفصیل (متی کی انجیل میں) یوں مذکور ہے۔

پیدائش اب یسوع مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب اس کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہوگئی تو ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ پائی گئی۔ پس اُس کے شوہر یوسف نے جو راستباز تھا اور اسے بدنام کرنا نہیں چاہتا تھا چپکے سے اُس کے چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔ وہ ان باتوں کو سوچ ہی رہا تھا کہ خداوند کے فرشتے نے اسے خواب میں دکھائی دے کر کہا۔ اے یوسف ابن داؤد اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر۔ کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے۔ وہ بیٹا جنے گی اور تو اس کا نام یسوع رکھنا، کیونکہ وہی اپنے لوگوں کو ان کے گناہوں سے نجات دیگا۔

اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ جو خداوند نے نبی کی معرفت کہا تھا وہ پورا ہو کہ
"دیکھو ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی اور اس کا نام عمانوایل رکھیں گے۔"

(متی ۲۳-۱/۱۸)

لوقا کے بیان کے مطابق آپ کی پیدائش بیت لحم کے شہر میں ہوئی تھی۔

ان دنوں میں ایسا ہوا کہ قیصر اوگستس کی طرف سے یہ حکم جاری ہوا کہ ساری دنیا کے لوگوں کے نام لکھے جائیں۔ یہ پہلی اسم نویسی سوریہ کے حاکم کورنیس کے عہد میں ہوئی۔ اور سب لوگ نام لکھوانے کے لئے اپنے اپنے شہر کو گئے۔ پس یوسف بھی گلیل کے شہر ناصرہ سے داؤد کے شہر بیت لحم کو گیا جو یہودیہ میں ہے۔ اس لئے کہ وہ داؤد کے گھرانے اور اولاد سے تھا تاکہ اپنی منگیتر مریم کے ساتھ جو حاملہ تھی نام لکھوائے۔ جب وہ وہاں تھے تو ایسا ہوا کہ اُس کے جننے کا وقت آ پہنچا۔ اور وہ پہلوٹھا بیٹا جنی اور اس کو کپڑے میں لپیٹ کر چرنی میں رکھا کیونکہ ان کے واسطے سرائے میں جگہ نہ تھی۔

(لوقا ۲-۱)

اسی انجیل میں ذرا آگے چل کر مذکور ہے۔

جب آٹھ دن پورے ہوئے اور اس کے جننے کا وقت آیا تو اس کا نام یسوع رکھا گیا جو فرشتے نے اس کے پیٹ میں پڑنے سے پہلے رکھا تھا۔

(۲/۲۱)

انجیل متی میں اس کے بعد لکھا ہے کہ جب حضرت مسیحؑ پیدا ہوئے تو پورب کے کچھ مجوسی یہ کہتے ہوئے یروشلم کی طرف آئے کہ "یہودیوں کا جو بادشاہ پیدا ہوا ہے وہ کہاں ہے؟" یہ سن کر ہیرودیس بادشاہ اور اس کے ساتھی گھبرا گئے۔ ہیرودیس نے مجوسیوں سے کہا کہ جب تم اس مولود کو دریافت کر لو تو مجھے اطلاع دینا۔ لیکن وہ ہیرودیس کے پاس واپس نہ لوٹے کیونکہ اس بچے کے متعلق اُس کی نیت میں انھیں شبہ ہو گیا تھا۔[1]

اس کے بعد اس انجیل میں لکھا ہے۔

مصر کی طرف روانگی

جب وہ روانہ ہو گئے تو دیکھو خداوند کے فرشتے نے یوسف کو خواب میں دکھائی دے کر کہا کہ اُٹھ۔ بچے اور اس کی ماں کو ساتھ لے کر مصر کو بھاگ جا۔ اور جب تک کہ میں تجھ سے نہ کہوں وہیں رہنا۔ کیونکہ ہیرودیس اس بچے کو تلاش کرنے کو

---

[1] انجیل متی میں یہ بھی مذکور ہے کہ ہیرودیس نے بیت لحم اور اس کی سرحدوں کے تمام بچوں کو جن کی عمر دو برس یا اس سے کم تھی قتل کرا دیا تھا۔

ہے تاکہ اسے ہلاک کرے۔ پس وہ اُٹھا اور رات کے وقت بچے اور اس کی ماں کو ساتھ لے کر مصر کو روانہ ہو گیا۔ اور ہیرودیس کے مرنے تک وہیں رہا تاکہ جو خداوند نے نبی کی معرفت کہا تھا وہ پورا ہو۔ کہ مصر میں سے میں نے اپنے بیٹے کو بلایا۔ (متی ۲-۱۴-۱۵)

چنانچہ یوسف اپنی بیوی اور بچے کو لے کر مصر چلا گیا اور اُس وقت واپس لوٹا جب بچے کی عمر سات برس کی ہو چکی تھی لیکن انجیل برنباس میں ہے کہ

جب یسوع عمر کے بارھویں سال تک پہنچا۔ وہ مریم اور یوسف کے ہمراہ یروشلم میں آیا تھا کہ وہاں خدا کی موسیٰ کی کتاب میں لکھی ہوئی شریعت کے موافق سجدہ کرے۔ (فصل صفہ ۹)

واپسی مصر سے واپسی پر یہ کنبہ گلیل کے علاقہ میں ناصرہ کی بستی میں جا بسا (متی ۲-۲۳)۔ لوقا کی انجیل میں ہے کہ،

اس کے ماں باپ ہر برس عید فسح پر یروشلم کو جایا کرتے تھے۔ اور جب وہ بارہ برس کا ہوا تو وہ عید کے دستور کے موافق یروشلم کو گئے۔ جب وہ ان دنوں کو پورا کر کے لوٹے تو وہ لڑکا یسوع یروشلم میں رہ گیا اور اس کے ماں باپ کو خبر نہ ہوئی مگر یہ سمجھ کر کہ وہ قافلہ میں ہے ایک منزل نکل گئے۔ اور اسے اپنے رشتہ داروں اور جان پہچانوں میں ڈھونڈنے لگے۔ جب نہ ملا تو اسے ڈھونڈتے ہوئے یروشلم تک واپس گئے۔ اور تین روز پیچھے ایسا ہوا کہ انھوں نے اسے ہیکل میں استادوں کے بیچ میں بیٹھے اُن کی سنتے اور اُن سے سوال کرتے ہوئے پایا۔ اور جتنے اُن کی سُن رہے تھے اُس کی سمجھ اور اس کے جوابوں سے دنگ تھے۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئے۔ اور اُس کی ماں نے اُس سے کہا۔ بیٹا! تو نے کیوں ہم سے ایسا کیا؟ دیکھ تیرا باپ اور میں کڑھتے ہوئے تجھے ڈھونڈتے تھے۔ (لوقا ۲-۴۱-۴۸)

تعلیم انجیل برنباس سے بھی اس واقعہ کی تائید ہوتی ہے۔ اس کے بعد لوقا کی انجیل میں مذکور ہے کہ آپ نے یوحنا سے بپتسمہ لیا اور تیس برس کی عمر میں آپ خود تعلیم دینے لگے (لوقا ۳-۲۳) یہ سلسلہ دو تین برس تک جاری رہا لیکن اس مختصر سے عرصہ میں یہودی آپ کے سخت مخالف ہو گئے۔ اس لئے کہ آپ کی تعلیم ان کی اسلاف پرستی کی اندھی تقلید کے خلاف جاتی تھی۔

پس اُنھوں نے معلوم کیا کہ بے شک یسوع نے بزرگوں کی رسم و رواج کا خاکہ اڑایا ہے۔ تو اُن کے دل میں سخت عداوت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ (برنباس فصل صفہ ۳۲)

سازش چنانچہ یہودیوں نے آپ کے خلاف سازش کی اور رومی حکام کو آمادہ کر لیا کہ آپ کے خلاف مقدمہ چلایا جائے۔ آپ کے بارہ شاگردوں (حواریوں) میں سے ایک

(یہوداہ اسکریوطی) نے مخبری کی اور آپ کو گرفتار کرا دیا۔ بہتر ہو کہ تفصیل خود انجیل کی زبان سے سنئے۔

اُس وقت یسوع اُن کے ساتھ گتسمنی نام ایک جگہ میں آیا اور اپنے شاگردوں سے کہا کہ یہیں بیٹھے رہنا جب تک کہ میں وہاں جاکر دعا مانگوں۔ اور پطرس اور زبدی کے دونوں بیٹوں کو ساتھ لے کر غمگین و بے قرار ہونے لگا۔ اس وقت اُس نے ان سے کہا۔ میری جان نہایت غمگین ہے۔ یہاں تک مرنے کی نوبت پہنچ گئی ہے۔ تم یہاں ٹھہرو اور میرے ساتھ جاگتے رہو۔ پھر تھوڑا آگے بڑھا اور منہ کے بل گر کر یہ دعا مانگی۔ اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے۔ تاہم جیسا میں چاہتا ہوں ویسا نہیں بلکہ جیسا تو چاہتا ہے ویسا ہی ہو۔ پھر شاگردوں کے پاس آکر انہیں سوتے پایا اور پطرس سے کہا۔ کیوں تم میرے ساتھ ایک گھڑی بھی نہ جاگ سکے؟ جاگو اور دعا مانگو تاکہ آزمائش میں نہ پڑو۔ روح تو مستعد ہے مگر جسم کمزور ہے۔ پھر دوبارہ جاکر اُس نے یہ دعا مانگی۔ اے میرے باپ۔ اگر یہ میرے بغیر پئے نہیں ٹل سکتا تو تیری مرضی پوری ہو۔ اور آکر انہیں پھر سوتے پایا کیونکہ ان کی آنکھیں نیند سے بھری ہوئی تھیں۔ اور انہیں چھوڑ کر پھر چلا گیا۔ اور وہی بات پھر کہہ کر تیسری بار دعا مانگی۔ تب شاگردوں کے پاس آکر اُن سے کہا۔ اب سوتے رہو اور آرام کرو۔ دیکھو وقت آپہنچا ہے۔ اور ابن آدم گنہگاروں کے ہاتھ میں حوالے کیا جاتا ہے۔ اٹھو چلیں۔ دیکھو میرا پکڑوانے والا نزدیک آپہنچا ہے۔ وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ یہوداہ جو ان بارہ میں سے ایک تھا آیا اور اُس کے ساتھ ایک بڑی بھیڑ تلواریں اور لاٹھیاں لئے ہوئے۔ سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں کی طرف سے آپہنچی۔ اور اُس پکڑوانے والے نے اُنہیں یہ پتا دیا تھا کہ جس کا میں بوسہ لوں وہی ہے اسے پکڑ لینا۔ اور فوراً یسوع کے پاس آکر کہا۔ اے ربی! سلام۔ اور اس کے بوسے لئے۔ یسوع نے اُس سے کہا۔ میاں! جس کام کو آیا ہے وہ کر لے۔ اس پر اُنھوں نے پاس آکر یسوع پر ہاتھ ڈالا۔ اور دیکھو یسوع کے ساتھیوں میں سے ایک نے ہاتھ بڑھا کر اپنی تلوار کھینچی اور سردار کاہن کے نوکر پر چلا کر اس کا کان اڑا دیا۔ یسوع نے اُس سے کہا اپنی تلوار کو میان میں کر لے۔ کیونکہ جو تلوار کھینچتے ہیں وہ سب تلوار سے ہلاک کئے جائیں گے۔ کیا تو نہیں سمجھتا کہ میں اپنے باپ سے منت کر سکتا ہوں اور وہ فرشتوں کے بارہ تُمن سے زیادہ میرے پاس ابھی موجود کر دے گا؟ مگر وہ نوشتے کہ یونہی ہونا ضرور ہے۔ کیونکر پورے ہوں گے؟ اُسی گھڑی یسوع نے بھیڑ سے کہا کیا تم تلواریں اور لاٹھیاں لے کر مجھے ڈاکو کی طرح پکڑنے نکلے ہو؟ میں ہر روز ہیکل میں بیٹھ کر تعلیم دیتا تھا اور تم نے مجھے نہیں پکڑا۔ مگر یہ سب کچھ اس لئے ہوا ہے کہ نبیوں کے

فرشتے پورے ہوں۔ اس پر سارے شاگرد آپ سے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ (متی ۲۶ ۔ ۳۱ ۔ ۵۶)

تصلیب اس کے بعد مقدمہ کی تفاصیل اور فیصلہ کا ذکر ہے۔ اور پھر آپ کے صلیب دیئے جانے کا واقعہ۔

اُس وقت اُس کے ساتھ دو ڈاکو صلیب پر چڑھائے گئے۔ ایک دہنے اور ایک بائیں۔ اور وہ چلنے والے سر ہلا ہلا کر اس کو لعن طعن کرتے اور کہتے تھے کہ اسے مقدس کے ڈھانے والے اور تین دن میں بنانے والے اپنے تئیں بچا۔ اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو صلیب پر سے اُتر آ۔ اسی طرح سردار کاہن بھی فقیہوں اور بزرگوں کے ساتھ مل کے ٹھٹھے سے کہتے تھے۔ اس نے اوروں کو بچایا۔ اپنے تئیں نہیں بچا سکتا۔ یہ تو اسرائیل کا بادشاہ ہے۔ اب صلیب پر سے اُتر آئے تو ہم اس پر ایمان لے آئیں۔ اس نے خدا پر بھروسہ رکھا ہے۔ اگر وہ اسے چاہتا ہے تو اب اس کو چھڑا لے۔ کیونکہ اس نے کہا تھا۔ میں خدا کا بیٹا ہوں۔ اسی طرح ڈاکو بھی جو اس کے ساتھ صلیب پر چڑھائے گئے تھے۔ اس پر لعن طعن کرتے تھے۔ اور دوپہر سے لے کر تیسرے پہر تک تمام ملک میں اندھیرا چھایا رہا اور تیسرے پہر کے قریب یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا۔ ایلی۔ ایلی، لما سبقتنی؟ یعنی اے میرے خدا۔ اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ جو وہاں کھڑے تھے اُن میں سے بعض نے سُن کر کہا۔ یہ ایلیاہ کو پکارتا ہے۔ اور فوراً اُن میں سے ایک شخص دوڑا اور اسفنج لے کر سرکہ میں ڈبویا۔ اور سرکنڈے پر رکھ کر اُسے چُسایا۔ مگر باقیوں نے کہا۔ ٹھہر جاؤ۔ دیکھیں تو ایلیاہ اسے بچانے آتا ہے یا نہیں۔ یسوع پھر بڑی آواز سے چلایا۔ اور جان دے دی۔ اور مقدس کا پردہ اوپر سے نیچے تک پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ اور زمین لرزی اور چٹانیں تڑک گئیں۔ (متی ۲۷ ۔ ۳۸ ۔ ۵۱)

تدفین اس کے بعد لکھا ہے کہ شام کے وقت پیلاطس (گورنر یروشلم) کی اجازت سے یوسف نامی ایک دولتمند آدمی نے آپ کی لاش کو دفن کر دیا۔ اور ایک بڑا سا پتھر قبر کے سرہانے رکھ دیا۔ پھر مذکور ہے:۔

اور سبت کے بعد ہفتے کے پہلے دن پو پھٹتے وقت مریم مگدلینی اور دوسری مریم قبر کو دیکھنے آئیں۔ اور دیکھو ایک بڑا بھونچال آیا کیونکہ خداوند کا فرشتہ آسمان سے اُترا اور پاس آ کر پتھر کو لڑھکا دیا اور اس پر بیٹھ گیا۔ اس کی صورت بجلی کی مانند تھی اور اس کی پوشاک برف کی مانند سفید تھی۔ اور اس کے ڈر کے مارے نگہبان کانپ اُٹھے اور مُردہ سے ہو گئے۔ فرشتے نے عورتوں سے کہا۔ تم نہ ڈرو کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم یسوع کو ڈھونڈتی ہو جو مصلوب ہوا تھا۔

وہ یہاں نہیں ہے۔ کیونکہ اپنے کہنے کے موافق جی اٹھا ہے۔ آؤ یہ جگہ دیکھو جہاں خداوند پڑا تھا۔ اور جلد جاکر اس کے شاگردوں سے کہو کہ وہ مردوں میں سے جی اٹھا ہے۔ اور دیکھو وہ تم سے پہلے گلیل کو جاتا ہے وہاں تم اسے دیکھوگے۔ دیکھو میں نے تم سے کہدیا۔ اور وہ خوف اور بڑی خوشی کے ساتھ قبر سے جلد روانہ ہوکر اس کے شاگردوں کو خبر دینے دوڑیں۔ اور دیکھو یسوع انھیں ملا اور کہا۔ سلام۔ انھوں نے پاس آکر اس کے قدم پکڑے اور اسے سجدہ کیا۔ اس پر یسوع نے ان سے کہا۔ ڈرو نہیں جاؤ میرے بھائیوں کو خبر دو تاکہ گلیل کو چلے جائیں۔ وہاں مجھے دیکھیں گے۔ (متی ۲۸ / ۱۔۱۰)

ازاں بعد۔

اور گیارہ شاگرد گلیل کے اس پہاڑ پر گئے۔ جو یسوع نے ان کے لئے مقرر کیا تھا۔ اور اسے دیکھ کر سجدہ کیا۔ مگر بعض نے شک کیا۔ یسوع نے پاس آکر ان سے باتیں کیں اور کہا کہ آسمان اور زمین کا کل اختیار مجھے دیا گیا ہے۔ پس تم جاکر سب قوموں کو شاگرد بناؤ اور انھیں باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام پر بپتسمہ دو۔ اور انھیں یہ تعلیم دو کہ ان سب باتوں پر عمل کریں جن کا میں نے تم کو حکم دیا اور دیکھو میں دنیا کے آخر تک ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔

(متی ۲۸ / ۱۶۔۲۰)

رفع الی السماء | متی کی انجیل میں صرف اتنا ہی ہے، لیکن مرقس کی انجیل میں ہے۔ غرض خداوند یسوع ان سے کلام کرنے کے بعد آسمان پر اٹھایا گیا۔ اور خدا کی دہنی طرف بیٹھ گیا۔ پھر انھوں نے نکل کر ہر جگہ منادی کی اور خداوند ان کے ساتھ کام کرتا رہا اور کلام کو ان معجزوں کے وسیلے سے جو ساتھ ساتھ ہوتے تھے ثابت کرتا رہا۔ آمین

(مرقس ۱۶ / ۱۹۔۲۰)

اسی طرح لوقا کی انجیل میں ہے۔

پھر وہ انھیں بیت عنیاہ کے سامنے تک باہر لے گیا۔ اور اپنے ہاتھ اٹھاکر انھیں برکت دی جب وہ انھیں برکت دے رہا تھا تو ایسا ہوا کہ ان سے جدا ہو گیا اور آسمان پر اٹھایا گیا۔ اور وہ اس کو سجدہ کرکے بڑی خوشی سے یروشلم کو لوٹ گئے۔ اور ہر وقت ہیکل میں حاضر ہوکر خدا کی حمد کیا کرتے تھے۔ (لوقا ۲۴ / ۵۰۔۵۳)

انجیل برناس کا بیان | یہ تو ہے اناجیل اربعہ کی بیان کردہ داستان۔ لیکن انجیل

برنباس میں ان آخری مراحل کے متعلق ایک اور بیان ہے جو ان سے مختلف ہے۔ اس میں مذکور ہے۔
اور جبکہ سپاہی یہودا کے ساتھ اس جگہ کے نزدیک پہنچے جس میں یسوع تھا یسوع نے ایک بھاری جماعت کا نزدیک آنا سنا۔ تب اسی لئے وہ ڈر کر گھر میں چلا گیا۔ اور گیارھوں (شاگرد) سو رہے تھے پس جبکہ اللہ نے اپنے بندہ کو خطرہ میں دیکھا۔ اپنے سفیروں جبرئیل اور میخائیل اور رفائیل اور اوریل کو حکم دیا کہ یسوع کو دنیا سے لے لیویں۔ تب پاک فرشتے آئے اور یسوع کو دکھن کی طرف دکھائی دینے والی کھڑکی سے لے لیا۔ پس وہ اس کو اٹھا لے گئے اور اسے تیسرے آسمان میں ان فرشتوں کی صحبت میں رکھ دیا جو کہ ابد تک اللہ کی تسبیح کرتے رہیں گے۔
اور یہودا زور کے ساتھ اس کمرہ میں داخل ہوا جس میں سے یسوع اٹھا لیا گیا تھا۔ اور شاگرد سب کے سب سو رہے تھے۔ تب اللہ نے ایک عجیب کام کیا۔ پس یہودا بولی اور چہرے میں بدل کر یسوع کے مشابہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ ہم لوگوں نے اعتقاد کیا کہ وہی یسوع ہے۔ لیکن اس نے ہم کو جگانے کے بعد تلاش کرنا شروع کیا تا کہ دیکھے معلم کہاں ہے، اس لئے ہم نے تعجب کیا اور جواب میں کہا اے سید! تو ہی تو ہمارا معلم ہے۔ پس تو اب ہم کو بھول گیا؟
مگر اس نے مسکراتے ہوئے کہا: کیا تم احمق ہو کہ یہودا اسخریوطی کو نہیں پہچانتے۔ اور اسی اثناء میں کہ وہ یہ بات کہہ رہا تھا سپاہی داخل ہو گئے اور انہوں نے اپنے ہاتھ یہودا پر ڈال دیئے اس لئے کہ وہ ہر ایک وجہ سے یسوع کے مشابہ تھا۔
لیکن ہم لوگوں نے جب یہودا کی بات سنی اور سپاہیوں کا گروہ دیکھا تب ہم دیوانوں کی طرح بھاگ نکلے اور یوحنا جو کہ ایک کتان کے لحاف میں لپٹا ہوا تھا جاگ اٹھا اور بھاگا۔
اور جب ایک سپاہی نے اسے کتان کے لحاف کے ساتھ پکڑ لیا تو وہ کتان کا لحاف چھوڑ کر ننگا بھاگ نکلا۔ اس لئے کہ اللہ نے یسوع کی دعا سن لی اور گیارہ (شاگردوں) کو آفت سے بچا دیا۔
پس سپاہیوں نے یہودا کو پکڑا اور اس کو اس سے مذاق کرتے ہوئے باندھ لیا۔ اس لئے کہ یہودا نے ان سے اپنے یسوع ہونے کا انکار کیا بحالیکہ وہ سچا تھا۔ تب سپاہیوں نے اس سے چھیڑ کرتے ہوئے کہا: اے ہمارے سید! تو ڈر نہیں اس لئے کہ ہم تجھ کو اسرائیل پر بادشاہ بنانے آئے ہیں۔ اور ہم نے تجھ کو محض اس واسطے باندھا ہے کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تو بادشاہت کو نامنظور کرتا ہے۔ یہودا نے جواب میں کہا شاید کہ تم دیوانے ہو گئے ہو۔ تم تو ہتھیاروں اور چراغوں کو لے کر یسوع ناصری کو پکڑنے آئے ہو۔ گویا کہ وہ چور ہے تو کیا تم مجھی کو باندھ لو گے جس نے کہ تمہیں راہ دکھائی۔

ہے تاکہ مجھے بادشاہ بناؤ"۔

اس وقت سپاہیوں کا صبر جاتا رہا اور انھوں نے یہوداکو مکّوں اور لاتوں سے مار کر ذلیل کرنا شروع کیا اور غصہ کے ساتھ اسے اورشلیم کی طرف کھینچتے لے چلے۔ یوحنا اور پطرس نے سپاہیوں کا دور سے پیچھا کیا۔ اور ان دونوں نے اس لکھنے والے کو یقین دلایا کہ انھوں نے وہ سب مشورہ خود سنا جو کہ یہوداکے بارے میں کاہنوں کے سردار اور ان فریسیوں کی مجلس نے کیا کہ یہ لوگ یسوع کو قتل کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ تب وہیں یہوداتے بہت سی دیوانگی کی باتیں کیں یہاں تک کہ ہر ایک آدمی نے تمسخر میں انوکھاپن پیدا کیا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ (یہودا) درحقیقت یسوع ہی ہے۔ اور یہ کہ وہ موت کے ڈر سے بناوٹی جنون کا اظہار کر رہا ہے۔ اسی لئے کاہنوں نے اس کی دونوں آنکھوں پر ایک پٹی باندھ دی۔ اور اس سے ٹھٹھا کرتے ہوئے کہا۔ "اے یسوع ناصریوں کے نبی (اس لئے کہ وہ یسوع پر ایمان لانے والوں کو یہی کہہ کر پکارا کرتے تھے) تو ہمیں بتا کہ تجھ کو کسی نے مارا"؟ اور اس کے گال پر تھپڑ مارے اور اس کے منہ پر تھوکا۔

(انجیل برنباس فصل ۲۱۵ — ۲۱۶)

اس کے بعد لکھا ہے۔

اور ہر ایک آدمی اپنے گھر کو پلٹ آیا۔ اور یہ جو لکھتا ہے اور یوحنا اور لیقوب اس (یوحنا) کا بھائی یسوع کی ماں کے ساتھ ناصرہ کو گئے۔ رہے وہ شاگرد جو اللہ سے نہیں ڈرے تو وہ رات کے وقت گئے اور یہوداکی لاش چرا کر اسے چھپا دیا اور خبر اڑا دی کہ یسوع جی اٹھا ہے۔ تب اس فعل کے سبب سے ایک بے چینی پیدا ہوئی۔ پس کاہنوں کے سردار نے حکم دیا کہ کوئی آدمی یسوع ناصری کی نسبت کلام نہ کرے ورنہ وہ محروم کرنے کی سزا کے تحت میں آئے گا۔ اس لئے بڑی سختی ظاہر ہوئی۔ پس بہت سے آدمی سنگسار کئے گئے اور تازیانوں سے مارے گئے اور ملک سے جلاوطن کر دیئے گئے۔ کیونکہ انھوں نے اس بارہ میں خاموشی کو لازم نہیں پکڑا۔

اور ناصرہ میں یہ خبر پہنچی کہ کیونکر یسوع ان کے شہر کا ایک باشندہ جی اٹھا ہے، اس کے بعد کہ وہ صلیب پر مر گیا تھا۔ تب اس نے جو کہ لکھتا ہے یسوع کی ماں سے منت کی کہ وہ خوش ہو کر رونے سے باز آئے کیونکہ اس کا بیٹا جی اٹھا ہے۔ پس جب کنواری مریم نے اس بات کو سنا وہ رو کر کہنے لگی "تو اب ہمیں یروشلم چلنا چاہیئے تاکہ میں اپنے بیٹے کو ڈھونڈوں۔ اس لئے کہ اگر میں اس کو دیکھ لوں گی تو آنکھیں ٹھنڈی کر کے مروں گی"۔

تب کنواری مع اس لکھنے والے اور یوحنا اور یعقوب کے اسی دن یروشلم میں آئی جس روز کہ کاہنوں کے سردار کا حکم صادر ہوا تھا۔ پھر کنواری نے جو اللہ سے ڈرتی تھی اپنے ساتھ رہنے والوں کو ہدایت کی کہ وہ اس کے بیٹے کو بھلا دیں۔ باوجود اس کے کہ اس نے معلوم کر لیا تھا کہ کاہنوں کے سردار کا حکم ظلم ہے۔ اور ہر ایک آدمی کا انفعال (تاثر) کس قدر سخت تھا۔ اور وہ خدا جو کہ انسانوں کے دلوں کو جانچتا ہے کہ بے شبہ ہم لوگ یہودا (جس کو کہ ہم اپنا معلم یسوع سمجھتے تھے) کی موت پر رنج و الم اور اس کو بھی اٹھتا دیکھنے کے شوق میں محو ہو گئے تھے۔ اور وہ فرشتے جو کہ مریم پر محافظ تھے تیسرے آسمان کی طرف چڑھ گئے جہاں کہ یسوع فرشتوں کی ہمراہی میں تھا اور اس سے سب باتیں بیان کیں۔ لہٰذا یسوع نے اللہ سے منت کی کہ وہ اس کو اجازت دے کہ یہ اپنی ماں اور شاگردوں کو دیکھ آئے۔ تب اس وقت رحمٰن نے اپنے چاروں نزدیکی فرشتوں کو جو کہ جبرئیل اور میخائیل اور رافائیل اور اوریل ہیں حکم دیا کہ یہ یسوع کو اس کی ماں کے گھر اٹھا کر لے جائیں۔ اور یہ کہ متواتر تین دن کی مدت تک وہاں اس کی نگہبانی کریں۔ اور سوا ان لوگوں کے جو اس کی تعلیم پر ایمان لائے ہیں اور کسی کو اسے نہ دیکھنے دیں۔ پس یسوع روشنی سے گھرا ہوا اس کمرہ میں آیا جس کے اندر کنواری مریم مع اپنی دونوں بہنوں۔ اور مرثا اور مریم مجدلینیہ اور لعازر اور اس کے لکھنے والے اور یوحنا اور یعقوب اور پطرس کے مقیم تھی۔ تب یہ سب خوف سے بیہوش ہو کر گر پڑے گویا وہ مُردے ہیں۔ پس یسوع نے اپنی ماں کو اور دوسروں کو یہ کہتے ہوئے زمین سے اٹھایا "تم نہ ڈرو اس لئے کہ میں ہی یسوع ہوں۔ اور نہ روؤ کیونکہ میں زندہ ہوں نہ کہ مردہ"۔ تب ان میں سے ہر ایک دیر تک یسوع کے آجانے کی وجہ سے دیوانہ سا رہا۔ اس لئے کہ انھوں نے پورا پورا اعتقاد کر لیا تھا کہ یسوع مر گیا ہے۔

(انجیل برنباس فصل ۲۱۸ - ۲۱۹)

اس کے بعد لکھا ہے کہ اللہ نے اپنے فرشتوں کو بھیجا جنہوں نے آکر بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح یہودا کی اصلی صورت بدل کر حضرت مسیحؑ کے مشابہ بنا دی تھی اور اس طرح آپ کو صلیب سے محفوظ رکھا تھا، ازاں بعد حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو بہت سی نصیحتیں کیں اور

پھر اس کو چاروں فرشتے ان لوگوں کی آنکھوں کے سامنے آسمان کی طرف اٹھا لے گئے۔

(فصل ۲۲۱)

اخیر میں برنباس نے لکھا ہے۔

اور یسوع کے چلے جانے کے بعد شاگرد۔ اسرائیل اور دنیا کے مختلف گوشوں میں پراگندہ ہو گئے۔

رہ گیا حق رجو) شیطان کے پسند نہ آیا۔ اس کو باطل نے دبا لیا جیسا کہ یہ ہمیشہ کا حال ہے۔ پس تحقیق شریر لوگ کے ایک فرقے نے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ یسوع کے شاگرد ہیں یہ بشارت دی کہ یسوع مرگیا اور وہ جی نہیں اٹھا۔ اور دوسروں نے یہ تعلیم پھیلائی کہ وہ درحقیقت مرگیا پھر جی اٹھا۔ اور اوروں نے منادی کی اور برابر منادی کر رہے ہیں کہ یسوع ہی اللہ کا بیٹا ہے۔ اور انہی لوگوں کے شمار میں پولس نے بھی دھوکا دیا۔ اب رہے ہم تو ہم محض اسی کی منادی کرتے ہیں۔ یہ میں نے ان لوگوں کے لئے لکھا ہے کہ وہ اللہ سے ڈرتے ہیں تاکہ اخیر دن میں جو اللہ کی عدالت کا دن ہوگا چھٹکارا پائیں۔ آمین

(انجیل برنباس فصل ۲۲۲)

یہ ہیں اناجیل کی بیان کردہ تفاصیل۔ لیکن (جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں) ان بیانات کی تاریخی حیثیت محل نظر ہے اور خود عیسائی مورخین ان کے بیشتر حصوں کو محض افسانہ قرار دیتے ہیں چنانچہ اور تو اور، حضرت مسیح کی جائے پیدائش اور سن ولادت جیسی ابتدائی باتوں کے متعلق بھی ابھی تک یقینی طور پر کچھ طے نہیں ہو سکا۔ حالانکہ آپ کی بعثت اس زمانہ میں ہوئی جب اُن علاقوں میں تاریخ نویسی کا عام رواج ہو چکا تھا اور اُس عہد کی کتب تاریخ جزوی تفاصیل تک کو بیان کیا کرتی تھیں۔ چنانچہ

رینان کی تحقیق

مشہور عیسائی مورخ رینان (RENAN) اپنی کتاب حیات مسیح (LIF OF JESUS) میں ان تمام امور پر تنقید کرتا اور اناجیل کے اکثر بیانات کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ آپ کی پیدائش ناصرہ میں ہوئی (صفحہ ۴۸) اور بیت لحم میں پیدائش کا قصہ محض ایک افسانہ ہے (صفحہ ۴۹) جسے خاص مقصد کے پیش نظر وضع کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ

> (اُس زمانے میں) عام عقیدہ یہ تھا کہ (آنے والا) مسیح داؤد کی نسل میں سے ہوگا[1]۔ اور اس کی طرح بیت لحم میں پیدا ہوگا۔ (صفحہ ۴۸)

اس کے بعد رینان لکھتا ہے کہ یہ بھی غلط ہے کہ آپ کی پیدائش مردم شماری کے سال ہوئی۔ یہ مردم شماری اس سال کے۔ جس سال میں متی اور لوقا کے بیان کے مطابق (حضرت) مسیح کی پیدائش ہوئی ہے کم از کم دس سال بعد واقع ہوئی تھی۔ (صفحہ ۴۹) چنانچہ رینان کے بیان کے مطابق ''آپ کی صحیح تاریخ پیدائش

---

[1] خود اناجیل میں حضرت عیسیٰ کا جو نسب نامہ دیا گیا ہے اس کی تفاصیل میں بھی اختلاف ہے۔ یعنی ایک انجیل میں کچھ اور ہے اور دوسری میں کچھ اور۔

متعین نہیں ہو سکتی۔ یہ آگسٹس کے عہد میں ۸ؑ۵۰ رومی کے قریب ہوئی ہوگی۔ (اس لحاظ سے) سن عیسوی کی ابتدا سے بھی چند سال پہلے۔ حالانکہ تمام مہذب دنیا یہی حساب لگائے بیٹھی ہے کہ سن عیسوی (حضرت) مسیح کی پیدائش کے سال سے شروع ہوتا ہے۔ (صفحہ) یعنی تمام عیسائی دنیا جس سال (ابتدائے سن عیسوی) کو حضرت مسیحؑ کی پیدائش کا سال قرار دیتی ہے۔ آپ کی پیدائش اس سے کئی برس پیشتر ہو چکی تھی۔ رینان اس کے بعد لکھتا ہے:۔

> آپ طبقۂ عوام سے متعلق تھے، آپ کے والد یوسف اور آپ کی والدہ مریم۔ دونوں غریب گھرانے کے افراد تھے۔ دستکاری ان کا پیشہ تھا...... (حضرت) مسیح کے اور بہن بھائی بھی تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سب سے بڑے آپ ہی تھے...... مادری زبان آپ کی ارامی تھی۔ یونانی زبان سے آپ واقف نہ تھے..... آپ کے والد کا انتقال جلدی ہو گیا اور اس کے بعد (حضرت) مریم ہی خاندان کی سرپرست رہ گئیں۔ یہ وجہ ہے کہ (حضرت) مسیح عام طور پر "ابن مریم" کے نام سے مشہور ہوئے۔ یعنی جب آپ کو آپ کے ہم نام بچوں سے متمیز کرنا ہوتا تھا تو "یسوع ابن مریم" کہا جاتا تھا...... آپ کی ابتدائی زندگی ناصرہ میں ہی بسر ہوئی لیکن شوہر کی وفات کے بعد آپ کی والدہ اپنے کنبہ سمیت قانا کی بستی کی طرف منتقل ہو گئیں جو ناصرہ سے دو اڑھائی گھنٹے کی مسافت پر واقع تھی.... آپ نے اپنے والد کی اتباع میں نجاری کا پیشہ اختیار کیا۔
>
> (صفحہ ۴۶ تا صفحہ ۴۹)

قرآن کریم کی تصریحات

اب قرآن کریم کی طرف آیئے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، نزولِ قرآن کے وقت حضرت عیسیٰؑ کی ذاتِ گرامی کے متعلق عیسائیوں اور یہودیوں کی افراط و تفریط انتہائی گوشوں تک پہنچ چکی تھی اور اس طرح، کثرتِ تعبیر سے یہ خواب کچھ ایسا بے طرح پریشان ہو چکا تھا کہ جب عصر حاضر کا مؤرخ اس زمانے کے لٹریچر پر نگاہ ڈالتا ہے تو محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ اس "بھول بھلیاں" سے اپنے آپ کو باہر کیسے نکالے! کوائف و سوانح حیات سے قطع نظر آپ کے متعلق عیسائی اور یہودی ایسے متضاد نظریئے لئے بیٹھے تھے کہ اس حقیقت کا باور کرنا مشکل تھا کہ ایک ہی شخصیت کے متعلق تاریخ اس قسم کے متضاد و متبائن نتائج بھی پیش کر سکتی ہے؟ عقائد کے لحاظ سے عیسائی:۔

(۱) حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ مانتے تھے۔

(۲) ابن اللہ ہی نہیں بلکہ خود خدا بھی!
(۳) تثلیث کے اقانیم ثلاثہ (باپ ۔ بیٹا ۔ روح القدس) پر عقیدہ رکھتے تھے۔
(۴) آپ کے اور حضرت مریمؑ کے مجسموں کی پرستش ہوتی تھی۔
(۵) آپ کی تصلیب کو نوعِ انسانی کے گناہوں کا کفارہ تصور کرتے تھے۔
(۶) آپ کے زندہ آسمان پر چلے جانے کا عقیدہ رکھتے تھے۔
(۷) اور آپ کی واپسی کے منتظر بھی تھے۔

اس کے برعکس، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہودی (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) حضرت مریمؑ صدیقہ کے خلاف بہتان باندھتے اور چونکہ ان کے یہاں کسی کو صلیب دیا جانا اس کے لعنتیؔ ہونے کے مرادف سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے وہ آپ کی پیدائش کی طرح آپ کی وفات کو (رغا لکم بدہن) ایک لعنتی کی موت تصور کرتے تھے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کے متعلق اُن کے خیالات یہ ہوں وہ اسے خدا کا رسول کیسے مان سکتے تھے؟ ان حالات میں قرآن کریم کا نزول ہوا۔ اب آپ خیال فرمایئے کہ ان خاردار جھاڑیوں میں اُلجھے ہوئے دامنِ مریمؑ اور قبائے مسیحؑ کو صحیح و سالم نکال کر لے آنا، کس قدر مشکل کام تھا۔ لیکن قرآن کریم اس مشکل ترین فریضہ سے جس معجزانہ انداز سے عہدہ برآ ہوا ہے، وہ اپنی نظیر آپ ہے (اور قرآن کی نظیر اس آسمان کے نیچے ہو کونسی سکتی ہے؟)

پیدائشِ حضرت مریمؑ

چونکہ قرآن کریم کے سامنے سب سے پہلے حضرتِ مریمؑ کی عفت و عصمت کی شہادت پیش کرنا تھا، اس لئے اس نے حضرت عیسیٰؑ کے تذکارِ جلیلہ سے پہلے حضرت مریمؑ کی پیدائش کا ذکر کیا ہے۔ اور اس سلسلہ کو قائم رکھتے ہوئے پھر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا ذکر۔ سورۂ آل عمران میں ہے۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ○

لہ یہودیوں کے ہاں ارتداد کی سزا سنگساری تھی جسے وہ لعنت کی موت قرار دیتے تھے (دیکھئے احبار ۲۴/۱۴) (استثنا ۲۱/۲۱)۔ رومی حکومت کے ماتحت سنگساری کی جگہ صلیب نے لے لی۔ صلیب کی موت کے متعلق بھی ان کا یہی عقیدہ تھا کہ "جو پھانسی پاجاتا ہے وہ خدا کا ملعون ہوجاتا ہے" (استثناء ۲۱/۲۳)

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ ۖ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۖ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ ۖ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ (۳ — ۳۵ — ۳۶)

اور دیکھو جب ایسا ہوا تھا کہ عمران کی بیوی نے دعاء مانگی تھی۔ "خدایا میرے شکم میں جو بچہ ہے، میں اسے (دُنیا کے کام دھندوں اور ماں باپ کی خدمت سے) آزاد کر کے تیرے (مقدس ہیکل کے) لئے نذر کرتی ہوں۔ (یعنی نذر مانتی ہوں کہ اُسے ہیکل کی خدمت کے لئے وقف کر دوں گی) سو میری طرف سے یہ نیاز قبول کر لے۔ بلاشبہ تو (دعائیں) سُننے والا، اور (نیتوں کا حال) جاننے والا ہے!"

پھر جب ایسا ہوا کہ (لڑکے کی جگہ) لڑکی پیدا ہوئی تو وہ بولی "خدایا میرے تو لڑکی ہوئی ہے (اب میں کیا کروں؟) حالانکہ جو بچہ پیدا ہوا تھا، اس کے متعلق اللہ خوب جانتا تھا (کہ لڑکی ہونے پر بھی بڑی فضیلت کی مالک ہے۔ لیکن اُس کی ماں نے کہا، میں نے لڑکے کے لئے نذر مانی تھی، پیدا ہوئی لڑکی) حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے ہاں جو لڑکا بھی پیدا ہوتا وہ اس لڑکی جیسا کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ (اس نے کہا خیر جو کچھ بھی ہو) میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے، اور میں اسے اور اس کی نسل کو تیری پناہ میں دیتی ہوں کہ شیطان رجیم (کی وسوسہ اندازیوں) سے محفوظ رہے

دیکھئے! حضرت مریمؑ کی پیدائش کے وقت ہی اُن کی والدہ نے خدا سے دعا مانگی کہ اسے اور اس کی اولاد کو شیطان کے مکر و فریب سے محفوظ رکھنا۔

حضرت مریمؑ کو ہیکل کی نذر کر دیا گیا[1]۔ جہاں آپ کی کفالت حضرت زکریاؑ جیسی جلیل القدر اور بزرگ ہستی کے سپرد ہوئی۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا ...... زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۖ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۖ قَالَ يَا مَرْيَمُ

---

[1] یہودیوں میں اولاد کو ہیکل کی نذر کر دینے کا رواج تھا (دیکھئے سموئیل کتاب اوّل۔ باب اوّل) یہ بھی دیکھئے اللہ تعالےٰ نے سورۂ آل عمران کی مندرجہ صدر آیت میں یہ بھی بتا دیا کہ والدۂ مریم کو بھلا اس کا کیا علم تھا کہ اس کا لڑکا اس لڑکی کے برابر کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس لڑکی کے حصّہ میں والدۂ حضرت مسیحؑ ہونے کی سعادت لکھی تھی۔

أَنَّىٰ لَكِ هَٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (۳ : ۳۷)

پس ایسا ہوا کہ مریم کو اُس کے پروردگار نے بڑی ہی اچھی قبولیت کے ساتھ قبول کر لیا، اور ایسی نشو و نما دی جو بڑی ہی اچھی نشو و نما تھی (یعنی اس کی پرورش بہتر سامانوں اور نیک نگرانیوں میں ہوئی) اور زکریا کو اس کا نگران حال بنا دیا۔ جب کبھی ایسا ہوتا کہ زکریا اُس کے پاس محراب میں (یعنی قربان گاہ میں) جاتا جہاں وہ سرگرم عبادت رہا کرتی تھی) تو اُس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے کی چیزیں موجود پاتا۔ اس پر وہ پوچھتا۔ "اے مریم! یہ چیزیں تجھے کہاں سے مل گئیں؟" وہ کہتی "اللہ سے۔ اللہ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دے دیتا ہے!"

اس آیت مقدسہ میں دو تین باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس نذر (یعنی حضرت مریمؑ) کو شرفِ قبولیت عطا فرمایا۔ دوسرے یہ کہ آپ کی پرورش و تربیت نہایت عمدگی سے ہوئی۔ تیسرے یہ کہ بچپن ہی سے آپ کی طبیعت زہد و اتقا کی طرف مائل تھی جس کی وجہ سے آپ محراب (قربان گاہ) کے قریب معتکف رہتیں اور آپ کے خور و نوش کا عمدہ ترین سامان وہیں پہنچ جاتا۔

ہیکل کی زندگی

کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق دریافت کرنے پر حضرت مریمؑ نے فرمایا کہ هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ (یہ منجانب اللہ ہیں) ضروری نہیں کہ مِنْ عِندِ اللَّهِ سے مراد یہ ہو کہ یہ اشیاء ذریعہ اور واسطہ کے بغیر، براہ راست خدا کی طرف سے آئی ہیں۔ بلکہ (جیسا کہ برقِ طور میں حضرت موسیٰؑ کے تذکرۂ جلیلہ کے آخر میں تفصیلاً لکھا جا چکا ہے) ذرائع و وسائل سے حاصل شدہ اشیاء کے متعلق بھی اللہ کے بندے یہی کہا کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریمؑ کے زہد و تورع کی شہرت عام ہو گئی تھی اس لئے لوگ ان کے پاس کھانے پینے کی چیزیں بطور نذر و منت از خود لئے چلے آتے تھے (جیسا کہ آج بھی خانقاہوں میں عام طور پر ہوتا ہے) ہیکل کی راہبانہ زندگی اس قسم کی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں جب حضرت مریم ہیکل میں آئیں تو اس وقت حضرت زکریاؑ نے انہیں اپنی کفالت میں لے لیا اور اس پر ہیکل کے متولیوں میں کسی قسم کا جھگڑا نہیں ہوا لیکن جب وہ بڑھ کر جوان ہوئیں تو اُس وقت ان کی کفالت کے اور دعویدار بھی پیدا ہو گئے اور اس متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کیا گیا۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں ہے

---

[1] حضرت مریم کی پیدائش اور ابتدائی زندگی کے حالات مروجہ اناجیل اربعہ میں نہیں ہیں لیکن متروک اناجیل میں یہ حالات بصراحت ملتے ہیں۔ بالخصوص ایک انجیل (ولادت مریم) تو مشتمل ہی انہی حالات پر ہے۔

وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ (۳-۴۴)

(اے رسول) تو ان کے پاس نہ تھا جب وہ مریم کی کفالت کے لئے قرعہ اندازی کر رہے تھے۔ اور نہ ہی تو اس وقت اُن کے پاس تھا جب وہ اس کے لئے ایک دوسرے سے جھگڑتے تھے۔

بہرحال، حضرت مریم ہیکل میں اس انداز سے زندگی بسر کر رہی تھیں کہ انہیں اللہ کی طرف سے بشارتیں ملنا شروع ہوئیں۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ (۳-۴۳-۴۲)

اور پھر جب ایسا ہوا تھا کہ فرشتوں نے کہا تھا: اے مریم! اللہ نے تجھے اپنی قبولیت کے لئے چن لیا، اور (برائیوں کی آلودگی سے) پاک کر دیا ہے اور (ہم عصر اقوام کی) عورتوں پر برگزیدگی عطا فرمائی ہے۔ اے مریم! اب تو اپنے پروردگار کی اطاعت و نماز میں سرگرم ہو جا۔ اور رکوع و سجود کرنے والوں کے ساتھ تو بھی رکوع و سجود میں مشغول رہ۔

بشارتِ حضرت عیسیٰ

انہی بشارتوں میں حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا بھی ذکر تھا۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ وَ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَ كَهْلًا وَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (۳-۴۵-۴۶)

اور پھر جب ایسا ہوا کہ فرشتوں نے کہا: اے مریم! اللہ تجھے اپنے کلام کے ذریعہ (ایک لڑکے کی) بشارت دیتا ہے۔ اُس کا نام مسیح عیسیٰ ہوگا۔ اور مریم کا بیٹا کہلائے گا۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں ارجمند ہوگا۔ اور بچپنے میں اور بڑی عمر میں کلام کرے گا۔ نیز اللہ کے حضور مقرب اور اس کے بندوں میں سے ایک صالح انسان ہوگا۔

• کلمہ کی تشریح عنوانِ زیرِ نظر کے آخیر میں ملے گی۔ اور چھوٹی عمر میں باتیں کرنے کی تصریح ذرا آگے چل کر آئے گی۔ یہاں صرف اتنا دیکھئے کہ اللہ تعالےٰ نے پہلی بشارت میں ہی حضرت عیسیٰؑ کو دنیا اور آخرت میں آبرومند۔ خدا کا مقرب اور صالح انسان قرار دیا ہے۔ اس بشارت پر حضرت مریمؑ نے عرض کیا۔

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ (۳ــ۴۷)

(مریم نے بشارت سنی تو متعجب ہوکر، بولی "خدایا! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میرے لڑکا ہو حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا تک نہیں؟" ارشاد الٰہی ہوا کہ اسی طرح) اللہ اپنی مشیت کے مطابق پیدا کردیتا ہے، وہ جب کسی کام کا فیصلہ کرلیتا ہے، تو حکم دیتا ہے کہ ہوجا، اور پھر اس کی مشیت کے مطابق ظہور میں آجاتا ہے!"

یہی الفاظ انجیل برنباس میں آئے ہیں۔

اس کنواری نے جواب دیا۔ اور میں بیٹا کیونکر پیدا کروں گی بحالیکہ میں کسی مرد کو جانتی تک نہیں۔

(فصل اوّل)

قرآن کریم میں (سورۂ مریم میں) یہ واقعہ مزید تفاصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ جہاں فرمایا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ (۱۹ــ۱۶ــ۱۷)

اور (اے پیغمبر!) کتاب میں مریم کا معاملہ بیان کر۔ اس وقت کا معاملہ جب وہ ایک مکان میں کہ پورب کی طرف تھا، اپنے گھر کے آدمیوں سے الگ ہوگئی، پھر اس نے ان لوگوں کی طرف سے پردہ کرلیا۔ پس ہم نے اُس کی طرف اپنی "روح" بھیجی۔ اور وہ ایک بھلے چنگے آدمی کے روپ میں نمایاں ہوگیا"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت حضرت مریمؑ ہیکل کو چھوڑ کر اپنے آبائی وطن ناصرہ میں تشریف لیجاچکی تھیں جو یروشلم سے شمال مشرق کی طرف واقع ہے۔ لوقا کی انجیل میں ہے۔

چھٹے مہینے جبرئیل فرشتہ خدا کی طرف سے گلیل کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرہ تھا ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا جس کی منگنی داؤد کے گھرانے کے ایک مرد (یوسف نامی) سے ہوئی تھی اور اس کنواری کا نام مریم تھا (لوقا ۱ــ۲۶ــ۲۷)

اس پر حضرت مریمؑ نے کہا۔

قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ

تَقِیًّا o (۱۹/۱۸)

مریم اسے دیکھ کر (گھبرا گئی۔ وہ) بولی۔" اگر تو نیک آدمی ہے، تو میں خدائے رحمان کے نام پر تجھ سے پناہ مانگتی ہوں!"

اس آنے والے نے جواب دیا۔

قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا o (۱۹/۹)

اس نے کہا" میں تو تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں، (اور وہ کہتا ہے کہ) تجھے ایک پاکیزہ فرزند عطا کردے۔

اس پر حضرت مریمؑ نے کہا۔

قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا o (۱۹/۲۰)

مریم بولی" یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے لڑکا ہو، حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا نہیں اور نہ میں سرکش ہوں۔

اور اللہ کے فرستادہ نے جواب دیا۔

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا o (۱۹/۲۱)

فرشتہ نے کہا" ہوگا ایسا ہی۔ تیرے پروردگار نے فرمادیا کہ یہ میرے لئے کچھ مشکل نہیں۔ وہ کہتا ہے، یہ اس لئے ہوگا کہ اسے لوگوں کے لئے ایک نشانی بنادوں، اور میری رحمت کا اس میں ظہور ہو۔ اور یہ ایسی بات ہے جس کا ہونا طے پاچکا۔"

پیدائش حضرت عیسیٰؑ

اس کے بعد ارشاد ہے۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا o فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا o (۱۹/۲۲—۲۳)

پھر اُس ہونے والے فرزند کا حمل ٹھہر گیا۔ وہ (اپنی یہ حالت چھپانے کے لئے) لوگوں سے الگ ہو کر دور چلی گئی۔ پھر اُسے دردِ زہ (کا اضطراب) کھجور کے ایک درخت کے نیچے لے گیا (وہ اُس کے تنے کے سہارے بیٹھ گئی) اُس نے کہا" کاش میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی۔ میری ہستی کو لوگ یک قلم بھول گئے ہوتے۔!"

غور کیجئے۔ قرآن کریم نے یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا" کے ایک مختصر سے ٹکڑے میں جذبات واحساسات کی ایک پوری دنیائے نسائیت کو کس نادرہ کاری سے سمیٹ کر رکھ دیا ہے حضرت مریمؑ کی اس قلبی کاوش کی تسکین کے لئے ارشاد ہوا۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِیْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِیًّا ﴿۱۹/۲۴﴾

اُس وقت اس نے اسے نشیب کی طرف سے پکارا۔ غمگین نہ ہو۔ تیرے پروردگار نے تیرے تلے ایک بڑی ہستی پیدا کردی ہے۔

اور طبعی کرب واضطراب کے لئے۔

وَ هُزِّیْٓ اِلَیْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَیْكِ رُطَبًا جَنِیًّا ﴿۱۹/۲۵﴾

تو کھجور کے درخت کا تنہ پکڑ کے اپنی طرف ہلا۔ تازہ اور پکے ہوئے پھلوں کے خوشے تجھ پر گرنے لگیں گے

ان حالات کے ماتحت حضرت عیسیٰ کی پیدائش ظہور میں آئی۔ حضرت مریم سے کہا گیا کہ

فَكُلِیْ وَاشْرَبِیْ وَ قَرِّیْ عَیْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَیِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِیْٓ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا ﴿۱۹/۲۶﴾

کھا۔ پی۔ (اپنے بچے کے نظارہ سے) آنکھیں ٹھنڈی کر (اور سارا غم وہراس بھول جا) پھر اگر کوئی آدمی نظر آجائے (اور پوچھ گچھ کرنے لگے) تو (اشارہ سے) کہدے۔ میں نے خدائے رحمان کے حضور روزہ کی منت مان رکھی ہے۔ میں آج کسی آدمی سے بات چیت نہیں کرسکتی۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی اس بخشش وعنایت کے لئے بطور شکر وامتنان روزہ رکھیں (جیسا کہ حضرت زکریاؑ کے تذکرہ میں لکھا جاچکا ہے۔ یہودیوں کے ہاں روزہ کی حالت میں بات چیت نہیں کی جاتی تھی۔)

حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کا تفصیلی ذکر انہی مقامات پر آیا ہے۔ باقی جگہ اس کا محض ضمنی تذکرہ ہے۔ لیکن اس ضمنی تذکرہ میں بھی اس اصلی غایت کو سامنے لایا گیا ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے۔ یعنی حضرت مریمؑ کی عفت وناموس کی شہادت۔ سورۂ انبیاء میں ہے۔

وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ ﴿۲۱/۹۱﴾

اور (اسی طرح) اُس عورت کا معاملہ، جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی، (یعنی مریم کا معاملہ

پس ہم نے اپنی روح میں سے اس میں پھونک دیا، اور اسے اس کے بیٹے (مسیح) کو تمام دنیا کے لئے (سچائی کی) ایک نشانی بنا دیا۔

اور سورۂ تحریم میں۔

وَ مَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ۝ (۶۶/۱۲)

اور (دیکھو، ہم نے) عمران کی بیٹی مریم کو بھی جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی، یا ایمان لوگوں کے لئے نشانی بنا دیا۔ چنانچہ ہم نے اپنی روح میں سے اس میں پھونک دیا۔ اور مریم نے اپنے پروردگار کے تمام کلمات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ بڑی ہی اطاعت گزار عورتوں میں سے تھی۔

ان مقامات میں "نفخ روح" کا ذکر ہے اور سورۂ نساء میں خود حضرت عیسیٰؑ کو "روح منہ" (اللہ کی طرف سے روح) کہہ کر پکارا گیا ہے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ؕ (۴/۱۷۱)

اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو (یعنی حقیقت و اعتدال سے گزر نہ جاؤ) اور اللہ کے بارے میں حق کے سوا اور کچھ نہ کہو۔ مریم کا بیٹا عیسیٰ مسیح، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کا رسول ہے اور اس کے کلمۂ (بشارت) کا ظہور ہے جو مریم پر القا کیا گیا تھا، نیز ایک روح ہے جو اس کی جانب سے بھیجی گئی۔

روح کے متعلق ابلیس و آدم (عنوان ملائکہ) میں بحث ہو چکی ہے۔ جہاں بتایا گیا ہے کہ روح، اللہ کا امر (حکم) ہے یا اس کی طرف سے وحی۔ اس لئے ان مقامات میں "روح پھونکنے" سے مراد یہ نہیں کہ مسیح پر کوئی شے پھونک دی گئی تھی۔ بلکہ یہ خدا کا امر (حکم) تھا جو مشیت کے مطابق ظہور میں آگیا۔ اور یہ لوگوں کے لئے ایک نشانی (آیت) تھی۔

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَ لِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝ (۱۹/۲۱)

فرشتہ نے کہا، "ہوگا ایسا ہی، تیرے پروردگار نے فرمایا کہ یہ میرے لئے کچھ مشکل نہیں۔ وہ کہتا ہے یہ اس لئے ہوگا کہ اسے لوگوں کے لئے ایک نشانی بنا دوں۔ اور میری رحمت کا اس میں ظہور ہو۔ اور یہ ایسی بات ہے جس کا ہونا طے پا چکا ہے!

ماں اور بیٹا دونوں آیت (نشان) تھے۔

وَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَ جَعَلْنٰهَا وَ ابْنَهَآ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ٥ (۲۱/۹۱ نیز ۲۳/۵۰)

اور (اسی طرح) اس عورت کا معاملہ، جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی، (یعنی مریم کا معاملہ) پس ہم نے اپنی روح میں سے اس میں پھونک دیا، اور اسے اور اس کے بیٹے (مسیح) کو تمام دنیا کے لئے (سچائی کی) ایک نشانی بنا دیا)

یہ چیزیں اس وقت محض ضمناً سامنے آگئی ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق تفصیلی بحث آگے چل کر ملے گی۔ اس وقت صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ قرآن کریم نے حضرت مریمؑ کی عفت و عصمت کی شہادات اس تکرار و اصرار کے ساتھ پیش کر کے انھیں یہودیوں کی تہمت تراشیوں سے بلند ثابت کیا ہے۔

مصر کی طرف روانگی

ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں کہ اناجیل کے بیان کی رو سے، یوسف حضرت مریمؑ اور بچے کو لے کر مصر کی طرف چلا گیا تھا جہاں یہ کنبہ سات سال تک رہا۔ جب یہ لوگ وطن میں واپس آئے تو ہر سال، بڑے تیوہار کی تقریب پر، یروشلم آیا کرتے تھے۔ جب حضرت عیسیٰؑ کی عمر بارہ برس کی ہوئی تو انھوں نے ہیکل کے راہبوں سے وعظ و نصیحت اور بحث و تذکیر شروع کر دی۔ جیسا کہ ظاہر ہے، قرآن کریم ایک تاریخی کتاب کی طرح تمام واقعات کو مسلسل بیان نہیں کرتا بلکہ وہ داستان کی انہی کڑیوں کو لیتا ہے جن سے استنباطِ نتائج مقصود ہو اور ان میں سے بھی بعض کی طرف محض اشارہ کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے اولین مخاطب (عرب) ان واقعات کی تفاصیل و جزئیات سے واقف تھے (تفصیل ابلیس و آدم میں رسالت کے عنوان میں گزر چکی ہے) چنانچہ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے نقلِ مکانی کے متعلق بھی صرف ایک اشارہ پر اکتفا کیا گیا ہے جیسا فرمایا۔

وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْیَمَ وَ اُمَّهٗٓ اٰیَةً وَّ اٰوَیْنٰهُمَآ اِلٰی رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِیْنٍ ٥ (۲۳/۵۰)

اور (اسی طرح) ابن مریم (یعنی مسیح) اور اس کی ماں کو (اپنی سچائی کی) ایک بڑی نشانی بنایا، اور انہیں ایک مرتفع مقام میں پناہ دی جو بسنے کے قابل اور شاداب تھا۔

قیاس یہ ہے کہ اس سے مراد نیل کا وہ بالائی حصہ ہے، جہاں حضرت عیسیٰ کا بچپن گزرا۔ لیکن (جیسا کہ ذرا آگے چل کر لکھا جائے گا) ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد قانا کا وہ علاقہ ہو جہاں رینان کے بیان کے مطابق یہ کنبہ منتقل ہو کر گیا تھا۔ اگر یہ کنبہ مصر کی طرف گیا تھا تو وہاں سے مراجعت وطن کے زمانہ میں آپ کی عمر (اناجیل کے بیان کے مطابق سات برس کی تھی یا زیادہ سے زیادہ بارہ برس کی۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہیکل کے احبار و رہبان کی پرتصنع زندگی اور ان کی وضعی رسومات کے خلاف آپ کی یہ صدائے احتجاج اُس فطری صلاحیت کی بناء پر تھی جو ایک ہونے والے رسول کی سرشت میں داخل ہوتی ہے۔ لیکن گمان غالب یہی ہے کہ آپ نے یہ سلسلۂ رشد و ہدایت اور وعظ و تذکیر شرف نبوت سے بہرہ یاب ہونے کے بعد ہی شروع کیا تھا (جو اناجیل کی رُو سے قریب تیس برس کی عمر کا زمانہ ہے) رینان کا بیان ہے کہ آپ نے پہلے گلیل کے صومعوں میں وعظ کہنا شروع کیا تھا اور اگرچہ یروشلم میں آپ قریب ہر سال آتے تھے لیکن یہاں ۳۱ء میں سب سے پہلا اہم واقعہ ہوا جب ہیکل کے احبار و رہبان سے آپ کا تصادم ہوا۔ (رینان صفحہ ۱۵۸ - ۱۱۹)

قرآن کریم میں البتہ ایک اور واقعہ کا ذکر آیا ہے (جو اناجیل میں مذکور نہیں اور) جسے اس نے تکلم فی المہد (گہوارہ میں گفتگو) کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ یہ واقعہ کب اور کیسے ہوا؟ اس کے متعلق پیدائش حضرت عیسیٰؑ کے ضمن میں ذرا آگے چل کر لکھا جائے گا۔

تیس برس تک کی زندگی

حضرت عیسیٰؑ کی بارہ برس سے تیس برس تک کی زندگی کے کوائف و احوال سے اناجیل خاموش ہیں۔ لوقا سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی عمر اکتیس برس کی تھی جب آپ شرفِ نبوت سے سرفراز ہوئے۔ "جب یسوع خود تعلیم دینے لگا تو برس تیس ایک کا تھا" (لوقا ۳: ۲۳) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں تیس برس لکھا ہے[۲]۔ یہ اتنا لمبا

---

[۱] یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ نقل مکان واقعۂ صلیب کے بعد کی ہو (اس کے متعلق تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا۔)

[۲] یہ تفاوت تو خیر کچھ ایسا نہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی سیرت مقدسہ کی دیگر تفاصیل کے متعلق عیسائی لٹریچر میں ایسے ایسے متضاد و متخالف بیانات موجود ہیں کہ پڑھنے والا محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ "یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟" مغربی محققین یہاں ہیں۔ (باقی صفحہ ۴۱ پر)

عرصہ اس قدر خاموشی اور گمنامی میں کس طرح گذرا؟ اس کے سمجھنے کے لئے اُس زمانے کی ایک عظیم الشان تحریک اخوت پر (جو فرقہ ایسینی ESSENES سے متعلق تھی) نگاہ ڈالنی ضروری ہے۔ یہ مملکۂ فطرت کا ایک عجیب وغریب فرقہ تھا جس کے احوال وظروف عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھے جاتے تھے لیکن جس کی شاخیں اُس زمانہ کی قریب قریب تمام مہذب دنیا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس فرقہ کا تفصیلی تعارف تو معراجِ انسانیت کے پہلے باب "ظہر الفساد" میں دیکھئے اس مقام پر اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ اس کی رکنیت بڑی بڑی سخت ریاضتوں۔ زہرہ گداز مجاہدوں اور جاں نگاہ آزمائشوں کے بعد نصیب ہوتی تھی۔ خدمتِ خلق ان کا نصب العین اور تزکیۂ نفس ان کا مطمحِ نگاہ تھا اس کے بڑے بڑے رکن جنگلوں اور پہاڑوں میں پھرتے، ضبطِ نفس کے لئے بڑی بڑی مشقتیں برداشت کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ علم الاشیأ کے مختلف شعبوں میں تحقیق وکاوش کرتے اور جڑی بوٹیوں اور دیگر نباتات ومعدنیات کے خواص دریافت کرتے۔ تحصیلِ علومِ فطرت میں بڑی بڑی تکلیفیں اُٹھاتے اور بلا مزد ومعاوضہ بیماروں کا علاج کرتے اور محتاجوں کی امداد کو پہنچتے۔ لیکن یہ پہاڑوں کے غاروں میں ہوتے یا جنگلوں میں صحراؤں میں پھرتے یا بستیوں میں۔ سب ایک نظام سے وابستہ اور ایک مرکز سے ملحق رہتے۔ جاننے والے ان کے کیریکٹر کی پختگی۔ سیرت کی بلندی۔ زہد وعبادت۔ علم وعمل اور خدمتِ خلق کے بے پناہ جذبے کی قدر کرتے لیکن متغلب اور مستبد قوتیں ان کے عظیم الشان نظام سے خائف بھی رہتیں۔ فلسطین اور مصر اس فرقہ کے مراکز خصوصی تھے قرائن سے مترشح ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے قبل از نبوت کا زمانہ، اس انداز سے تلاشِ حقیقت میں گزارا تھا چنانچہ اس قیاس کی تائید ایک ایسے کتبہ سے بھی ہوتی ہے جو مصر کے محکمۂ آثار قدیمہ کو ایسینی فرقہ کے ایک

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۰) اور علمائے تحقیق وکاوش ابھی تک حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا زمانہ بھی صحیح طور پر متعین نہیں کر سکے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں "کرسمس" کا عنوان دیکھئے۔ آپ ایسا محسوس کریں گے گویا کسی طلسم کدۂ حیرت میں جا نکلے ہیں جہاں پریشانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ بہر حال انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے بیان کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کی عمر تیس برس کی تھی جب آپ نے پبلک ملاقات تحمیل کی اور اس کے قریب اٹھارہ ماہ بعد واقعۂ تصلیب ظہور میں آگیا۔ گویا اس اعتبار سے آپ کی کل مدتِ نبوت قریب ڈیڑھ سال تھی۔ اور بعض بیانات کے مطابق زیادہ سے زیادہ تین برس۔

[1] ازمنۂ قدیمہ میں آپ بالعموم دیکھیں گے کہ اس قسم کی زہد وپارسائی کی زندگی بسر کرنے والے لوگ خواص الادویہ کے بڑے ماہر اور چھلکوں سے علاج کرنے میں بڑے حاذق ہوتے تھے۔ ہندوؤں کے ہاں یوگی اور سنیاسی آج بھی اس قسم کے صحرانورد اور دشت پیما تارک الدنیا فرقوں کی یاد دلاتے ہیں اور غالباً انہی کے پس ماندہ ہیں۔

قدیم مسکن سے ملا اور جو جرمنی کی ایک علمی جماعت کے قبضہ میں ہے[1]۔ ہم (ابلیس و آدم) وحی کے عنوان میں بالتفصیل دیکھ چکے ہیں کہ نبوت کسی قسم کی ریاضتوں اور مشقتوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ نہ وہ اس قسم کے کسب و ہنر کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لیکن جسے نبی مشیت کی طرف سے منصبِ نبوت کے لئے تیار کیا جاتا، اس کی شروع ہی سے

ایک خصوصیت کبریٰ

کیفیت یہ ہوتی کہ وہ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ اس کے لئے وہ عالم انفس و آفاق کے ایک ایک گوشے میں پھر نکلتا اور اس کی یہ خلش و کاوش کہیں بھی قرار پذیر نہ ہوتی حتیٰ کہ وحی کی تجلیاتِ ربانی حقیقت کو بے نقاب سامنے لے آتی۔ قبل از نبوت، تلاشِ حقیقت میں اس کی سیمابیت کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے

چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوب روئے تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے

ز شرر ستارہ جویم۔ ز ستارہ آفتابے سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد بہ نگاہِ ناشکیبے بہ دلِ امیدوارے

اور یہ ہوتی تھی کیفیت اس تجسسِ حقیقت، قلبِ بے قرار کی جس میں نقاب کشائی حقائق کی تڑپ ہر آن قیامت خیز طوفان برپا رکھتی لیکن جس کی نگاہ کو کوئی سراب آسا درخشندگی فریب نہ دے سکتی۔ اس لئے کہ وہ (ہنوز) حقیقت کو بے نقاب نہ دیکھ سکنے کے باوجود کسی "من دونِ حقیقت" مقام سے مطمئن نہ ہوتا لہٰذا منزل سے ورے اس کا قدم رک ہی نہ سکتا۔

تلاشِ حقیقت کی یہی خلش و کاوش اور تب و تاب تھی جو حضرتِ مسیح کو (غالباً) ان وادیوں میں کھینچ کر لے گئی جہاں (اُس زمانہ کے فی الجملہ) بہترین افراد، بقدرِ ظرف مصروفِ تجسس تھے۔ تا آنکہ وحیِ خداوندی نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر اس مقام پر پہنچا دیا جہاں کوئی انسان اپنی سعی و عمل اور کسب و ہنر سے نہیں پہنچ سکتا۔ یہ تھی وہ منزل جسے لوقا نے "خود تعلیم دینے کا مقام" اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مضمون نگار نے "پبلک لائف" کا آغاز قرار دیا ہے۔ سچ ہے۔

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

رسالت

یہ تو صرف قرآن کریم ہے جو ان مقامات کا صحیح تعارف کرا سکتا ہے کیونکہ مقامِ نبوت و رسالت کی صحیح لِم اور کیفیت سے وہی ذات واقف ہو سکتی ہے جس سے یہ شرف و مجد عنایت

---

[1] بحوالہ تذکرہ (عنایت اللہ خاں المشرقی) اور انسائیکلو پیڈیا او ف ریلیجز اینڈ ایتھکس (ہیسٹنگز)

ہوتا ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہے۔

وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ (۳/۴۸-۴۹)

اور (اے مریم!) اللہ اُس (ہونے والے لڑکے) کو کتاب اور حکمت کا علم عطا فرمائے گا۔ نیز تورات اور انجیل کا۔ اور اُسے بنی اسرائیل کی طرف بہ حیثیت رسول کے بھیجے گا۔

سورۂ مائدہ میں ہے۔

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (۵/۴۶)

اور پھر (ان نبیوں کے پیچھے) اُنہی کے نقشِ قدم پر، ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو چلایا تورات کی تصدیق کرتا ہوا جو اُس کے سامنے موجود تھی۔ اور ہم نے اُسے انجیل دی جس میں ہدایت اور روشنی ہے، اور تورات کی جو پہلے سے موجود تھی (سر تا سر) تصدیق ہے۔ نیز متقی انسانوں پر (سعادت کی) راہ کھولنے والی اور (اپنی تعلیم میں یکسر) پند و نصیحت!

سورۂ حدید میں اس کی مزید تفصیل فرما دی۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۝ (۵۷/۲۶-۲۷)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوح اور ابراہیم کو رسول بنا کر بھیجا اور اُن دونوں کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھ دی چنانچہ ان (اولادوں) میں سے کچھ لوگ ہدایت یاب تھے اور اکثر فاسق۔ پھر ان کے بعد ہم نے یکے بعد دیگرے اپنے رسولوں کو بھیجا اور اُن کے بعد ہم نے (اپنے رسول، مریم کے بیٹے عیسیٰ کو (بھی) بھیجا اور اُسے انجیل دی۔

یوحنا سے تعارف ہم نے جو کچھ اوپر لکھا ہے اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ

مصر میں اسینی فرقہ سے متمسک ہوئے لیکن (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) رینان کا خیال ہے کہ آپ مصر کی جانب تشریف نہیں لے گئے بلکہ ناصرہ سے قانا کی طرف منتقل ہو گئے تھے[۱]۔ اس لئے آپ کا اسینی فرقہ سے تمسک بھی فلسطین کے گرد و پیش کے صحراؤں میں ہی ہوا۔ اس باب میں رینان کا بیان قابلِ غور ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ

> ۲۸ء کے قریب، تمام فلسطین میں یوحنا نامی ایک نوجوان کی شہرت عام طور پر پھیل گئی۔ یہ ایک نوجوان زاہد تھا جس کا دل جوش و خروش سے بھرپور تھا۔ وہ پجاریوں کے خاندان سے تھا اور (JUDEA) کے صحرا کے قریب اس کا مسکن تھا۔ بچپن ہی سے راہبانہ زندگی کی طرف اس کا میلان تھا۔ اس صحرا میں وہ اس قسم کی تجرد کی زندگی بسر کرتا تھا جیسے ہندوستان کے یوگی۔ کھال یا اونٹ کے بالوں (کے کمبل) اس کا لباس اور شہد اور جنگل کی ٹڈیاں اس کی خوراک۔ کچھ چیلے اس کے گرد و پیش رہتے تھے جو اس قسم کی مشقت کی زندگی بسر کرتے۔ ایسے ہی جیسے برہمنوں کے گرو (اور چیلے)۔ (اصل یہ ہے کہ) یوحنا کی جائے پیدائش کے قریب بحیرۂ مردار کے مشرقی کنارے پر۔ اسینی فرقہ کے لوگ رہتے تھے۔ (انہی کا اثر یوحنا پر تھا) اندازہ یہ ہے کہ اس فرقہ پر بدھ مت کی تعلیم کا اثر غالب تھا۔ (صفحہ ۹۲ — ۹۳)

یہ تھے اسینی فرقہ کے اثرات، فلسطین کے گرد و نواح میں اور ان کی تعلیم کا مرکز یوحنا[۲] بپتسمہ دینے والا۔

آگے چل کر رینان لکھتا ہے۔

> اگرچہ یوحنا کی تعلیم کا مرکز (Judea) میں تھا لیکن اس کی شہرت بہت جلد گلیل تک بھی جا پہنچی۔ اور اس طرح (حضرت) مسیح تک۔ اس وقت آپ کی ابتدائی تعلیم کے زیر اثر چند ایک لوگ آپ کے گرد جمع ہو چکے تھے ..... اس خواہش کے ماتحت کہ ذرا اس شخص کو چل کر دیکھیں تو سہی جس کی تعلیم آپ کی تعلیم سے اس قدر مشابہ تھی۔ آپ اپنے متبعین سمیت، یوحنا کے پاس تشریف لے گئے۔ (صفحہ ۹۸)

---

[۱] اس نقل مکانی کے متعلق قرآن کریم کی آیت پہلے لکھی جا چکی ہے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم نے کسی مقام کا نام نہیں لیا۔ صرف اس مقام کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ [۲] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہی یوحنا دراصل حضرت یحییٰؑ ہیں۔ اس صورت میں آپ کی تعلیم کسی غیر خدائی تعلیم سے متاثر نہیں ہو سکتی تھی۔

اس کے بعد رینان نے لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ کس طرح یوحنا کی تعلیم کے پر جوش مبلغ بن گئے اور ان دونوں نے اس صحرا میں کیسا انقلاب انگیز نظامِ روحانیت قائم کر لیا۔ یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا گیا تا آنکہ ۲۹ء میں یوحنا کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد چالیس دن کے ایک خاص چلہ سے فارغ ہو کر حضرت مسیح مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔

آپ کی تعلیم کیسی تھی؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کس قسم کی تعلیم دینے کے لئے مبعوث ہوئے تھے! کیا یہ وہی لرزہ انگیز اور انقلاب آفریں پیغام تھا جو اس سے پیشتر حضراتِ انبیاء کرام کی وساطت سے بکمال جلال و جبروت انسانوں تک پہنچتا رہا اور ہر طاغوتی قوت کے سامنے پیامِ موت بن کر آیا۔ یا وہ انسانوں کو غلامی اور محکومی۔ بے کیفی اور درماندگی۔ بے کسی اور بے بسی کا سبق دینے کے لئے آئے تھے؟ اناجیل اور دیگر عیسوی لٹریچر میں سیرتِ حضرت مسیح کی جو تصویر پیش کی گئی ہے اس سے عام طور پر یہی مترشح ہوتا ہے کہ آپ خود بھی ایک مرنجاں مرنج درویش۔ تارک الدنیا فقیر اور عاجز و ناتوان زاہد گوشہ نشین تھے اور اپنے متبعین کو بھی مسکینی و عاجزی۔ فروتنی و بے چارگی۔ محکومیت و مغلوبیت غربت و افلاس۔ نکبت و ادبار کی زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ مثلاً

> اور یسوع نے اپنے شاگردوں سے کہا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولتمند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے۔ اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے، کہ دولتمند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔ شاگرد یہ سن کر بہت ہی حیران ہوئے اور بولے کہ کون نجات پا سکتا ہے؟

اور مندرجہ ذیل وعظ تو دنیا میں بطور ضرب المثل مشہور ہے جسے ہر صاحب تغلب و استیلاء اپنے محکوموں کے لئے بطور افیون استعمال کرتا اور ہر فریب کار اپنے زہر آلود خنجر کو چھپانے کے لئے نرم و نازک ریشمیں رومال کی شکل میں ہاتھ میں رکھتا ہے۔ یہی وہ نسیم سحری ہے جسے خاص طور پر اس مقصد کے لئے بروئے کار لایا جاتا ہے کہ اس کی تھپکیاں مغلوب و مقہور، کمزور و ناتواں انسانوں کو کبھی خواب غلامی و محکومی سے بیدار نہ ہونے دیں۔ یعنی پہاڑی کا "حسین و جمیل" وعظ، جسے اناجیل نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

> تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا۔ بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی

طرف پھیردے۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتہ لینا چاہیئے تو چوغہ بھی اُسے لینے دے۔ اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لیجائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔ جو کوئی تجھ سے مانگے اُسے دے۔ اور جو تجھ سے قرض چاہے اس سے مُنہ نہ موڑ۔ (متی ۵ ۳۸ ـ ۴۲)

اور

تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا۔ اپنے پڑوسی سے محبت رکھو اور اپنے دشمن سے عداوت۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لئے دعا مانگو۔ تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھیرو۔ کیونکہ وہ اپنے سورج کو بدوں اور نیکوں دونوں پر چمکاتا ہے اور راستبازوں اور ناراستوں دونوں پر مینہہ برساتا ہے۔ (متی ۵ ۴۴ ـ ۴۵)

اس میں شبہ نہیں کہ رافت اور محبت، حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم اور آپ کے متبعین کی نمایاں خصوصیت تھی۔ چنانچہ قرآن کریم نے خود اس کی تائید کی ہے اس لئے کہ رافت و محبت کو ہر صحیح تعلیم کا ایک جزو ہونا چاہیئے۔

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَ قَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۥ وَ جَعَلْنَا فِىْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً (۵۷/۲۷)

پھر اُن کے بعد ہم نے یکے بعد دیگرے اپنے رسولوں کو بھیجا اور ان کے بعد ہم نے (اپنے رسول) مریم کے بیٹے عیسیٰ کو (بھی) بھیجا اور اُسے انجیل عطا فرمائی اور (اُن لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے اس کی پیروی کی ہم نے نرمی اور مہربانی پیدا کر دی۔

لیکن شریر کا مقابلہ نہ کرنا۔ جو کوئی کرتا لینا چاہے اسے چُغہ اتار کر خود دیدینا۔ جو ایک کوس بیگار میں لیجائے اس کے ساتھ دو کوس تک چلے جانا۔ دشمن سے محبت کرنا (انصاف نہیں، بلکہ محبت!) کس طرح تعلیم خداوندی ہو سکتی ہے؟ ہر چند یہ الفاظ بڑے خوش آیند اور نگاہ فریب ہیں، لیکن جن کی نگاہیں زندگی کے حقائق پر ہیں وہ بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کی تعلیم کبھی آسمانی تعلیم نہیں ہو سکتی! (تفصیل اس اجمال کی اپنے مقام پر آئے گی) حضرات انبیائے کرام دنیا سے فتنہ و فساد۔ جور و ستم۔ ظلم و استبداد تغلب و تہرمانیت مٹانے کے لئے آئے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ مقصدِ عظیم، شریر کا مقابلہ نہ کرنے اور کرتہ مانگنے والے کو چغہ اتار کر دیدینے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ تمام سابقہ انبیائے کرام کی تعلیم اور عملی کوائف گذشتہ مجلدات میں آپ کے سامنے آ چکے ہیں۔ غور کیجئے کہ کسی ایک مقام پر بھی آپ کو یہ تعلیم ملتی ہے! خود اس جمود افزا اور تعطل انگیز وعظ کی ابتدا جسے حضرت عیسیٰؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے) ان الفاظ سے

ہوتی ہے کہ "تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت" اور یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ یہ تعلیم حضرت موسیٰ کی ہے جو آج بھی تورات میں موجود ہے، بلکہ اس اضافہ کے ساتھ کہ "زخم کے بدلے زخم اور چوٹ کے بدلے چوٹ" (دیکھئے خروج ۲۱/۲۴) تو حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب کردہ محولہ بالا تعلیم اس تعلیم کے صریحاً خلاف ہے۔ حالانکہ خود حضرت عیسیٰ کا اعلان ہے کہ

یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت سے ہرگز نہ ٹلے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے۔ پس جو کوئی ان چھوٹے سے چھوٹے حکموں میں سے بھی کسی کو توڑے گا اور یہی آدمیوں کو سکھائے گا۔ وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلائے گا۔ لیکن جو ان پر عمل کرے گا اور ان کی تعلیم دے گا وہ آسمان کی بادشاہت میں بڑا کہلائے گا۔ کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر تمہاری راستبازی فقیہوں اور فریسیوں کی راستبازی سے زیادہ نہ ہوگی تو تم آسمان کی بادشاہت میں ہرگز داخل نہ ہو گے۔

اس سے ظاہر ہے کہ "پہاڑی کے وعظ" کی تعلیم حضرت عیسیٰ کی تعلیم نہیں ہو سکتی بلکہ بعد میں آپ کی طرف منسوب کر کے اناجیل میں شامل کر دی گئی ہے (ایسا کیوں کیا گیا تھا؟ اور اناجیل کب مرتب ہوئی تھیں۔ ان امور کی تفصیل آگے چل کر ملے گی) قرآن کریم نے جہاں عیسائیوں اور یہودیوں کی دیگر مفتریات کی علانیہ تردید کی وہاں اس حقیقت کا بھی صاف صاف اعلان کر دیا کہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم بھی وہی تھی جو انبیاء سابقہ کی تھی اور ان کی بعثت بھی اسی مقصد کے لئے ظہور میں آئی تھی جس کے لئے یہ سلسلۂ رشد و ہدایت قائم کیا گیا تھا۔ یعنی زمین پر آسمان کی بادشاہت کا قیام۔ آپ نے بھی اسی دعوت کو دُہرایا کہ

آپ کی سچی تعلیم کچھ اور تھی

.... فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۗ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ (۳/۵۰-۵۱) نیز (۴۳/۶۳-۶۴)

.... تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اور میری اطاعت کرو۔ یقیناً میرا اور تمہارا پروردگار (رب) اللہ ہے۔ سو اسی (اکیلے) کی محکومیت اختیار کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔

اللہ کی محکومیت اختیار کرو جس کی عملی صورت یہ ہے کہ اس کی حکومت کے مرکز اولین (داعیٔ انقلاب، مامور من اللہ۔ رسول) کی اطاعت کرو۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ۔ وہی حقیقت کشا اور محکومیت شکن تعلیم جو اس سے پیشتر ہمارے سامنے آتی رہی ہے۔ شرائع سابقہ کے جزئی احکام میں تبدیلیاں ہو سکتی

تھیں اور ہوتی چلی آرہی تھیں۔ لیکن اس کے اصل الاصول میں حتماً اور یقیناً کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی۔ ہر رسول اسی تعلیم کے اصل واساس کی تائید و تصدیق کے لئے آتا تھا۔ یہی حضرت عیسیٰ نے کیا۔ (دیکھئے ۳/۴۹ ۵/۴۶ ۶۱/۶) آپ کی بعثت کی غرض یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو وہ راہ دکھائی جائے جس سے وہ اس عذاب الیم سے نجات حاصل کریں جس کی وجہ سے ذلت و مسکنت (محکومی اور جمود) کی لعنت ان پر مسلط ہو رہی تھی یہی آپ کی تعلیم تھی اور یہی وعظ۔ ظاہر ہے کہ اس عظیم المرتبت مقصد کے حصول کے لئے ایک ایسی قوم کی ضرورت تھی جس کے جگر میں خون گرم۔ نگاہوں میں بصیرت۔ بازوؤں میں قوت۔ سر میں سودائے عشق اور دل

انقلاب آفریں جماعت

میں تقوائے ہو اور جو بڑی سے بڑی مصیبت کا استقبال نہایت خندہ پیشانی اور تبسم زیر لبی سے کریں۔ حضرت عیسیٰ تشریف لائے قوم تک اپنا پیغام پہنچایا لیکن دیکھا کہ قوم راکھ کا ڈھیر بن چکی ہے۔ اب یہی صورت باقی تھی کہ اس راکھ کے نیچے دبی ہوئی چنگاریوں کو یکجا کر کے انہی سے کچھ سامان حرارت فراہم کیا جائے۔ آپ نے دعوت دی اور سرفروشوں کی اس جماعت نے بڑھ کر اس پر لبیک کہا۔

فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ ۖ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ آمَنَّا بِاللَّهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ○ رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ○ (۳/۵۲-۵۳)

پھر جب ایسا ہوا کہ عیسیٰ نے بنی اسرائیل میں (اپنی دعوت کے خلاف) انکار کا احساس کیا، تو وہ پکار اُٹھا، کون ہے جو اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے؟ اس پر حواریوں نے (یعنی چند راستبازانسانوں نے جو مسیح پر ایمان لائے تھے) اس کی دعوت قبول کرتے ہوئے جواب دیا، ہم اللہ کے (کلمۂ حق کے) مددگار ہیں۔ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں، اور اے داعیٔ حق) تو گواہ رہیو کہ اس کی فرمانبرداری میں ہمارا سر جھک گیا ہے۔

دوسرے مقام پر ہے۔

وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ آمِنُوا بِي وَبِرَسُولِي قَالُوا آمَنَّا وَاشْهَدْ بِأَنَّنَا مُسْلِمُونَ ○ (۵/۱۱۱)

اور جب ایسا ہوا تھا کہ میں نے حواریوں کی طرف (یعنی اس جماعت کی طرف جو حضرت مسیح پر ایمان لائی تھی (بوساطت عیسیٰ) حکم بھیجا تھا کہ مجھ پر اور میرے رسول (مسیح) پر ایمان لاؤ، اور

اُنھوں نے کہا تھا "ہم ایمان لائے، اور خدایا! تو گواہ رہیو کہ ہم مسلم (یعنی فرمانبردار) ہیں۔
خدا کے مخلص بندوں کی اس جماعت نے جب اپنے آپ کو اس مقصد کی خاطر یوں وقف کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی معیشت کا ایسا انتظام فرما دیا کہ اس کی فکر ان کی تنگ و تاز اور سعی و عمل کی راہ میں دامنگیر نہ ہو۔

إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنَزِّلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ ۖ قَالَ اتَّقُوا اللَّهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ○ قَالُوا نُرِيدُ أَنْ نَأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُونَ عَلَيْهَا مِنَ الشَّاهِدِينَ ○ (۵: ۱۱۲-۱۱۳)

(اور دیکھو جب ایسا ہوا تھا کہ حواریوں نے کہا تھا "اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا تمہارا پروردگار ایسا کر سکتا ہے کہ آسمان سے ہم پر ایک خوان اتار دے؛ (یعنی ہماری غذا کے لئے آسمان سے غیبی سامان کر دے) عیسیٰ نے کہا: خدا سے ڈرو (اور ایسی فرمائشیں نہ کرو) اگر تم ایمان رکھتے ہو"

اُنھوں نے کہا (مقصد اس سے قدرت الٰہی کا امتحان نہیں ہے، بلکہ) ہم چاہتے ہیں (ہمیں غذا میسر آئے، تو) اس میں سے کھائیں، اور ہمارے دل آرام پائیں اور ہم جان لیں کہ تو نے ہمیں سچ بتلایا تھا، اور اس پر ہم گواہ ہو جائیں"

مائدہ کے معنی "مائدۃ من السماء" کے معنی یہ نہیں کہ اوپر سے کوئی چنا چنایا خوان اُترا تھا۔ بلکہ جیسا کہ صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کے لئے انتظام ہوا تھا۔ یا جیسے ہیکل میں حضرت مریمؑ کے لئے "منجانب اللہ" سامان معیشت پہنچ جاتا تھا۔ اس قسم کا انتظام اس جماعت مومنین کے لئے کیا گیا تھا۔

قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِنْكَ ۖ وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ○ قَالَ اللَّهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۖ فَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ ○ (۵: ۱۱۴-۱۱۵)

اس پر عیسیٰ ابن مریم نے دعا کی "اے اللہ! ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے ایک خوان

بھیج دے کہ اس کا آنا ہمارے لئے اور ہمارے اگلوں اور پچھلوں، سب کے لئے عید قرار پائے اور تیری طرف سے (فضل وکرم کی) ایک نشانی ہو۔ ہمیں روزی دے۔ تو سب سے بہتر روزی دینے والا ہے!

اللہ نے فرمایا۔ میں تمہارے لئے خوان بھیجوں گا۔ لیکن جو شخص اس کے بعد بھی راہ حق سے، انکار کرے گا، تو میں اسے (پاداش عمل میں) عذاب دوں گا۔ ایسا عذاب کہ تمام دنیا میں کسی آدمی کو بھی ویسا عذاب نہیں دیا جائے گا! ¹

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اس جماعت میں کھلے بندوں شامل تو نہ تھے لیکن انھیں ان کے مشن سے ہمدردی پیدا ہو چکی تھی۔ اور مؤیدین کی یہ جماعت، مجاہدین کی جماعت کی ضروریات زندگی کی کفیل تھی¹۔ مجاہدین کی یہی جماعت تھی جسے مسلمانوں کے لئے بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰي عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ؀ (۶۱/۱۴)

اے پیروان دعوت ایمانی! (خدا کے دین کی نشر واشاعت میں) مددگار بن جاؤ۔ (بالکل اسی طرح جیسے مریم کے بیٹے عیسےٰ نے حواریوں سے (خطاب کرکے) کہا تھا "خدا کے (دین) کی طرف میرا کون مددگار ہے؟" تو حواریوں نے کہا تھا "ہم اللہ کے (دین کے) مددگار ہیں۔" چنانچہ (ان کی کوششوں سے) بنی اسرائیل کی ایک جماعت ایمان لے آئی اور ایک جماعت (پھر بھی) انکار پر جمی رہی۔ بالآخر ہم نے ان کے دشمنوں کے برخلاف پیروان دعوت ایمانی کی تائید کے (غیب سے) سامان کر دیئے اور

---

¹ اناجیل میں "عشائے ربانی" کے متعلق جو کچھ آیا ہے اس کا اس واقعے سے کچھ تعلق نہیں۔ عشائے ربانی وہ آخری کھانا تھا جو حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں کے ساتھ کھایا اور جس میں "یسوع نے روٹی لی اور برکت چاہ کر توڑی اور شاگردوں کو دے کر کہا کہ لو کھاؤ یہ میرا بدن ہے۔ پھر پیالہ لے کر شکر کیا اور انھیں دے کر کہا کہ تم سب اس میں سے پیو کیونکہ یہ عہد کا میرا وہ خون ہے جو بہتیروں کے لئے گناہوں کی معافی کے لئے بہایا جاتا ہے" (متی ۲۶/۲۶-۲۸) عیسائیت میں اس عشائے ربانی نے عجیب و غریب معتقدات کی شکل اختیار کر لی ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ (ان پر) غالب آگئے۔ ۴

ان حواریوں کے متعلق اناجیل کی تصریحات

ان حقائق سے آپ خود اندازہ لگا لیجیے کہ یہ جماعت کس قسم کی تھی اور ان کے پیش نظر کونسا عظیم انسان مقصد تھا۔ یہ تو قرآن کریم کا بیان ہے۔ اب اس کے مقابلے میں ان ہی حواریوں کے متعلق اناجیل کا بیان دیکھئے اور پھر غور کیجیے کہ کونسی تسلیم آسمانی ہو سکتی ہے؟ اناجیل کی رو سے ان حواریوں (شاگردوں) کی تعداد بارہ تھی۔ جن میں پطرس بہت زیادہ مقرب نظر آتا ہے۔ لیکن اس پطرس کے متعلق متی کی انجیل میں لکھا ہے۔

> اُس وقت سے یسوع اپنے شاگردوں پر ظاہر کرنے لگا کہ مجھے ضرور ہے کہ یروشلم کو جاؤں اور بزرگوں اور سردار کاہنوں اور فقیہوں کی طرف سے بہت دُکھ اٹھاؤں اور قتل کیا جاؤں اور تیسرے دن جی اٹھوں۔ اس پر پطرس اس کو الگ لیجا کر اُسے ملامت کرنے لگا کہ اے خداوند خدا نہ کرے۔ یہ تجھ پر ہرگز نہیں ہونے کا۔ اس نے پھر پطرس سے کہا اے شیطان میرے سامنے سے دور ہو تو میرے لئے ٹھوکر کا باعث ہے۔ کیونکہ تو خدا کی باتوں کا نہیں بلکہ آدمیوں کی باتوں کا خیال رکھتا ہے۔ (متی ۱۶/۲۱-۲۳)

اسی انجیل کے چھبیسویں باب میں ہے کہ جب حضرت عیسیٰ کو یہودیوں کی صدر عدالت میں پیش کیا گیا تو آپ کے حواریوں کی بھی تلاش ہوئی۔ جب پطرس سے پوچھا گیا کہ وہ جناب مسیح کو جانتا ہے تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

> اور پطرس باہر صحن میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک لونڈی اُس کے پاس آکر بولی۔ تو بھی یسوع گلیلی کے ساتھ تھا۔ اُس نے سب کے سامنے یہ کہہ کر انکار کیا کہ میں نہیں جانتا تو کیا کہتی ہے۔ اور جب ڈیوڑھی میں چلا گیا تو دوسری نے اُسے دیکھا اور جو وہاں تھے اُن سے کہا۔ یہ بھی یسوع ناصری کے ساتھ تھا۔ اس نے قسم کھا کر پھر انکار کیا کہ میں اس آدمی کو نہیں جانتا۔ تھوڑی دیر کے بعد جو وہاں کھڑے تھے اُنھوں نے پطرس کے پاس آکر کہا کہ بے شک تو بھی ان میں سے ہے۔ کیونکہ تیری بولی سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اس پر وہ لعنت کرنے اور قسم کھانے لگا۔ کہ میں اس آدمی کو نہیں جانتا اور فی الفور مرغ نے بانگ دی۔ (متی ۲۶/۶۹-۷۴)

حالانکہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ "اگر تیرے (حضرت مسیح کے) ساتھ مجھے مرنا بھی پڑے تو بھی تیرا ہرگز انکار نہیں کروں گا اور سب شاگردوں نے بھی اسی طرح کہا (متی ۲۶/۳۵) ایک اور شاگرد، یہوداہ تھا

جس نے (اناجیل کے بیان کے مطابق) چند سکوں کے عوض غداری کی اور یہودیوں سے سازش کرکے حضرت عیسیٰؑ کو گرفتار کرادیا۔ باقی رہے دس۔ سو ان کے متعلق لکھا ہے کہ جب حضرت مسیحؑ کی گرفتاری کا وقت آیا تو اس پر سارے شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ (متی ۲۶/۵۶) یہ ہیں وہ "شاگرد" جنہیں عیسائیت میں "رسول" مانا جاتا ہے۔ جو اناجیل کے مؤلف ہیں اور جن سے مذہب عیسائیت آگے چلتا ہے اس کے مقابلہ میں ذرا قرآن کریم کی کشادہ دامنی اور اظہار حقیقت پر غور فرمائیے! اور یہ سب اس لئے کہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) قرآن کریم کی رُو سے یہ انبیاءِ کرام اور ان کی مومن جماعتیں کوئی غیر نہ تھے۔ ایک ہی تسبیح کے دانے اور ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں تھیں۔

ایسی تصویر کیوں؟

تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ حضرت عیسیٰ اور ان کی جماعت کی صحیح تصویر وہ نہیں جو اناجیل میں ملتی ہے اور جس کی رو سے یہ حضرات مفلوک الحال فقیروں کی دربدر پھرنے والی ٹولی سے زیادہ کچھ نظر نہیں آتے۔ اناجیل میں ایسی تصویر کیوں پیش کی گئی ہے؟ اس کی وجہ بادنیٰ تدبر سمجھ میں آسکتی ہے۔ جیسا کہ ذرا آگے چل کر معلوم ہوگا، حضرت عیسیٰؑ پر حکومت کے باغی ہونے کا الزام لگایا گیا اور اس جرم کے لئے ان پر مقدمہ چلایا گیا اور (اناجیل کی رو سے) سزائے موت دی گئی۔ اس تمام کارروائی میں خود بنی اسرائیل (یہودیوں) کے ارباب حل و عقد شامل تھے بلکہ انہی کی سازش اور اشتعال سے حکومت نے ایسا اقدام بھی کیا تھا۔ ورنہ اگر یہ شوریدہ بخت قوم خدا کے اس برگزیدہ رسول کا ساتھ دیتی تو مستبد رومیوں کی سلطنت کا تختہ الٹ جاتا اور بنی اسرائیل کی چھنی ہوئی عظمت اور لٹی ہوئی سلطنت و حکومت پھر سے واپس مل جاتی۔ حضرت عیسیٰؑ کی تبلیغ کو ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ یہودیوں کی مخالفت نے انتہائی شدت اختیار کرلی اور ان کے احبار و رہبان نے رومی حکام سے سازباز کرکے اس تحریک کو کچلنے اور ختم کرنے کی ٹھان لی۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے متبعین کی جماعت ہنوز ابتدائی حالت میں تھی کہ یہ حکومت کے زیر عتاب آگئی۔ اب ظاہر ہے کہ اس انقلابی جماعت کا اس طرح شیرازہ بکھرنے کے بعد، (حکومت اور (یہودیوں) کی طرف سے ان پر کیا کیا سختیاں نہ کی گئی ہوں گی؟ اس وقت محض عیسائی ہونا ہی ایک سنگین جرم سمجھا جاتا ہوگا! یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد اس جماعت کے اراکین کی کوئی تفصیلی تاریخ نہیں ملتی۔ اس ابتلا اور سختی کے زمانہ میں ان کے بہی خواہوں کی سب سے بڑی خواہش (اور کوشش) یہی ہوگی کہ ان کی طرف سے حکومت کے

ؔ اناجیل میں اس قسم کی باتیں کیوں داخل کی گئیں اس کی وجہ چند سطور آگے چل کر ملے گی۔

دل میں جو شبہات پیدا ہو چکے تھے، انھیں کسی نہ کسی طرح رفع کر دیا جائے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر سب سے بہتر طریق کار یہی ہو سکتا تھا کہ ان کے متعلق یہ ظاہر کیا جاتا یہ تو بچارے مرنجاں مرنج درویشوں کی ایک کمزور ناتوان سی جماعت تھی جسے حکومت و ثروت سے کچھ علاقہ نہ تھا۔ دشمن سے محبت کرو۔ بشریہ سے انتقام نہ لو۔ جو کرتہ مانگے اسے جبہ بھی اتار کر دیدو؛ یہ تھی ان غریبوں کی تعلیم۔ اور" کوئی دولتمند خدا کی بادشاہت میں پا نہیں پاسکتا۔ یہ تھا ان کا مسلک۔ اس سے ثابت کیا جاتا ہوگا کہ جو جماعت ایک گال پر طمانچہ کھاکر دوسرا گال سامنے کر دینے" کی روش پر ایمان رکھے، اس کے متعلق یہ شبہ کرنا کہ وہ حکومت سے برسرِ پیکار ہونا چاہتی تھی۔ محض اتہام اور بہتان تراشی ہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر "خدا کی بادشاہت" اور "آسمانی حکومت" کے الفاظ کی بھی ایسی تاویلیں کی جاتی ہوں گی جن سے یہ ظاہر ہو کہ اس سے مفہوم محض روحانی بادشاہت ہے دنیاوی حکومت سے اسے کچھ علاقہ نہیں۔ اسی غرض سے مذہب اور سیاست اور دین اور دنیا کو دو الگ الگ شعبے قرار دیا گیا اور حضرت مسیح کی طرف اس قسم کے واقعات منسوب کئے گئے جن سے ظاہر ہو کہ وہ سیاست اور حکومت کے معاملات میں کبھی دخیل نہیں ہونا چاہتے تھے۔ متی کی انجیل میں ہے۔

> اس وقت فریسیوں نے جاکر مشورہ کیا کہ اسے کیونکر باتوں میں پھنسائیں۔ پس انہوں نے اپنے شاگردوں کو ہیرودیوں کے ساتھ اس کے پاس بھیجا اور انھوں نے کہا اے استاد ہم جانتے ہیں کہ تو سچا ہے اور سچائی سے خدا کی راہ کی تعلیم دیتا ہے اور کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ کیونکہ تو کسی آدمی کا طرفدار نہیں۔ پس ہمیں بتا۔ تو کیا سمجھتا ہے؟ قیصر کو جزیہ دینا روا ہے یا نہیں؟ یسوع نے ان کی شرارت جان کر کہا۔ اسے ریاکارو مجھے کیوں آزماتے ہو؟ جزیہ کا سکہ مجھے دکھاؤ۔ وہ ایک دینار اس کے پاس لے گئے۔ اس نے ان سے کہا یہ صورت اور نام کس کا ہے۔ انھوں نے اس سے کہا۔ قیصر کا۔ اس پر اس نے ان سے کہا۔ پس جو قیصر کا ہے قیصر کو اور جو خدا کا ہے خدا کو ادا کرو۔ انھوں نے یہ سن کر تعجب کیا اور اسے چھوڑ کر چلے گئے۔
>
> (متی ۲۲: ۱۵–۲۲)

لیکن ذرا غور سے دیکھئے تو نظر آجائے گا کہ خود یہی واقعات، حقیقت کی غمازی کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ جب حضرت مسیح کو معاملاتِ حکومت و سیاست سے کچھ واسطہ نہ تھا تو ان سے ان معاملات کے متعلق استفسار و استصواب کا سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ ایک تارک الدنیا جوگی سے کون پوچھتا ہے کہ حکومت کو ٹیکس دینا چاہیئے یا نہیں؟ بہر حال یہ ہیں وہ قرائن جن سے مترشح ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور آپ کی جماعت کی طرف اس قسم کی تعلیم اور ایسے واقعات کیوں منسوب کئے گئے۔ لیکن خود اناجیل میں ایسی

حقیقت کی چلمنی جھلک باتیں بھی موجود ہیں جن سے اصل حقیقت کی کچھ جھلک سامنے آجاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ متی میں ہے۔

> ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور انھیں حکم دے کے کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔
>
> (متی ۱۰ / ۵)

خود قرآن کریم بھی اس پر شاہد ہے جہاں فرمایا کہ

وَ رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ ۝ (۳ / ۴۹)

بنی اسرائیل کی طرف رسول

سورۂ زخرف میں ہے۔

اِنْ ہُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَیْہِ وَ جَعَلْنٰہُ مَثَلًا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۝ (۴۳ / ۵۹)

وہ نہیں ہے مگر ایک بندہ جس پر ہم نے انعام فرمایا تھا اور قوم بنی اسرائیل کے لئے اسے نمونۂ (رشد و ہدایت) بنا دیا تھا۔

اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم اس سے پیشتر (سابقہ مجلدات میں) دیکھتے چلے آرہے ہیں کہ تمام انبیائے سابقہ کسی نہ کسی خاص قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے۔ عالمگیر بعثت تو اس رسول خاتم الانبیاءؐ ہی کی ہے جو خدا کا آخری اور مکمل پیغام لے کر آیا اور یوں سلسلۂ نبوت قیامت تک کے لئے مکمل و مختتم ہو گیا۔ بہر حال حضرت عیسیٰؑ بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور بنی اسرائیل کی جو حالت اُس زمانہ میں ہو چکی تھی۔ تاریخ اس پر شاہد ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ رومیوں کی حکومت میں یہودیوں کو

؎ اناجیل اربعہ [illegible] سے [illegible] تک کے زمانہ میں مرتب کی گئیں۔ یعنی جب حالات نے ذرا مساعدت کی اور اس جماعت کے منتشر افراد کو قدرے سکون میسر ہوا۔ اُس وقت جو جو روایات حضرت مسیحؑ کی طرف منسوب کی جاتی تھیں اُنھیں اکٹھا کیا گیا۔ روایات کے ان مجموعوں کا نام اناجیل ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں وہ باتیں بھی ہوں گی جن کے متعلق حواریوں کو خود علم ہو گا۔ اور وہ بھی جو اُس وقت زبان زدِ خلائق ہوں گی اور جنہیں بہ تقاضائے مصلحت (جس کا ذکر پہلے لکھا جا چکا ہے) ان میں شامل کرنا ضروری سمجھا گیا۔ شروع شروع میں وہی ضروری اور بے کسی کی روایات داخل کی گئی ہوں گی۔ بعد میں جب حالات بہتر ہوتے گئے تو اصل تعلیم اور واقعات کا بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اناجیل سب قیاسی ہیں یقینی کوئی نہیں۔

عبادت اور مذہبی رسوم کی آزادی حاصل تھی۔ حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ کا مقدمہ بھی پہلے یہودیوں ہی کی عدالت میں پیش ہوا تھا۔ یہودیوں میں جس چیز کی کمی تھی وہ یہی تھی کہ ان پر خدا کی بجائے انسانی قوانین کی حکومت مسلط تھی۔ یعنی ایک طرف ان کے احبار و رہبان کے قوانین کی حکومت ان کے قلب و دماغ پر۔ اور دوسری طرف رومیوں کی حکومت ملک و وطن پر۔

آپ حکومتِ الٰہیہ کا قیام چاہتے تھے

حضرت مسیح کی بعثت کی غرض یہی تھی کہ اس خدا فراموش اور محکوم و مغلوب قوم کو روح اور بدن دونوں کی غلامی سے نجات دلا کر آزادی کا صحیح راستہ دکھایا جائے۔ مسٹر (CECIL ROTH) اپنی مشہور کتاب (A Short History of the Jewish people) میں لکھتا ہے

> (حضرت مسیح) ان لوگوں میں سے تھے جنہیں رومی ارباب حکومت نے اس جرم کی پاداش میں حمل اللہ دار و رسن کر دیا کہ انھوں نے اپنی قوم کے حقوق و مفاد کی بازیابی کی جرأت کی تھی (حضرت یسوعؑ کے سامنے دو مقاصد تھے۔ ایک طرف آپ اس مسیح موعود ہونے کے مدعی تھے جسے بنی اسرائیل کو غیروں کی غلامی اور محکومی سے چھڑانے کے لئے آنا تھا اور دوسری طرف انھیں ان اخلاقی اور معاشرتی ضوابط کی پابندی کرانی تھی جو بنی اسرائیل کے مصلحین کی نمایاں خصوصیت تھی۔ (صفحہ ۱۲۳)

یعنی ایک طرف بنی اسرائیل کو رومیوں کی غلامی و محکومی سے نجات دلانا اور دوسری طرف ان کے معاشرہ کو قوانین خداوندی کے خطوط پر متشکل کرنا۔ یہ تھی غایت حضرت مسیحؑ کی بعثتِ مقدسہ کی حقیقت یہ ہے کہ جس شدت و تکرار سے "خدا کی بادشاہت" کا اعلان حضرت مسیح کی زبانِ اقدس سے ہوا ہے، آپ سے پیشتر (کتبِ تورات میں) اس انداز سے کہیں نہیں ملتا۔ اس حقیقت کو انجیل برناباس بڑے واضح الفاظ میں بیان کرتی ہے۔ فصل صفحہ ۱۳۸ میں ہے "تب ملک کے لوگوں نے آپس میں صلاح کی کہ یسوع کو اپنا بادشاہ بنانا چاہیئے"۔ اس سے آگے فصل صفحہ ۱۳۹ میں ہے کہ حضرت مسیحؑ نے فرمایا کہ

> عنقریب کاہنوں کے سردار اور قوم کے شیوخ مجھ پر اٹھ کھڑے ہوں گے اور رومانی حاکم میرے قتل کا حکم طلب کریں گے۔ کیونکہ وہ ڈرتے ہیں کہ میں بنی اسرائیل کا ملک غصب کر لوں گا۔

رومانی حاکم تو خائف تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح اُن کے ہاتھ سے حکومت چھن جائے گی۔ لیکن

احبار و رہبان بھی اسی لئے مخالف تھے

یہودی علماء و مشائخ کو بھی ان سے کچھ کم خوف و ہراس نہ تھا۔ اس لئے کہ "خدا کی بادشاہت" میں جہاں قیصریت کا کچھ کام نہیں وہاں پاپائیت (برہمنیت) کا بھی کچھ علاقہ نہیں۔ اس "ملکِ عظیم" سے

ان دونوں مافوق طاقتوں کو نکلنا ہوتا ہے۔ اس لئے یہودی احبار و رہبان بھی حضرت مسیحؑ کی مخالفت پر تلے بیٹھے تھے۔ انجیل برنباس کی فصل صہ۱۴۲ میں ہے۔

تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سرداروں کے ساتھ مشورہ کیا۔ اور کہا، اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ البتہ یہ ہم پر بڑی مصیبت ہوگی اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقہ کے موافق اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ ہماری تقالید (رسومات) کو باطل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا؟ یقیناً ہم اور ہماری اولاد (سب) تباہ ہو جائیں گے اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔

حالانکہ اس وقت یہ خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ایک بادشاہ اور ایک حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں۔ اور ہماری شریعت کی کوئی پرواہ کرنے والے نہیں۔ جیسے کہ ہم ان کی شریعت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اور اسی سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں وہ کریں۔ پس اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے قربانی اور روزہ کے ساتھ اس کا راضی بنا لینا ممکن ہے۔ مگر جبکہ یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہرگز نہ راضی بنایا جا سکے گا مگر جبکہ اللہ کی عبادت ویسی ہی ہوتے دیکھے جیسی کہ موسیٰ نے لکھی ہے

(انجیل برنباس فصل صہ۱۴۲)

کیا اس سے بڑھ کر کسی اور شہادت کی بھی ضرورت ہے۔ اس حقیقت کے ثابت کرنے کے لئے کہ حضرت مسیحؑ کا مقصد رسالت کیا تھا؟ حتیٰ کہ آخری وقت تک ان لوگوں کو یہی خیال دامنگیر تھا کہ "اگر اسے زندہ چھوڑ دیا گیا اور اس نے اپنے کو بادشاہ بنا لیا تو پھر کیا نتیجہ ہوگا؟" (انجیل برنباس فصل صہ۲۰۰) لیکن آگے

دعوتِ مسیحیت اور تلوار

بڑھنے سے پیشتر ایک اور شہادت بھی دیکھتے جائیے۔ انجیل متی میں ہے کہ آپ نے فرمایا

یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔ کیونکہ میں اس لئے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں۔ اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی ماں یا باپ کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں اور جو کوئی بیٹے یا بیٹی کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔

(متی ۱۰: ۳۴ - ۳۸)

غور فرمایا آپ نے کہ یہ کیا تعلیم ہے؟ سب سے پہلے تو وہی اصل الاصول کہ یگانگت اور بیگانگی کا میَا

فقط کفر و ایمان ہے۔ وہی معیار جس کی رُو سے باپ اور بیٹا (واقعۂ حضرت نوحؑ) بیٹا اور باپ (واقعۂ حضرت ابراہیمؑ) میاں اور بیوی (واقعۂ حضرت لوطؑ) نے ایک دوسرے سے قطع علائق کیا ؛ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ "یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں، صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں"۔

انقلابیوں کی جماعت مقدسہ یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے آپ کی بعثت ہوئی۔ اس مقصد کے حصول کے لئے فدائیوں اور سرفروشوں کی جس جماعت کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ انھیں قریہ قریہ اور بستی بستی میں اس تعلیم کے عام کرنے کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ کن ہدایات کے ساتھ بھیجا جاتا تھا؟ سُنئے۔

> ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور انھیں حکم دے کے کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا۔ اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔ اور چلتے چلتے یہ منادی کرنا کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آ گئی ہے۔ بیماروں کو اچھا کرنا۔ مُردوں کو جِلانا۔ کوڑھیوں کو پاک صاف کرنا۔ بدروحوں کو نکالنا۔ تم نے مفت پایا مفت دینا۔ نہ سونا اپنے کمربند میں رکھنا نہ چاندی نہ پیسے۔ راستے کے لئے نہ جھولی لینا نہ دو دو کرتے۔ نہ جوتیاں۔ کیونکہ مزدور اپنی خوراک کا حقدار ہے۔ اور جس شہر یا گاؤں میں داخل ہونا۔ دریافت کرنا کہ اس میں کون لائق ہے اور جب تک وہاں سے روانہ نہ ہو اسی کے ہاں رہو اور گھر میں داخل ہوتے وقت اسے دُعائے خیر دو اور اگر وہ گھر لائق ہو تو تمہارا اسلام اسے پہنچے۔ اور اگر لائق نہ ہو تو تمہارا اسلام تم پر پھر آئے۔ اور اگر تمھیں کوئی قبول نہ کرے اور تمھاری باتیں نہ سُنے تو اس گھر یا اس شہر سے نکلتے وقت اپنے پاؤں کی گرد جھاڑ دو۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ عدالت کے دن اس شہر کی نسبت سدوم اور عمورہ کے علاقہ کا حال زیادہ برداشت کے لائق ہوگا۔

اس کے بعد فرمایا۔

> دیکھو میں تمھیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑوں کو بھیڑیوں کے بیچ میں۔ پس سانپوں کے مانند ہوشیار اور کبوتروں کی مانند بھولے بنو۔ مگر آدمیوں سے خبردار رہو۔ کیونکہ وہ تمھیں عدالتوں کے حوالے کریں گے اور اپنے عبادت خانوں میں تمہارے کوڑے ماریں گے۔ اور تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کئے جاؤ گے۔ تاکہ اُن کے اور غیر قوموں کے لئے گواہی ہو۔ لیکن جب وہ تمھیں پکڑوائیں تو فکر نہ کرنا کہ ہم کس طرح کہیں اور کیا کہیں۔ کیونکہ جو کچھ کہنا ہوگا اس گھڑی تمھیں بتلایا جائے گا۔ کیونکہ بولنے والے تم نہیں بلکہ تمھارے باپ کا روح ہے جو تم میں بولتا ہے۔ بھائی کو بھائی قتل کے لئے

حوالے کرے گا اور بیٹے کو باپ، بیٹے اپنے ماں باپ کے برخلاف کھڑے ہو کر انہیں مروا ڈالیں گے اور
میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے۔ مگر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی نجات
پائے گا۔ لیکن جب تمہیں ایک شہر میں ستائیں تو دوسرے کو بھاگ جاؤ۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں
کہ تم اسرائیل کے سب شہروں میں نہ پھر چکو گے کہ ابن آدم آجائے گا۔ (متی ۱۰ - ۲۳)

کیا انقلابی جماعت کے انداز اس سے الگ کچھ اور بھی ہوا کرتے ہیں؟ ہمارا خیال ہے کہ اس کے بعد یہ حقیقت کسی مزید دلیل کی محتاج نہیں رہتی کہ حضرت مسیحؑ کا مقصد بھی اسی قسم کا انقلاب پیدا کرنا تھا جس قسم کا قلبی اور مادی انقلاب اس سے پیشتر ہم حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں رونما ہوتا دیکھ چکے ہیں اور جس انقلاب کا داعی ہر مامور من اللہ ہوتا تھا۔ لیکن ابھی ایک اور شہادت بھی موجود ہے جس کے بعد اس امر کے اثبات کے

ایک حتمی شہادت

لئے کسی اور دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ اس زمانے میں دستور تھا کہ جسے صلیب دیا جاتا۔ اس کا جرم ایک تختی پر لکھ کر اس تختی کو صلیب کے اوپر لٹکا دیا جاتا۔ انجیل کے بیان کے مطابق حضرت مسیحؑ کے ساتھ دو اور مجرم بھی صلیب دیئے گئے تھے۔ ان کے جرائم کی نوعیت بھی ان کی تختیوں پر لکھ دی گئی تھی۔ تیسری تختی (بقول اناجیل) حضرت مسیحؑ کی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس تختی پر رومی حاکم نے کیا لکھ کر لٹکایا تھا؟ متی میں ہے۔ "اس کا الزام اس کے سر کے اوپر لگا دیا کہ

"یہ یہودیوں کا بادشاہ یسوع ہے۔" (متی ۲۷ - ۳۷)

اس سے ذرا پہلے ہے کہ واقعۂ تصلیب سے پہلے جب حضرت مسیحؑ رومی سپاہیوں کی حراست میں تھے تو انھوں نے (معاذ اللہ) آپ کا تمسخر اڑایا۔ لیکن اس تمسخر میں کیا کیا؟

> اس پر حاکم کے سپاہیوں نے یسوع کو قلعہ میں لیجا کر ساری پلٹن اس کے گرد جمع کی۔ اور اس کے کپڑے اتار کر اسے قرمزی چغہ پہنایا۔ اور کانٹوں کا تاج بنا کر اس کے سر پر رکھا اور ایک سرکنڈا اس کے داہنے ہاتھ میں دیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اسے ٹھٹھوں میں اڑانے لگے کہ اے یہودیوں کے بادشاہ۔ آداب! اور اس پر تھوکا اور وہی سرکنڈا لے کر اس کے سر پر مارنے لگے۔ اور جب اس کا ٹھٹھا کر چکے تو چغے کو اس پر سے اتار کر پھر اسی کے کپڑے اسے پہنائے اور صلیب دینے کو لے گئے۔ (متی ۲۷ - ۲۷ - ۳۱)

یہ واقعہ کسی تبصرہ کا محتاج نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ رومیوں کی نگاہ میں آپ کا جرم کیا تھا؟

دوگونہ مشکلات اس مقصدِ عظیم کو لے کر، حضرت عیسیٰؑ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے۔ حضرت موسیٰؑ کے سامنے بھی دوہری قسم کی مشکلات تھیں۔ یعنی فرعون جیسے مجسمۂ استبداد کی قہرمانی قوتیں اور خود اپنی قوم کا ضعفِ خودی۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ کی مشکلات ان سے بھی کہیں بڑھ کر تھیں۔ رومی حکومت کا استبداد، فرعونی پنجۂ تغلّم سے کچھ کم نہ تھا۔ لیکن بنی اسرائیل کی طرف سے بچپن کی سی ضد اور ہٹ کا مظاہرہ نہ تھا جیسا کہ وہ عہدِ حضرت موسیٰؑ میں کرتے تھے بلکہ رومیوں سے بھی بڑھ کر تزاحم و تصادم کا خطرہ اور سچ پوچھئے تو حضرت مسیحؑ کی منزل کے آخری مراحل میں جو کچھ پیش آیا اس میں رومیوں کی نسبت، یہودیوں کا جوشِ انتقام کہیں زیادہ کارفرما تھا۔ یہودی اپنے انبیاء کی پیش گوئیوں کے مطابق ایک آنے والے نجات دہندہ کے انتظار میں تھے۔ رہبان و راہبات، خانقاہوں میں معتکف، اس مسیح کی آمد کے لئے خدا کے حضور دعائیں مانگا کرتے تھے۔ لیکن جب حضرت مسیح تشریف لائے تو سب سے پہلے انہی احبار و رہبان نے آپ کا انکار کیا۔ انکار کی وجہ تو پہلے بیان ہو چکی ہے۔ یعنی وہ دیکھتے تھے کہ جس مسلکِ حیات کی طرف حضرت مسیحؑ دعوت دیتے ہیں اس میں ان احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کی مذہبی سیادت و قیادت چھن جاتی ہے۔ لیکن اس انکار کے لئے توجیہہ یہ پیش کی گئی کہ آنے والا مسیحؑ یروشلم میں کیوں پیدا نہیں ہوا جسے دنیائے مذہب میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ گلیل کے علاقہ میں کیوں پیدا ہوا جہاں کے باشندوں کو یروشلم کے یہودی بہ نگاہ حقارت دیکھا کرتے تھے

(Martyrdom of man p. 135)

رُوح القدس کی تائید ان مشکلات و مصائب کے نامساعد ماحول میں حضرت مسیحؑ کی پکار اُٹھی۔ ظاہر ہے کہ اس جاں گداز اور صبر آزما مہم کے لئے بہت بڑی تائیدِ غیبی کی ضرورت تھی۔ قرآن کریم نے اسے "روح القدس" کی تائید کہا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ وَ قَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ز وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (۲/۸۷)

اور (پھر دیکھو ہم نے (تمہاری رہنمائی کے لئے پہلے) موسیٰؑ کو کتاب دی۔ پھر موسیٰؑ کے بعد سلسلۂ ہدایت پے درپے رسولوں کو بھیج کر جاری رکھا، بالآخر مریم کے بیٹے عیسیٰ کو سچائی کی روشن نشانیاں دیں، اور روح القدس کی تائید سے ممتاز کیا۔

روح کے مفہوم کے لئے ابلیس و آدم میں ملائکہ کا عنوان دیکھئے۔ اس سے مراد وحیِ الٰہی یا وہ ناموسِ اکبر (جبریلؑ) ہے جس کی وساطت سے نزولِ وحی ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اس سے مقصود وہ تائید

خداوندی ہوگی جو بصورتِ وحی حضراتِ انبیاء کرام کے شاملِ حال ہوتی ہے اور جس کی رُو سے اپنے نفسِ بعین کی حقانیت اور دعوے کی صداقت ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہو کر سامنے آجاتی ہے اور کبھی پاؤں میں لغزش نہیں پیدا ہونے دیتی۔ باقی رہے بیّنات۔ سو ان سے وہ واضح دلائل مراد ہیں جن کے ساتھ وحی کو پیش کیا جاتا ہے۔

وَلَمَّا جَآءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُم بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُم بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝

اور (دیکھو) جب عیسیٰ واضح دلائل کے ساتھ آیا تو اُس نے (بنی اسرائیل سے) کہا "میں تمہارے پاس حکمت (کی باتیں) لیکر آیا ہوں۔ اور (اس لئے آیا ہوں) تاکہ ان باتوں کو تمہارے لئے کھول کھول کر بیان کر دوں جن میں تم اختلاف کرتے رہتے ہو۔ لہٰذا قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اور میری اطاعت کرو!"

بینات و معجزات

یہاں بینات سے مراد وہ دلائلِ روشن و براہینِ محکم ہیں جو بذریعہ وحی آپ کو دیئے گئے اور جو یکسر حکمت و بصیرت پر مبنی تھی۔ باقی رہے معجزات سو ان کے متعلق سورۂ آل عمران میں ہے:

وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَآءِيلَ ۝ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ (۳/۴۹)

"اور اسے بنی اسرائیل کی طرف بہ حیثیت رسول کے بھیجے گا" (اس کی منادی یہ ہوگی کہ) دیکھو، میں تمہارے پروردگار کی نشانی لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ میں تمہارے لئے مٹی سے ایسی چیز بنا دوں جو پرندہ کی سی صورت رکھتی ہو۔ پھر اس میں پھونک ماردوں اور اللہ کے حکم سے پرند ہو جائے ایسا اللہ کے حکم سے اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کر دوں اور مردوں کو زندہ۔ اور جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے جمع کرتے ہو سب تمہیں بتلا دوں۔ اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھنے والے ہو تو یقیناً ان باتوں میں تمہارے لئے بڑی ہی نشانی ہے!"

اور سورۂ مائدہ میں ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْــــَٔــةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ (۵:۱۱۰)

اُس دن اللہ کہے گا" اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! میں نے تم پر اور تمہاری ماں پر جو انعام کئے ہیں، انھیں یاد کرو! جب ایسا ہوا تھا کہ میں نے روح القدس سے تمھیں قوت دی تھی۔ تم لوگوں سے کلام کرتے تھے۔ چھوٹی عمر میں بھی اور بڑی عمر میں بھی اور جب ایسا ہوا تھا کہ میں نے تمھیں کتاب و حکمت اور تورات و انجیل سکھلا دی تھی۔ اور جب ایسا ہوا تھا کہ تم میرے حکم سے مٹی لیتے اور پرند کی شکل جیسی چیز بناتے، پھر اس میں پھونک مارتے، اور وہ میرے حکم سے ایک پرند ہو جاتا۔ اور جب ایسا ہوا تھا کہ تم میرے حکم سے اندھے اور برص کے بیمار کو چنگا کر دیتے۔ اور جب ایسا ہوا تھا کہ تم میرے حکم سے مردوں کو موت (کی حالت) سے باہر لے آتے، اور جب ایسا ہوا تھا کہ میں نے بنی اسرائیل کا شر جو وہ تمھارے خلاف کر رہے تھے، روک دیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ تم (سچائی کی) روشن دلیلیں اُن کے سامنے لے گئے تھے، اور اُن میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی، وہ بول اُٹھے تھے" یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ آشکارا جادوگری ہے۔

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے زمانے میں ایسینی فرقہ نے طبابت اور قوت ارادی کے عملیات وغیرہ میں بڑی مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ خدمتِ خلق ان کا مسلک تھا جس کی وجہ سے وہ ہر جگہ مقبول تھے۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ اپنے شاگردوں کو تبلیغ کے لئے بھیجتے تھے تو انھیں تاکید کرتے تھے کہ "بیماروں کو اچھا کرنا۔ مردوں کو جلانا۔ کوڑھیوں کو پاک صاف کرنا۔ بدروحوں کو نکالنا " اور ان تمام خدمات کے معاوضہ میں کچھ نہ لینا۔" تم نے مفت پایا ہے۔ مفت دینا " (متی ۸:۱۰) ظاہر ہے کہ قریہ قریہ بستی بستی۔ اللہ کا پیغام پہنچانے والوں کے لئے، اپنے زمانہ اور ماحول کے تقاضوں کے اعتبار سے اس سے بہتر طریق کار اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور جب ان شاگردوں میں علاج معالجہ وغیرہ کی یہ خصوصیات تھیں

تو جو لوگ خود حضرت عیسیٰؑ کے پاس آتے ہوں گے وہ اس باب میں بہت بڑی توقعات لے کر آتے ہوں گے۔ اور ان کی یہ توقعات پوری بھی ہوتی ہوں گی۔ کیونکہ حضرت عیسیٰؑ تو اس مقام پر تھے جہاں کوئی انسان کسب و ہنر سے پہنچ نہیں سکتا۔ یعنی اگر اللہ تعالےٰ نے انھیں یہ خصوصیات بطور معجزہ عطا فرمائی ہوں گی تو پھر کوئی دوسرا انسان اس کا ہم پلہ ہو نہیں سکتا تھا۔ معجزات کے متعلق تفصیلی طور پر معراج انسانیت میں لکھا گیا ہے۔ وہاں منجملہ دیگر امور، یہ بات بھی سامنے آگئی ہے کہ معجزات کے متعلق گفتگو اب ایک تاریخی بحث ہے۔ اس لئے کہ خود نبی اکرمؐ کو (قرآن کے علاوہ) کوئی حسی معجزہ نہیں دیا گیا۔ اور حضورؐ کے بعد سلسلۂ نبوت ہی ختم ہو گیا اس لئے اب کسی کو معجزہ ملنے یا نہ ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک سابقہ انبیائے کرام کا تعلق ہے، ایک گروہ معجزات کے متعلق قرآن کے الفاظ کو ان کے حقیقی معانی پر محمول کرتا ہے اس لئے معجزات کو حسی معجزات (physical Miracles) سمجھتا ہے۔ لیکن دوسرا گروہ، ان الفاظ کے مجازی معنی لیتا ہے اور ان سے متعلق بیان کو استعارہ سمجھتا ہے۔ اس صورت میں حضرت عیسیٰؑ کے معجزات سے مراد ان کے آسمانی پیغام کی اعجاز نمائی ہو گا جو مردوں کی بستی میں صور اسرافیل پھونک دیتا ہے[1]۔ (قرآن نے اکثر مقامات پر غلط روش پر چلنے والوں کو مردے، اور آسمانی آواز پر لبیک کہنے والوں کو زندہ انسان کہا ہے) وہ بے بال و پر، کمزور و ضعیف انسانوں کو بازوئے شاہین عطا کر دیتا ہے (کَهَيْئَةِ الطَّيْرِ) جس سے وہ عروج و اعتلا کی فضاؤں میں اُڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ وہ انقلابی پیغام، ان نیم مردہ (لیکن زندگی کی آرزو رکھنے والوں) سے علانیہ کہتا ہے کہ

اگر یک قطرہ خوں داری، اگر مشتِ پرے داری
بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

وہ آنکھوں پر سے جہل و تعصب کے ظلمت انگیز پردے اُٹھا کر انھیں نورِ بصیرت عطا کرتا ہے۔ وہ ان کے قلوب کے امراض کو شفا بخشتا ہے اور اس طرح ایک پیکرِ آب و گِل کو جیتے جاگتے، تندرست و توانا انسان کی شگفتہ و شاداب صورت عطا کر دیتا ہے[2]۔

---

[1] قرآن کریم میں قوموں کی حیات اجتماعیہ کو "زندگی" اور ان کی تباہ حالی کو "موت" سے تعبیر کیا گیا ہے اور رسولوں کی بعثت اس موت کو زندگی میں تبدیل کرنے کے لئے ہوتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (۸/۲۴)

"سلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دو، جب وہ پکارتا ہے تاکہ تمھیں (روحانی موت کی حالت سے نکال کر) زندہ کر دے۔"

(۲ فٹ نوٹ صفحہ ۶۳ پر دیکھئے)

باقی رہا وَ اُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِکُمْ (۳:۴۹) اس سے مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں وہ احکام خداوندی بیان کروں گا جن سے واضح ہو جائے کہ کن کن چیزوں کا ذخیرہ رکھنا جائز ہے اور کون کون سی چیزیں ایسی ہیں جن میں احتکار و اکتناز جائز نہیں۔

یہ تو رہا قرآن کے متبعین کا مسلک۔ جہاں تک مذہب کے عیسائی مورخین اور مفکرین کا تعلق ہے وہ بیماروں سے متعلق معجزات کو علاج سے تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً رینان اس باب میں لکھتا ہے:-

> سماریہ میں۔ جو اس مقام سے جہاں (حضرت عیسیٰ) رہتے تھے تھوڑے سے فاصلہ پر تھا۔ ایک جادوگر رہتا تھا جس کا نام سائمن تھا۔ اس نے اپنی شعبدہ بازیوں سے (لوگوں کی نگاہوں میں) قریب قریب الوہیت کا مقام حاصل کر رکھا تھا۔ (صفحہ ۱۵۹)

اس سے رینان کا مقصود یہ بتانا ہے کہ اس زمانے میں سحر و عملیات کا کتنا چرچا تھا۔ پھر وہ لکھتا ہے۔

> قریب قریب وہ تمام معجزات جن کے متعلق (حضرت) عیسیٰ نے خیال کیا کہ آپ سے سرزد ہوئے ہیں امراض کے علاج سے متعلق تھے۔ اس زمانے میں، جیسا کہ آج بھی مشرق میں عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ علاج الامراض کوئی سائنٹفک شے متصور نہیں ہوتا تھا بلکہ اسے خیال کیا جاتا تھا گویا کہ وہ علاج کرنے والے کا ذاتی الہام ہے۔ سائنٹفک طریق علاج، جسے پانچ سو سال پیشتر یونانیوں نے ایجاد کیا تھا، اس زمانے میں فلسطین کے یہودی اس سے واقف نہ تھے۔ ان حالات کے ماتحت، کسی بزرگ انسان کا مریضوں کے ساتھ شفقت سے پیش آنا اور انہیں ان کی صحت کا یقین دلا دینا واقعی صحت کا موجب بن جاتا تھا۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ خاص خاص زخموں کو چھوڑ کر۔ عام امراض میں کسی بزرگ انسان کا مریض کو چھو دینا۔ بڑی بڑی دوائیوں جیسا کام کر دیتا ہے۔ کسی مقدس ہستی کی طرف تو دیکھ لینا ہی شفا بخش دیتا ہے۔ اس کا تو تبسم ہی امید افزا اور زندگی بخش ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ جب امراض کے متعلق یہ یقین ہو کہ وہ گناہوں کا نتیجہ ہیں یا بد روحوں کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں (اور طبعی اسباب کی وجہ سے نہیں ہیں) تو بہترین طبیب وہ مقدس انسان ہوتا ہے جس کا تعلق عالم بالا سے ہو۔ (اس زمانے

ٓ۱ فٹ نوٹ (متعلقہ صفحہ ۶۲) جن لوگوں میں کوئی معنوی نقص ہوتا یہودی انہیں ناپاک تصور کیا کرتے تھے۔ اور انہیں مذہبی رسومات میں شریک ہونے اور قربان گاہوں میں داخلے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ (دیکھئے احبار ۲۲:۱۷-۲۴) اسی طرح برص کے مریضوں کو بھی ناپاک تصور کیا جاتا تھا (احبار باب ۱۳) حضرت عیسیٰ نے یہودیوں کی ان خود ساختہ پابندیوں کی مخالفت کی تاکہ اس قسم کے مریض پھر سے انسانوں کے زمرے میں شمار ہونے لگ جائیں۔ اس صورت میں مریضوں کی شفایابی سے یہ بھی مقصود ہو سکتا ہے۔

میں امرگی یا اسی قسم کی اعصابی بیماریاں بھوتوں کی وجہ سے تصور کی جاتی تھیں...... ان حالات میں ہمدردی کے چند جملے بدروح کو نکال دینے کے لئے کافی ہوتے تھے۔ (حضرت) عیسیٰ انہی طریقوں سے اپنے بیماروں کا علاج کرتے تھے۔ (صفحہ ۱۹۴-۱۹۰)

اس کے بعد مصنف لکھتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ سے آپ کے مخالفین کسی معجزہ کا مطالبہ کرتے تو آپ اس سے بہ شدت انکار کر دیا کرتے تھے۔ ایسے معجزات کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ "یہ آپ کے شاگردوں کے افسانے ہیں جو اپنے آقا کی صحیح عظمت کا اندازہ نہ لگا سکے اور لگے اس قسم کی چیزوں سے بڑھانا چڑھانا شروع کر دیا۔" (صفحہ ۱۹۴) اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ آپ کی صحیح عظمت اس انقلاب عظیم کے اندر پوشیدہ تھی جو آپ کی وجہ سے رونما ہوا۔ یہ وہ انقلاب تھا جسے کوئی جادوگر یا عامل وجود میں نہیں لا سکتا۔

کوئی شعبدہ باز۔ بزنگ سائنس۔ وہ اخلاقی انقلاب پیدا نہیں کر سکتا تھا جو حضرت عیسیٰ نے پیدا کیا۔ (صفحہ ۱۹۵)

اسی طرح (E.R. Micklem) نے اپنی کتاب (Miracles And The New Psychology) میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عیسیٰ جن بیماریوں کا علاج "معجزانہ انداز" سے کرتے تھے وہ در اصل (Psychotherapy) "نفسیاتی طریق علاج تھا، جو اس زمانے کے لوگوں کے نزدیک فی الواقع معجزہ تھا۔

اگر یہ طریق علاج نفسیاتی ہی تھا تو اس باب میں ہمارا (یعنی قرآن پر ایمان رکھنے والوں کا) عقیدہ ہے کہ اس کے متعلق نہ تو (معاذ اللہ) حضرت عیسیٰ خود کسی غلط فہمی کا شکار ہوں گے کہ وہ اسے معجزہ سمجھتے ہوں اور نہ ہی کبھی یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اسے معجزہ کہہ کر پیش کرتے ہوں۔ خدا کا رسول، علم اور کیریکٹر دونوں اعتبارات سے اتنا بلند ہوتا ہے کہ وہ اپنے متعلق نہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے اور نہ ہی کبھی غلط بیانی کرتا ہے۔

بہرکیف، حضرت عیسیٰ تشریف لائے اور با ہمہ جلال و جمال جلوہ افروز محفل ہوئے۔ ان کے آبگینۂ ساوی میں زندگی کے تمام سامان موجود تھے لیکن شفا تو اسی مریض کو مل سکتی تھی جو دوائی کا استعمال کرے اور طبیب کی ہدایات پر کاربند ہو۔ جو بیمار طبیب مشفق کو دشمن جاں اور اس کی دوا کو سامان ہلاکت سمجھنے لگے بھلا کس طرح شفا نصیب ہو سکتی ہے؟ یہ یہودی حضرت موسیٰ کے زمانے کے بنی اسرائیل نہ تھے کہ ہرچند

اُن سے بچپن کی سی حماقتیں سرزد ہوتی تھیں لیکن دل میں ہنوز کسی کا خوف اور جذبۂ تعظیم باقی تھا جس کی وجہ سے وہ دوائی بھی پی لیتے تھے اور (کم از کم) آنکھوں کے سامنے پرہیز بھی کرتے تھے۔ لیکن اب تو ان میں سرکشی و عدوان اور ضد اور تعصب اپنی انتہا تک پہنچ چکا تھا اور اس کا سبب تھے وہ علماء و مشائخ جنہوں نے

یہود کی سرکشی

اپنی "خدائی" کی مسندیں بچھا رکھی تھیں اور جن کی وجہ سے قوم کے مزاج خانقاہی میں اس قدر پختگی اور اُن کی خوئے اسلاف پرستی میں ایسی محکمی پیدا ہوچکی تھی کہ وہ اپنے مسلک سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہٹنا نہیں چاہتے تھے۔ بغور دیکھئے تو یہودیوں کی اس وقت کی حالت، اُن کی اسارتِ بابل کے زمانے کی حالت سے بھی بدتر ہوچکی تھی۔ وہ ایک آنے والے نجات دہندہ کے ہمہ تن چشم منتظر تھے۔ لیکن چونکہ تعلیمِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے سے اُن کی اپنی "خدائی" چھنتی تھی اس لئے علماء و مشائخ کے اس رہزنوں کے گروہ نے حضرت عیسیٰؑ کی سخت مخالفت کی اور اس جوشِ مخالفت میں ان حربوں پر اُتر آئے جو فی الحقیقت باعثِ ننگِ انسانیت تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم میں "برہمنیت" پیدا ہوجائے تو مذہبی سطوت و اقتدار کے "خداوند" اپنی مسانیدِ عظمت و عقیدت کو برقرار رکھنے

علماء کی مخالفت

کے لئے جو کچھ بھی کر گزریں کم ہے۔ انجیلِ برناباس کا جو اقتباس پہلے دیا جاچکا ہے اسے ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے۔ یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ ان علمائے یہود کی مخالفت کا جذبۂ محرکہ کیا تھا۔ اُنھیں خطرہ تھا کہ

> اگر یہ بادشاہ ہوگیا تو ہم کیا کریں گے۔ البتہ یہ ہم پر بڑی مصیبت ہوگی۔ اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے موافق اصلاح کرنا چاہتا ہے..... اس لئے جب ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔ (فصل ۱۴۲)

کسی قوم کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ یہ حقیقت بے حجابانہ سامنے آجائے گی کہ اس کی غلامی و محکومی کی زنجیریں پختہ سے پختہ تر کرنے کے لئے ان کے پُرفریب خانقاہ نشینوں اور مسانیدِ علم و ارشاد پر بر خود غلط تمکن گزینوں کا کس قدر ہاتھ ہوتا ہے؛ جس قدر بھیانک جرائم ان گوشوں سے نمودار ہوتے ہیں، دنیا کے کسی اور گوشے سے باید و شاید۔ احبار و رہبانِ یہود کی اس تمام سازش اور غداری کو قرآن کریم نے ایک جامع لفظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے، جہاں فرمایا کہ وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝ (۳/۵۳) اُنہوں نے ایک چال سوچی۔ ایک خفیہ تدبیر کی۔ یہ فریب کاری کی چال اور غدارانہ تدبیر کیا تھی؟ یہی کہ حکومت کو حضرت عیسیٰؑ کے خلاف مشتعل کردیا جائے اور یوں اس "خطرہ" سے حفاظت کا سامان پیدا کرلیا جائے! یا للعجب!! متی کی انجیل میں ہے۔

اس وقت سردار کاہن اور قوم کے بزرگ کائفا نام سردار کاہن کے دیوان خانے میں جمع ہوگئے۔ اور صلاح کی کہ یسوع کو فریب سے پکڑ کر قتل کریں۔ مگر کہتے تھے کہ عید کو نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ لوگوں میں بلوہ ہو جائے۔

(متی ۲۶/۳-۵)

سنگین سازش

اس کے بعد ہے

اس وقت ان بارہ میں سے ایک نے جس کا نام یہوداہ اسکریوطی تھا سردار کاہنوں کے پاس جاکر کہا کہ اگر میں اُسے تمہارے حوالے کرادوں تو مجھے کیا دوگے؟ اُنھوں نے اسے تیس روپے تول کر دیدیئے۔ اور وہ اس وقت سے اس کے پکڑوانے کا موقع ڈھونڈنے لگا۔ (متی ۲۶/۱۴-۱۶)

پھر ذرا آگے چل کر مذکور ہے کہ

اور یسوع کے پکڑوانے والے اس کو کائفا نام سردار کاہن کے پاس لے گئے جہاں فقیہ اور بزرگ جمع ہوگئے تھے۔ اور پطرس فاصلے پر اس کے پیچھے پیچھے سردار کاہن کے دیوان خانے تک گیا اور اندر جاکر پیادوں کے ساتھ نتیجہ دیکھنے کو بیٹھ گیا اور سردار کاہن اور سارے صدر عدالت والے یسوع کو مار ڈالنے کے واسطے اس کے خلاف جھوٹی گواہی ڈھونڈنے لگے۔ مگر نہ پائی۔ گو کہ بہت سے جھوٹے گواہ آئے۔ لیکن آخر کار دو گواہوں نے آکر کہا کہ۔ اس نے کہا ہے میں خدا کے مقدس ہیکل کو ڈھا سکتا اور تین دن میں اُسے بنا سکتا ہوں۔ اور سردار کاہن نے اُس سے کھڑے ہو کر کہا۔ تو جواب نہیں دیتا؟ یہ تیرے خلاف کیا گواہی دیتے ہیں؟ مگر یسوع چپکا ہی رہا۔ سردار کاہن نے اُس سے کہا۔ میں تجھے زندہ خدا کی قسم دیتا ہوں اگر تو خدا کا بیٹا مسیح ہے تو ہم سے کہہ دے۔ یسوع نے اُس سے کہا۔ تو نے خود کہہ دیا۔ بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اس کے بعد تم ابن آدم کو قادر مطلق کی دہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھو گے۔ اس پر سردار کاہن نے یہ کہہ کر اپنے کپڑے پھاڑے کہ اس نے کفر بکا ہے۔ اب ہمیں گواہوں کی کیا حاجت رہی؟ دیکھو تم نے ابھی یہ کفر سنا ہے۔ تمھاری کیا رائے ہے؟ اُنھوں نے جواب میں کہا۔ وہ قتل کے لائق ہے اس پر اُنھوں نے اُس کے مُنہ پر تھوکا اور اُس کے مکّے مارے اور بعض نے طمانچے مار کے کہا۔ اے مسیح ہمیں نبوت سے بتا کہ کس نے تجھے مارا۔ (متی ۲۶/۵۷-۶۸)

چنانچہ

جب صبح ہوئی تو سب سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں نے یسوع کے خلاف مشورہ کیا کہ اُسے

مار ڈالیں اور اُسے باندھ کر لے گئے اور پیلاطس حاکم کے حوالے کیا۔　　　　(متی ۲۷ : ۱-۲)

اس کے بعد حسب بیان اناجیل، حضرت مسیحؑ کو رومی حاکم (پیلاطوس) کی عدالت میں پیش کیا گیا اور وہاں سے یہودیوں کے زور دینے پر فتوائے موت صادر ہوا[1] اور یوں بنی اسرائیل کی اس شوریدہ بخت قوم نے اپنی آخری تباہی اور بربادی کے لئے خدا کے غضب و عتاب کو خود اپنے ہاں دعوت دی اور اپنی قبر اپنے ہاتھوں کھود دی۔

اس کے بعد! واقعۂ تصلیب کے متعلق، اناجیل کے بیانات شروع میں درج کئے جا چکے ہیں۔ ان پر ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈال لیجئے، اس لئے کہ اب ہم قرآن کریم کی روشنی میں خود اس منزل تک آ پہنچے ہیں۔ یہودیوں کے ہاں صلیب کی موت، لعنتی موت خیال کی جاتی تھی۔ اس لئے وہ بہت خوش تھے کہ اُنھوں نے اپنی آتش انتقام کو خوب ٹھنڈا کیا۔ عیسائی خود اس کے معترف تھے (اور ہیں) کہ حضرت عیسیٰؑ کو واقعی سولی پر چڑھایا گیا اور اُنھوں نے وہیں جان دی۔ اس کے بعد آپؑ کو یوسفؑ والے باغ میں دفن کیا گیا۔ جہاں سے آپ تیسرے دن جی اُٹھے اور شاگردوں سے پند و نصائح کرنے کے بعد اُٹھا لئے گئے۔ اور (ان کے عقیدہ کے مطابق) یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ خدا (یا خدا کا اکلوتا بیٹا) اپنی قربانی سے نوع انسانی کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔ چنانچہ پولس کے خط بنام گلیتون میں مذکور ہے۔

> کیونکہ جتنے شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں وہ سب لعنت کے ماتحت ہیں، چنانچہ لکھا ہے کہ جو کوئی ان سب باتوں کے کرنے پر قائم نہیں رہتا جو شریعت کی کتاب میں لکھی ہیں وہ لعنتی ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ شریعت کے وسیلے سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راستباز نہیں ٹھہرتا۔ کیونکہ لکھا ہے کہ راستباز ایمان سے جیتا رہے گا۔ اور شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں۔ بلکہ لکھا ہے کہ جس نے اُن پر عمل کیا وہ ان کے سبب سے جیتا رہے گا مسیح جو ہمارے لئے لعنتی بنا اُس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا۔ کیونکہ لکھا ہے کہ جو کوئی لکڑی پر لٹکایا گیا وہ لعنتی ہے۔ تاکہ مسیح یسوعؑ میں ابراہیم کی برکت غیر قوموں تک بھی پہنچے۔ اور ہم ایمان کے وسیلے سے اُس روح کو حاصل کریں جس کا وعدہ ہوا ہے۔　　　　(گلیتون ۳ : ۱۰-۱۴)

---

[1] یہودیوں کی صدر عدالت کو سزائے موت کے علاوہ ہر قسم کی سزا دینے کی اجازت تھی۔ سزائے موت کے لئے انھیں رومی گورنر کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ (Martyrdom of Man p. 168)

لیکن ہم نے دیگر اناجیل کی بیان کردہ تفصیلات کے ساتھ انجیل برنباس کا بیان بھی دیکھا ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت مسیح اپنی گرفتاری سے پہلے ہی (بتائید خداوندی) محفوظ نکال لئے گئے اور آسمان پر اٹھا لئے گئے تھے۔ یہودیوں کو اس باب میں سخت اشتباہ ہوا۔ انھوں نے یہودا اسکریوطی کو جو سازش کر کے حضرت مسیح کی نشان دہی کے لئے آیا تھا، خود مسیح سمجھ کر گرفتار کیا اور یہی یہودا تھا جسے صلیب دی گئی۔ شاگردوں نے تیسرے دن (اور بعض روایات کے مطابق، اسی رات) اس کی لاش کو چرا لیا، اور عوام میں مشہور کر دیا کہ حضرت مسیح جی اٹھے اور آسمان پر تشریف لے گئے۔ اس کے بعد حضرت مسیح آسمان سے نازل ہوئے اور شاگردوں سے وعظ نصیحت کے بعد پھر آسمان پر واپس چلے گئے۔ (یہ انجیل برنباس کی تفاصیل کا خلاصہ ہے)۔

یہ ہیں اس واقعہ کے متعلق یہودیوں اور عیسائیوں کے بیانات وعقائد، جو ظاہر ہے کہ افراط وتفریط پر مبنی ہیں۔ لیکن اگر ہم قندیل قرآن کی روشنی میں تلاش حقیقت کے لئے نکلیں تو اصل واقعہ کے خطوط افراط

قرآنی تفاصیل

وتفریط کی اس کہر سے نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ قرآن کریم نے سب سے پہلے، ایک ایسی اصولی چیز بیان فرمائی ہے کہ اس اختصار میں تمام تفاصیل وجزئیات محصور ہو گئی ہیں۔

وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ○ (۳/۵۴)

اور پھر ایسا ہوا کہ یہودیوں نے (مسیح کے خلاف) مکر کیا (یعنی مخفی اور باریک طریقے مخالفت کے کام میں لائے) اور خدا بھی ویسے ہی طریقے کام میں لایا (یعنی مسیح کی حفاظت کے پوشیدہ اسباب وذرائع پیدا کر دیئے) اور یاد رکھو، (اللہ جسے بچانا چاہے، تو) مخفی طریقوں سے کام لینے والوں میں اس سے بہتر کوئی نہیں!

یعنی یہودیوں کی تدبیر یہ تھی کہ حضرت مسیح کو گرفتار کر کے رومیوں کے ہاتھوں صلیب پر لٹکوا دیا جائے۔ لیکن اللہ ان کی اس تدبیر سے بے خبر نہ تھا۔ اس نے اپنے اس برگزیدہ رسول کو اس "لعنتی موت" سے بچانے کی خود تدبیر کر رکھی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ انسانوں کے مقابلہ میں خدائی تدبیر ہمیشہ کامیاب ہو گی۔ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ۔

یہودیوں کا دعوٰے ہے کہ حضرت مسیح کو صلیب دیا گیا اور اس طرح وہ (معاذ اللہ) لعنت کی موت مرے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ سب غلط ہے۔

وَ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ

وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ
اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ
الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۙ (۴/۱۵۷)

اور (نیز) ان کا یہ کہنا کہ ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو جو خدا کے رسول ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، (سولی پر چڑھا کر) قتل کر ڈالا۔ حالانکہ (واقعہ یہ ہے کہ) نہ تو انھوں نے قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھا کر ہلاک کیا۔ بلکہ حقیقت اُن پر مشتبہ ہو گئی۔ (یعنی صورت حال ایسی ہو گئی کہ انھوں نے سمجھا، ہم نے مسیح کو مصلوب کر دیا، حالانکہ یہ صحیح نہیں تھا) اور جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا (یعنی عیسائیوں نے جو کہتے ہیں مسیح مصلوب ہوئے لیکن اس کے بعد زندہ ہو گئے) تو بلاشبہ وہ اس کی نسبت شک و شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس بارے میں اُن کے پاس کوئی یقینی بات نہیں ہے بجز اس کے کہ ظن و گمان کے پیچھے جائیں۔ اور یقیناً انھوں نے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا۔

اُنھوں نے یقیناً نہ حضرت عیسیٰؑ کو قتل کیا اور نہ صلیب پر لٹکایا۔ پھر ہوا کیا؟ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (اُنھیں اس باب میں سخت اشتباہ ہو گیا) بس اس ٹکڑے کے اندر اصل واقعہ نقاب اوڑھے مسکرا رہا ہے۔ اس کے متعلق یہود و نصاریٰ جو طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں، وہ محض ظن و تخمین ہے علم و حقیقت نہیں۔ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ۔ حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ اُنھوں نے حضرت مسیحؑ کو ہرگز ہرگز قتل نہیں کیا۔ اس لئے یہ دعوےٰ کہ وہ (معاذ اللہ) ایک لعنتی کی موت مرے سرتاسر لغو اور بے بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بکمال حکمت و تدبیر حضرت مسیحؑ کو یہودیوں کی مشئوم چال سے محفوظ رکھا اور لعنتی کی موت کے بجائے، عزت و تکریم کی اس انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا جو ایک رسول کا صحیح مقام ہے۔

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۞ (۴/۱۵۸)

بلکہ اللہ نے اُسے اپنی طرف اٹھا لیا، اور اللہ سب پر غالب رہنے والا، اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے۔

اُن تک یہودیوں کا ہاتھ پہنچنے ہی نہیں دیا۔ وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ (۵/۱۱۰) اور اس کے متعلق حضرت عیسیٰؑ کو پہلے ہی سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ
مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ

كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۖ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝ (۳/۵۵)

اور (پھر) جب ایسا ہوا تھا کہ اللہ نے فرمایا تھا " اے عیسیٰ! میں تیرا وقت پورا کروں گا، تجھے اپنی طرف اُٹھالوں گا، تیرے منکروں (کی تہمتوں) سے تجھے پاک کردوں گا اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی ہے اُنھیں قیامت تک تیرے منکروں پر برتری دوں گا۔ اور بالآخر تم سب کو میری ہی طرف لوٹنا ہے سو اس دن اُن باتوں کا فیصلہ کردوں گا جن میں تم ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہو۔

آپ گرفتار ہی نہیں ہوئے

ان تصریحات سے مترشح ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے، جس شخص کو صلیب پر چڑھایا گیا تھا وہ حضرت عیسیٰ نہیں تھے بلکہ اُن لوگوں پر حقیقتِ حال مشتبہ ہوگئی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ گرفتاری سے پہلے ہی محفوظ کر دیئے گئے تھے اور اس بنا پر انجیل برنباس کا بیان (اس کے بعض حصّوں کو چھوڑ کر) زیادہ قابلِ اعتماد نظر آتا ہے کیونکہ وہ قرآن کریم کی بیان کردہ حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہودیوں کی سازش کا علم ہوجانے کے بعد حضرت عیسیٰ بحکم خداوندی خاموشی سے کسی اور مقام کی طرف تشریف لے گئے۔ اور آپ کے شاگردوں کو اس حقیقت کا علم تھا۔ قرآن کریم نے قدوسیوں کی اس جماعت کا جس انداز سے ذکر کیا ہے اس کے پیشِ نظر یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ اُنھیں معلوم ہو کہ سچ مچ حضرت مسیح کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور اُن پر مقدمہ چلا کر اُنھیں سزائے موت دی جائے گی اور اس پر بھی وہ نہ صرف خاموش بیٹھے رہیں بلکہ آپ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ ایک رسول کی معیت میں اس کے صحیح متبعین کی جماعت کی روح کس قدر بلند ہوتی ہے؟ اس کا ہم اندازہ ہی نہیں کر سکتے؟ اگر ضرورت پڑے تو وہ دنیا کی اس محبوب ترین شخصیت کی حفاظت کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں اور اس میں عشرتِ دوام محسوس کریں۔ وہ اپنے آپ کو حوالۂ دار و رسن کر دیں۔ لیکن اُسے خراش تک نہ آنے دیں۔ لہٰذا اسے تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا کہ حواری حضرت عیسیٰؑ کو اس طرح چھوڑ کر بھاگ جاتے اصل صورتِ حال یونہی دکھائی دیتی ہے کہ حواریوں کو معلوم تھا کہ حضرت عیسیٰؑ تشریف لیجا چکے ہیں اور جس شخص کو گرفتار کیا جا رہا ہے کوئی اور ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فدائیوں کی اس جماعت نے باہمی مشورہ سے، خود اپنے میں سے ایک سچے جانباز کو تیار کر رکھا ہو کہ وہ حضرت مسیحؑ کا بھیس بدل کر اپنے آپ کو یہودا کی سُراغ دہی کے بعد (جو خود اس تدبیر کا ایک جُزو ہو سکتی ہے) گرفتار کرا دے تاکہ دشمن حضرت مسیحؑ کی تلاش میں سعی و کاوش نہ کریں۔ اس کے بعد اُنھوں نے کوشش کی ہوگی کہ عام قاعدہ کے مطابق (جیسا کہ اناجیل میں مذکور ہے) اس کی ہڈیاں صلیب پر نہ توڑی جائیں اس لئے کہ اناجیل کی تفاصیل سے

بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس مصلوب نے صلیب پر جان نہیں دی نہ اس کی ہڈیاں توڑی گئیں۔ نہ دوسرے مصلوب مجرموں کے ساتھ اسے دفن کیا گیا۔ اُسے جمعہ کی دوپہر (۳ اپریل ۳۳ئ) کو صلیب پر لٹکایا گیا۔ صلیب پھانسی کی طرح ایک جھٹکے میں جان نہیں لے لیتی تھی بلکہ اس کی صعوبت اور تکلیف سے کئی روز کے بعد موت واقع ہوتی تھی[1]۔ جمعہ کی سہ پہر کے بعد دو تین گھنٹہ کا وقفہ گزرا تھا کہ سبت (ہفتہ) کی شام شروع ہو گئی۔ ایک تو یہودی شریعت کے مطابق سبت تعطیل کا دن تھا۔ دوسرے وہ (۳ اپریل والا) سبت، ان کے ایک عظیم الشان سالانہ تیوہار کا دن تھا (رینان صہ ۲۹۲) اس لئے شام سے پہلے ہی اس مصلوب کو (بغیر ہڈیاں توڑے) صلیب سے اتار کر یوسف نامی ایک دولتمند شخص کے سپرد کر دیا گیا (جو یا تو حضرت مسیحؑ کا متبع تھا یا آپؑ کے مشن سے ہمدردی رکھتا تھا) حواریوں نے خفیہ خفیہ، یوسف کے باغ میں اس کا علاج کیا اور تیسرے دن (اتوار کے روز) اسے ساتھ لے کر چل دیئے۔

یہ کوائف شاہد ہیں کہ نہ حضرت مسیحؑ گرفتار ہوئے اور نہ آپ کو صلیب دی گئی۔ اب ظاہر ہے کہ اناجیل کے بیانات کہ جسے صلیب دی گئی (اور جسے عیسائی اب تک حضرت مسیحؑ ہی خیال کرتے چلے آرہے ہیں) بُری طرح صلیب پر چیخا اور چلایا اور اس نے کہا کہ ایلی ایلی لما سبقتنی (متی ۲۷/۴۶) "اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" کیا معنی رکھتے ہیں؟ یہ کچھ کہنے والا کبھی مسیح نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ خدا کے ایک برگزیدہ رسول سے یہ ناممکن ہے کہ وہ اس قسم کی مصیبت اور آزمائش میں ایسا پست ہمت اور بودا ثابت ہو اور اس قسم کے کلمات زبان پر لے آئے جنھیں عام عزم وہمت اور حوصلہ و استقلال کے انسان کی غیرت بھی گوارا نہ کرے۔ ان لوگوں نے سمجھا ہی نہیں کہ خدا کے رسول، شرفِ انسانیت اور استحکام خودی کی کن بلندیوں پر جلوہ بار ہوتے ہیں۔ وہ بھلا موت سے کیا ڈریں گے جبکہ موت اُن کے نزدیک ایک ابدی زندگی کا دروازہ ہو! اس لئے یہ کچھ کہنے والا مسیح نہیں تھا۔ ولکن شبہ لہم۔ لوگوں پر حقیقت حال مشتبہ ہو گئی تھی۔

※ ※ ※

---

[1] صلیب کیا تھی؟ اس قسم (✝) کی لکڑی زمین میں گاڑ کر متوازی لکڑی کے ساتھ مجرم کے بازو پھیلا دیئے جاتے تھے اور اس کے ہاتھوں میں میخیں ٹھونک کر اُسے اس لکڑی سے لٹکا دیا جاتا تھا وہ اس تکلیف سے قریب قریب بیہوش ہو جاتا اور اس کے بعد بھوک، پیاس، گرمی وغیرہ کی شدت اور کوفت سے سسک سسک اور گھل گھل کر جان دے دیتا تھا۔ صلیب سے اتارتے وقت عام طور پر اس کی ٹانگوں کی ہڈیاں توڑ دیتے تھے۔

ہجرت بہرحال، حضرت مسیحؑ نے ان حالات میں فلسطین سے ہجرت کرلی (جس طرح رات کی تاریکی اور خاموشی میں حضور نبی اکرمؐ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی) اور کسی دوسری طرف تشریف لے گئے۔ یہ اسی قسم کی ہجرت تھی جسے ہم، اتمامِ حجت کے بعد، انبیائے سابقہ کے احوال و کوائف میں دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ حضرت ہودؑ۔ حضرت صالحؑ۔ حضرت لوطؑ۔ حضرت ابراہیمؑ۔ وغیرہم (علیہم السلام) نے اسی طرح ہجرت کی تھی۔ ان میں سے بعض انبیائے عظام کے بعد از ہجرت واقعاتِ زندگی کے متعلق قرآن کریم نے ذکر کیا ہے۔ لیکن اکثر وہ ہیں (حضرت ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ، علیہم السلام) جن کی بعد از ہجرت زندگی کے متعلق قرآن نے کچھ نہیں کہا۔ اس لئے کہ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، قرآن کریم تاریخ کی کتاب نہیں کہ وہ کسی رسول (یا قوم) کی پیدائش سے وفات (یا ابتدا سے انتہا) تک کے تمام واقعات بیان کرے۔ وہ ان واقعات میں سے صرف اتنے حصّہ پر اکتفا کرتا ہے جسے وہ مقصد پیش نظر کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی بعد از ہجرت زندگی کے متعلق بھی قرآن نے کچھ نہیں بتایا۔

⁂

وفات تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ قرآنِ کریم نے کس طرح یہودیوں اور عیسائیوں کے اس خیال اور باطل عقیدہ کی تردید کردی ہے، کہ حضرت مسیحؑ کو صلیب دیا گیا تھا۔ باقی رہا عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ آپ زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے تھے، تو قرآن سے اس کی بھی تائید نہیں ہوتی۔ بلکہ اس میں ایسے شواہد موجود ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے دوسرے رسولوں کی طرح اپنی مدّتِ عمر پوری کرنے کے بعد، وفات پائی۔ سورۂ آلِ عمران کی جو آیت اوپر درج کی جا چکی ہے اس میں وفات کا ذکر صاف طور پر موجود ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَىَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ (۳/۵۵)

"اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ اللہ نے فرمایا تھا "اے عیسیٰ! میں تیرا وقت پورا کروں گا (وفات دوں گا) اور تجھے (یعنی تیرے درجات کو) اپنی طرف بلند کروں گا، تیرے منکروں (کی تہمتوں) سے پاک کردوں گا اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی ہے، انھیں قیامت تک تیرے منکروں پر برتری دوں گا۔ اور بالآخر تم سب کو میری ہی طرف لوٹنا ہے۔ سو اس وقت میں ان باتوں کا فیصلہ کردوں گا

جن میں تم ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہے ہو۔"

اس کے علاوہ سورۂ مائدہ میں ہے

وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَ لَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ۝ (۵/۱۱۶)

اور یاد کرو جب ایسا ہوگا کہ اللہ کہے گا "اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا تو نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو الٰہ بنالو؟ عیسیٰ جواب میں کہے گا "تیرے لئے تقدیس ہو! بھلا مجھ سے یہ بات کیسے ہوسکتی ہے کہ ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے حق نہیں۔ اگر میں نے کہا ہوگا تو ضرور تجھے معلوم ہوگا، تو میرے دل کی بات جانتا ہے لیکن مجھے تیرے ضمیر کا علم نہیں۔ تو ہی ہے کہ غیب کی ساری باتیں جاننے والا ہے۔"

اس کے بعد ہے۔

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَ كُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ ؕ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ۝ (۵/۱۱۷)

"میں نے تو اُن سے کچھ نہیں کہا مگر صرف وہی جس کے کہنے کا حکم تو نے دیا تھا۔ یعنی اللہ کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو جو میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے۔ جب تک میں ان میں تھا اُن کا نگران حال تھا۔ جب تو نے میرا وقت پورا کر دیا (وفات دیدی) تو پھر تو ہی اُن کا نگہبان تھا، اور تو ہر چیز کو دیکھنے والا اور اس کی نگہبانی کرنے والا ہے۔"

علاوہ ازیں قرآن کریم کے اکثر مقامات سے یہ واضح ہے کہ حضرات انبیائے کرام میں سے کسی کو خلود اور زندگیٔ دوام حاصل نہیں ہوئی تھی۔ سورۂ انبیاء میں ہے۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْۤ اِلَیْهِمْ فَسْــٴَـلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَ مَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا یَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ مَا كَانُوْا خٰلِدِیْنَ ۝ (۲۱/۷-۸)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، مگر اسی طرح کہ آدمی تھے۔

اُن پر ہماری وحی اُترتی تھی۔ پھر اے گروہ منکرین! اگر تمھیں یہ بات معلوم نہیں تو اُن لوگوں سے پوچھ کر معلوم کر لو۔ جو اہلِ کتاب ہیں! اور ہم نے ان پیغمبروں کو کبھی ایسے جسم کا نہیں بنایا کہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ یہی وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے تھے۔

اسی سورہ میں ذرا آگے چل کر ارشاد ہوا۔

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۚ اَفَائِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۝ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۚ وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً ۚ وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝ (۲۱/۳۴—۳۵)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے کسی کو ہمیشگی نہیں دی (اور نہ تیرے لئے ہمیشہ زندہ رہنا ہے)، پھر اگر تجھے مرنا ہے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ زندہ رہنے والے ہیں؟ ہر جان کے لئے موت کا مزہ چکھنا ہے اور ہم تمھیں (زندگی کی) اچھی بری حالتوں سے نمود ذات کے مواقع بہم پہنچاتے ہیں۔ اور پھر (بالآخر) تم سب کو ہماری طرف لوٹنا ہے!

اسی حقیقت کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۚ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ۚ وَ سَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ (۳/۱۴۴)

اور محمد اس کے سوا کیا ہیں کہ اللہ کے رسول ہیں۔ اور ان سے پہلے بھی اللہ کے رسول گزر چکے ہیں (جو اپنے اپنے وقتوں میں ظاہر ہوئے اور راہِ حق کی دعوت دے کر دنیا سے چلے گئے) پھر اگر ایسا ہو کہ وہ وفات پائیں (اور بہرحال اُنھیں ایک دن وفات پانا ہے) یا (فرض کرو) ایسا ہو کہ قتل ہو جائیں، تو کیا تم اُلٹے پاؤں راہِ حق سے پھر جاؤ گے (اور اُن کے مرنے کے ساتھ ہی تمہاری حق پرستی بھی ختم ہو جائے گی؟) اور جو کوئی راہِ حق سے اُلٹے پاؤں پھر جائے گا، تو وہ (اپنا ہی نقصان کرے گا) خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور جو لوگ شکر گزار ہیں (یعنی نعمتِ حق کی قدر دانی کرنے والے ہیں)، تو قریب ہے کہ خدا اُنھیں ان کا اجر عطا فرمائے!

اسی قسم کا فقرہ حضرت مسیح کے متعلق بھی ارشاد ہوا ہے۔

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۚ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۚ اُنْظُرْ كَيْفَ

نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ○ (۵/۷۵)

مریم کا بیٹا مسیح اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کا ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے بھی کتنے رسول (اپنے وقتوں میں) گذر چکے۔ اور اُس کی ماں (بھی اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ) صدیقہ تھی (یعنی بڑی ہی راستباز تھی) یہ دونوں (تمام انسانوں کی طرح) کھاتے پیتے تھے (یعنی غذا کی احتیاج رکھتے تھے اور ظاہر ہے کہ جسے زندہ رہنے کے لئے غذا کی احتیاج ہو، اُس میں ماوراء بشریت کوئی بات کیونکر ہو سکتی ہے) دیکھو! کس طرح ہم ان لوگوں کے لئے دلیلیں واضح کرتے ہیں، اور پھر دیکھو، کس طرح کو یہ لوگ پھرے ہوئے جا رہے ہیں؛ (کہ اتنی موٹی سی بات بھی سمجھ نہیں سکتے؟)

جو شخص ان تصریحات پر خالی الذہن ہو کر غور کرے گا وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ نزولِ قرآن کے وقت حضرت عیسیٰؑ کے زندہ ہونے کی تائید قرآن کریم کی آیات سے نہیں ملتی، بلکہ اس کے برعکس، آپ کے

وفات کے معنی

"گذر جانے" اور وفات پا جانے کی شہادت قرآن میں موجود ہے۔ وفات کے معنی ہیں اس طرح پورا ہو جانا (یا پورا کر دیا جانا) کہ اس میں سے کچھ بقایا نہ رہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (۳/۲۵)

لیکن اُس وقت اُن کا حال کیا ہوگا جب قیامت کے دن، جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، ہم انہیں اپنے حضور جمع کریں گے، اور ہر جان نے (اپنے عمل سے) جیسا کچھ کمایا ہے، اُسی کے مطابق اُسے پورا پورا بدلا ملے گا، اور کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہوگی؛

اسی کو سورۂ زمر میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ○ (۳۹/۷۰)

اور ہر جان نے (اس دنیا میں) جو کچھ کیا ہے اس کے مطابق اُسے پورا پورا بدلا ملے گا اور خدا خوب طرح جانتا ہے جو کچھ لوگ کرتے رہتے ہیں۔

سورۂ نحل میں ہے۔

يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (۱۶/۱۱۱)

وہ (قیامت کا) آنے والا دن، جب ہر جان صرف اپنے ہی لئے سوال و جواب کرتی ہوئی آئے گی۔

(یعنی کسی کو کسی کی فکر نہ ہوگی) اور جس دن ہر جان کو اس کے عمل کا پورا پورا نتیجہ مل جائے گا کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہوگی!

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ تَوَفّٰی کے معنی ہیں "پورا کر دینا" (کچھ بھی باقی نہ رکھنا) لہٰذا وفات کے معنی ہوں گے: کسی وقت کا پورا ہو جانا۔ یعنی دنیا میں قیام کی مدت کا پورا ہو جانا۔ قرآن کریم میں وفات کا لفظ ان معنوں میں متعدد مقامات پر مستعمل ہوا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں مومنین کی ایک دعا مذکور ہے کہ

رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝ (۳/۱۹۳)

پس خدایا ہمیں سامانِ حفاظت عطا فرما دے۔ ہماری برائیاں مٹا دے، اور اپنے فضل و کرم سے ایسا کر کہ ہماری موت نیک کرداروں کے ساتھ ہو۔

یہاں توفنا کے معنی ظاہر ہیں۔ اسی طرح سورۂ اعراف میں ہے۔

• رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ۝ (۷/۱۲۶)

پروردگار! ہمیں صبر و شکیبائی سے معمور کر دے۔ (تاکہ زندگی کی کوئی اذیت ہمیں اس راہ میں ڈگمگانے نہ دے) اور ہمیں دنیا سے اس حالت میں اٹھا کہ تیرے فرماں بردار ہوں!

حضرت یوسفؑ کی یہ دعا کہ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ (۱۲/۱۰۱) بھی اسی مفہوم کو لئے ہوئے ہے۔ سورۂ محمدؐ میں اس لفظ کے معنی اور بھی واضح ہو گئے ہیں۔

فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ (۴۷/۲۷)

تو (غور تو کرو، ان کا) کیسا حال ہوگا جب فرشتے انہیں وفات دیں گے اُن کے مونہوں اور ان کی پیٹھوں کو مارتے ہوں گے۔

ان کے علاوہ کئی ایک اور مقامات بھی ہیں جن میں یتوفیٰ کے معنی مار دینے کے ہیں۔ مثلاً (۲/۲۴۴) (۲/۲۴۰، ۴/۱۵، ۱۶/۷۰، ۲۲/۵، ۳۲/۱۱) بغرض اختصار ان آیات کو درج نہیں کیا جاتا۔ قرآن کریم میں خود دیکھ لیجئے۔ ان کے معانی میں کسی قسم کا اشکال نہیں۔ بلکہ ان مندرجہ صدر آیات سے بھی زیادہ واضح طور پر معانی سامنے آجاتے ہیں۔

اب ان مقامات کو پھر سے سامنے لائیے جن میں حضرت عیسیٰؑ کی وفات کا ذکر ہے۔ یعنی سورہ آل عمران کی آیت۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَىَّ وَ

مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ○ (۳/۵۵)

اور (پھر) جب ایسا ہوا تھا کہ اللہ نے فرمایا تھا — اے عیسیٰ! میں تیرا وقت پورا کروں گا، تجھے اپنی طرف اٹھالوں گا، تیرے منکروں کی (تہمتوں سے) تجھے پاک کر دوں گا، اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی ہے، انھیں قیامت تک تیرے منکروں پر برتری دوں گا - اور بالآخر تم سب کو میری ہی طرف لوٹنا ہے۔ سو اس وقت ان باتوں کا فیصلہ کر دوں گا جن میں تم ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہے ہو!

اور سورۂ مائدہ کی یہ آیت۔

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَا اَمَرْتَنِيْ بِهٖ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ○ (۵/۱۱۷)

میں نے تو ان سے کچھ نہیں کہا مگر صرف وہی جس کے کہنے کا تو نے حکم دیا تھا۔ یعنی اللہ کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو۔ میرا اور تمہارا، سب کا پروردگار وہی ہے۔ جب تک میں ان میں

۱؎ فرمایا کہ میں ان پر گواہ تھا جب تک میں ان میں رہا۔ مَا دُمْتُ فِيْهِمْ۔ سورۂ مریم میں ہے کہ حضرت عیسیٰ نے ارباب قوم کے استفسار کے جواب میں فرمایا وَ اَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ○ (۱۹/۳۱) کہ اللہ نے مجھے صلوٰۃ و زکوٰۃ کا حکم دے رکھا ہے، جب تک میں زندہ ہوں۔ آیت کے آخری الفاظ (مَا دُمْتُ حَيًّا) اپنی تفسیر آپ کر رہے ہیں۔

اسی سورہ میں حضرت یحییٰ کے متعلق ارشاد ہے۔

وَ سَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَ يَوْمَ يَمُوْتُ وَ يَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ○ (۱۹/۱۵)

اور اس پر سلامتی ہے (اس کی) پیدائش کے دن (سے) موت کے دن (تک) اور (جس) دن وہ زندہ اٹھایا جائے گا۔

یہی الفاظ (تھوڑا اور آگے چل کر) حضرت عیسیٰ کے متعلق آتے ہیں

وَ سَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَ يَوْمَ يَمُوْتُ وَ يَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ○ (۱۹/۱۵)

اور اس پر سلامتی ہے (اس کی) پیدائش کے دن (سے) موت کے دن (تک) اور (جس) دن وہ زندہ اٹھایا جائے گا۔

تھا اُن کا نگران حال تھا۔ جب تو نے میرا وقت پورا کر دیا۔ (وفات دیدی) تو پھر تو ہی اُن کا نگہبان تھا اور تو ہر چیز کو دیکھنے والا اور اُس کی نگہبانی کرنے والا ہے۔

جو تصریحات (توفّی کے متعلق) گزر چکی ہیں ان کی روشنی میں آیات بالا کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم میں دو ایک مقامات ایسے بھی ہیں جہاں توفّی کے معنی موت دینے کے نہیں ہیں۔ مثلاً سورۂ انعام میں ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَ یَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۶/۶۰)

اور دیکھو! وہی ہے، جو رات کے وقت تم پر موت طاری کر دیتا ہے (یعنی سُلا دیتا ہے) اور جو کچھ تم نے دن (کی حرکت و ہوشیاری) میں کد و کاوش کی تھی، اس سے بے خبر نہیں ہے پھر (جب رات بھر سو لیتے ہو، تو) دن کے وقت تمہیں اُٹھا کھڑا کرتا ہے تاکہ (بدستور کد و کاوش میں لگ جاؤ، اور زندگی کی) مقررہ میعاد پوری ہو جائے۔ پھر (اس میعاد کے بعد) تم سب خدا کی طرف لوٹائے جاؤ گے، اور جیسے کچھ تمہارے عمل رہے ہیں اس کی حقیقت وہ تمہیں بتا دیگا!

اس کی تفسیر سورۂ زمر میں ان الفاظ میں آئی ہے۔

اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا ۚ فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰى عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَ یُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۳۹/۴۲)

اور دیکھو، اللہ نفوس کو (دو طرح پر) وفات دیتا ہے (ایک تو) ان کی موت کے وقت، اور (دوسرے) جو مرے نہیں، اُن کی نیند میں۔ پھر انھیں روک رکھتا ہے جن پر موت کا حکم کیا ہوتا ہے۔ اور دوسروں کو ایک مقررہ وقت تک کے لئے بھیج دیتا ہے، یقیناً اس میں اس قوم کے لئے بڑی ہی نشانی ہے جو غور و فکر کی عادی ہو۔

ظاہر ہے کہ ان مقامات میں نفس کے معنی جان کے نہیں بلکہ نفس شعوریہ (Conscious Mind) کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ بحالتِ نیند اور بحالتِ موت نفسِ شعوریہ (احساس و ادراک) کی قوتوں کو معطل کر دیتا ہے۔ نیند کی صورت میں تو اس کھوئے ہوئے شعور و ادراک کو واپس لوٹا دیا جاتا ہے، لیکن موت کی

صورت میں واپس نہیں لوٹایا جاتا (جب تک پھر دوسری زندگی عطا نہ ہو) اس لئے کہ حالتِ نیند میں انسان میں سوائے شعور و ادراک کے اور سب کچھ موجود ہوتا ہے۔ ان معانی کے پیشِ نظر، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق سورۂ آلِ عمران اور سورۂ مائدہ کی مندرجہ صدر آیات میں توفّی کے معنی موت نہیں بلکہ نیند کی سی بے ہوشی کے ہیں۔ اور اس سے یہ مراد لی جاسکتی ہے کہ آپ کو صلیب دی گئی لیکن آپ صلیب پر بے ہوش ہو گئے۔ مرے نہیں۔ اور لوگوں کو شبہ ہو گیا کہ آپ مر چکے ہیں (یعنی وہی خیال جس کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے) لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے، دیگر قرائن کے پیشِ نظر یہ صحیح نہیں۔ قرآن کریم آپ کے صلیب دیئے جانے کی بصراحت تردید کرتا ہے (وما صلبوہ)۔ پھر سورۂ مائدہ کی مندرجہ صدر آیت میں واضح الفاظ میں ہے کہ "جب تک میں ان میں رہا ان کی حالت پر گواہ تھا۔ اس کے بعد جب تو نے وفات دیدی تو پھر تو ہی ان کا نگہبان تھا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ یہاں وفات سے مراد نیند کی سی بے ہوشی نہیں بلکہ موت کی بے خبری ہے۔ ورنہ اگر نیند کی سی بے ہوشی ہوتی تو ہوش میں آجانے کے بعد پھر وہی پہلی کی سی باخبری کی حالت پیدا ہو جاتی۔ اس سے واضح ہے کہ یہ وفات موت کی حالت تھی۔ یعنی وہی حالت جس کے متعلق سورۂ صٓف میں آپ کی زبانِ اقدس سے آیا ہے کہ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ (میں بشارت دیتا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اور جس کا اسمِ گرامی احمد ہوگا) "میرے بعد" کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ اب اسے سورۂ مائدہ کی مندرجہ صدر آیت کے ساتھ ملا کر دیکھئے۔ آپ نے فرمایا کہ "جب تک میں ان میں رہا ان کی حالت سے باخبر رہا۔ پھر جب تو نے مجھے وفات دیدی تو پھر تو ہی ان کا نگہبان تھا" بات صاف ہے۔ کہ اس وفات کے بعد آپ دُنیا سے تشریف لے گئے (یعنی وفات پا گئے) اور پھر آپ کے بعد وہ رسولِ اکرم تشریف لائے جن کی بشارت آپ نے دی تھی۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے اب تک زندہ ہونے کی تائید قرآن کریم سے نہیں ملتی۔ قرآن کریم آپ کے وفات پاجانے کا بصراحت ذکر کرتا ہے۔

رفع الی السّماء اب دیکھئے ترفع (آسمان پر چڑھ جانے) کا مفہوم۔ اس کے لئے ایک تو سورۂ آلِ عمران کی اسی آیت کو سامنے رکھئے جسے اوپر درج کیا جاچکا ہے اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ) اور دوسرے سورۂ نساء کی یہ آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ (۴/۱۵۸) حضرت عیسیٰؑ کے ترفع کا ذکر انہی دو آیات میں آیا ہے۔

رفع کے معنی ہیں اوپر اٹھانا۔ بلند کرنا۔ سورۂ رعد میں ہے اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (۱۳/۲) "اللہ وہ ہے جس نے بغیر ایسے ستونوں کے جنھیں تم دیکھ سکو آسمانی کروں کو بلند کیا" یا مثلاً وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ (۲/۶۳) "ہم نے تمہارے اوپر طور کو بلند کیا" حضرت یوسفؑ کے تذکار جلیلہ میں ہے۔ وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَی الْعَرْشِ (۱۲/۱۰۰) اس نے اپنے والدین کو تخت پر اونچا بٹھایا۔ پھر درجات کی بلندی کے لئے بھی یہی لفظ آیا ہے۔ مثلاً وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ (۶/۱۶۶) اللہ وہ ہے جس نے تمھیں زمین میں جانشین بنایا اور تم میں ایک کو دوسرے سے درجات میں بلند کیا" اور صدر نشین بزم کائنات (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے نام کی بلندی کے لئے بھی (وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ) (۹۴/۴) کے الفاظ آئے ہیں۔ ان آیات میں رفع کے ساتھ درجات یا ذکر کے الفاظ آئے ہیں۔ لیکن تنہا رفع کے معنی بھی بلندی درجات وعروج مراتب کے ہیں۔ سورۂ اعراف میں ہے وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا (۷/۱۷۶) "اور اگر ہم چاہتے تو ان (قوانین) کے ذریعے ہم اس (کے مقام) کو بلند کر دیتے" یہی وہ ارتفاع درجات و مراتب اور عروج مقامات ومناصب ہے جن کا ذکر حضرت ادریسؑ کے قصہ میں ان الفاظ میں آیا ہے۔ وَرَفَعْنٰهُ مَکَانًا عَلِیًّا (۱۹/۵۷) "اور ہم نے اسے ایک بلند مقام پر اٹھایا" حضرت ادریسؑ کو "بڑے اونچے مقام تک اٹھانے کا یہ مفہوم نہیں کہ انھیں بہ جسد عنصری اٹھا کر کسی اونچی جگہ پر بٹھا دیا گیا تھا۔ بلکہ (جیسا کہ عام محاورہ ہے) اس سے ان کے مقام ومدارج کی بلندی مفہوم ہے۔ اور جب اس بلندیٔ مقام کا ذکر اللہ کے عباد صالحین کے متعلق ہوگا تو اس سے مطلب "قرب الٰہی" ہوگا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ "قرب الٰہی" سے مفہوم یہ نہیں کہ انسان، جسمانی طور پر "اللہ کے قریب" جا بیٹھتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی مقصود بلندیٔ مدارج وعلو شرف انسانیت ہوتا ہے۔ یہی مطلب حضرت عیسیٰؑ کے تذکرہ میں رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ" (اللہ نے اسے اپنی طرف بلند کیا) اور رَافِعُکَ اِلَیَّ (میں تجھے اپنی طرف بلند کروں گا) سے ہے۔ یعنی قرب الٰہی۔ بلندیٔ مدارج ومراتب۔ مختلف انبیائے کرامؑ کے مختلف مقاماتِ مدارج ومناصب کا ذکر خود قرآن کریم میں موجود ہے۔ تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ (۲/۲۵۳) "ان رسولوں میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے"

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق رفعہ اللہ الیہ اور رافعک الی فرمایا گیا ہے، (یعنی اللہ نے اپنی طرف بلند کیا) اور اس سے اس امر پر دلیل لائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

آپ کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ لیکن اگر (الیہ اور الیٰ سے) یہ مفہوم لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر کسی خاص مقام میں متمکن ہے۔ اس مفہوم سے خود ذات باری تعالیٰ کے متعلق جو تصور قائم ہوتا ہے وہ محتاج تشریح نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جہات و اطراف کی نسبتوں سے بلند اور مکان و زمان کی اضافتوں سے منزہ ہے۔ وہ ہر مقام پر ہے اور اس کے لئے کسی خاص مقام اور گوشہ کی تعیین یکسر غلط اور اس کی ذات کے متعلق قرآنی تعلیم کے قطعاً خلاف ہے جسے ایک ثانیہ کے لئے بھی دل میں جگہ نہیں دی جا سکتی۔ اس لئے جہاں حضرت عیسیٰ کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ "رفعہ اللہ الیہ" تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص جہت یا مقام میں ہے اور حضرت عیسیٰؑ اس جہت یا مقام (آسمان) کی طرف اٹھائے گئے ہیں۔ الیہ (اللہ کی طرف) کا لفظ صرف حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہی استعمال نہیں ہوا بلکہ متعدد دیگر مقامات پر بھی آیا ہے جہاں سے یہ حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس سے "آسمان کی طرف اٹھا لینا" مراد نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (۲/۱۵۶) "ہم اللہ کے لئے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں" اس سے یہ مُراد نہیں کہ اللہ کسی خاص مقام پر ہے اور ہم اُس مقام کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔ اور آگے بڑھئے۔ تخلیق انسانی یا ارتقاء کے ضمن (ابلیس و آدم۔ عنوان "انسان") میں سورۂ سجدہ کی وہ عظیم المرتبت آیات درج کی جا چکی ہیں جو تدابیر الٰہیہ کی ابتداء سے انتہا تک کے تمام ارتقائی مراحل کے متعلق بصیرت افروز حقائق اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ کی عمودی آیت یہ ہے۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ○ (۳۲/۵)

وہ (اللہ) آسمان (کی بلندیوں) سے زمین (کی پستی) کی طرف ایک امر (اسکیم) کی تدبیر کرتا ہے جو (اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی) اس کی طرف بلند ہوتی ہے، ایسے مراحل سے جن کا عرصہ تمہارے حساب و شمار سے ہزار، ہزار برس کا ہو۔

"یعرج الیہ" وہی ہے جو رفعہ اللہ الیہ ہے۔ یہاں واضح ہے کہ یعرج الیہ (اس کی طرف بلند ہوتا ہے) سے یہ مفہوم نہیں کہ وہ امور کسی سمت کو (اوپر کی طرف) چڑھ جاتے ہیں بلکہ یہ کہ اپنی ابتدائی منازل سے رفتہ رفتہ بلند ہو کر پختگی تک جا پہنچتے ہیں۔ اسی حقیقت کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ۭ اِلَيْهِ

يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَكْرُ أُولَئِكَ هُوَ يَبُورُ (۳۵/۱۰)

(یاد رکھو جو عزت (حاصل کرنے) کا ارادہ رکھتا ہو تو عزت کا سرچشمہ تو سراسر اللہ ہی کے قبضۂ اقتدار میں ہے۔ اسی کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں۔ اور پاکیزہ کلمات کے ساتھ نیک اعمال انسان (کے مرتبہ) کو بلند کرتے ہیں۔ اور اس کے برعکس جو بری مخفی تدبیریں کرتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہوگا اور ان لوگوں کی مخفی تدبیریں سب بیکار ہی جایا کرتی ہیں۔ (کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتیں)

یعنی وہ اعمال جن سے انسان میں آگے بڑھنے (ارتقائی منازل طے کرنے) کی صلاحیت، پیدا ہوتی ہے بلند ہو کر اس کی طرف چڑھتے ہیں۔ یعنی وہ انھیں مقامات بلند عطا کرتا ہے۔ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں دیکھئے۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے بابل سے فلسطین کی طرف ہجرت کی ہے (جس کی تفصیل جوئے نور میں گذر چکی ہے) تو فرمایا اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ (۲۹/۲۶) میں اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں۔ سورۂ صٰفٰت میں ہے قَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَيَهْدِيْنِ (۳۷/۹۹) "کہا۔ میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں۔ وہ مجھے راستہ دکھائے گا"۔ ان مقامات میں اِلٰی رَبِّیْ کے ٹکڑے پر غور فرمائیے۔ مطلب بالکل واضح ہے۔ حضرت ابراہیم ہجرت کر کے آسمان کی طرف تشریف نہیں لے گئے تھے بلکہ اس طاغوتی ماحول کو چھوڑ کر ایسے مقام کی طرف منتقل ہو گئے تھے جہاں انھیں اپنے اللہ کی حفاظت میسر تھی جہاں وہ اس کا نام آزادی سے لے سکتے اور اس کے پیغام کی تکمیل کر سکتے تھے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ تَعْرُجُ اِلَيْهِ اور یصعد الیه۔ اور مهاجرٌ و ذاهب الی ربی میں اِلٰی سے مراد کسی خاص مقام کی سمت نہیں بلکہ تکمیلِ مدارج ہے۔ اسی طرح قصۂ حضرت عیسیٰؑ میں رفعہ اللہ الیہ میں الیہ سے مفہوم کوئی خاص سمت نہیں۔ بلکہ قربِ الٰہی ہے۔ اور یہ لفظ ایک خاص مقصد کے پیشِ نظر استعمال کیا گیا ہے۔ یہودیوں کا زعم باطل تھا کہ انھوں نے حضرت مسیحؑ کو صلیب پر لٹکا دیا تھا جس سے آپ (معاذ اللہ) لعنت کی موت مرے تھے۔ لعنت کے معنی ہیں دوری۔ (انعامات خداوندی سے دوری یا محرومی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ صلیب دیئے ہی نہیں گئے۔ (ما صلبوہ) بلکہ وہ اپنی طبعی موت سے وفات پا گئے (متوفیک) اور انھیں انعامات خداوندی سے دوری نہیں بلکہ قرب حاصل ہے۔ (بل رفعہ اللہ الیہ) اب سورۂ آل عمران کے ان الفاظ کو پھر سے سامنے لائیے۔

اِنِّیْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ (اے عیسیٰؑ میں تجھے وفات دینے والا اور بلند درجات عطا کرنے

والا ہوں) وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا یعنی تجھے ان کفار کے اتہامات سے پاک اور صاف کرنے والا ہوں۔

یہ تصور بعد کی پیداوار ہے

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کا تصور مذہب عیسائیت میں بعد کی اختراع ہے۔ یہودیوں نے مشہور کر دیا (اور بظاہر نظر بھی ایسا ہی آتا تھا) کہ انھوں نے حضرت مسیحؑ کو صلیب پر قتل کر دیا ہے۔ حواریوں کو معلوم تھا کہ حقیقت حال یہ نہیں۔ لیکن وہ بھی بہ تقاضائے مصلحت اس کی تردید نہیں کر سکتے تھے۔ (اور اصل تو یہ ہے کہ واقعہ تصلیب کے بعد خود حواریوں کے متعلق بھی بالتحقیق معلوم نہیں کہ وہ کہاں رہے اور کیا کرتے رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور ان کا نام پھر سننے میں آیا) اس دوران میں یہ خیال عام ہو چکا اور پختگی حاصل کر چکا تھا کہ حضرت مسیحؑ مصلوب ہو چکے ہیں۔ جب حواریوں کو قدرے سکون حاصل ہوا تو انھوں نے مختلف روایات کو یکجا کر کے اناجیل مرتب کیں (سب سے پہلی انجیل ۶۵ء میں مرتب ہوئی تھی) اس وقت یہ کہنا کہ جس شخص کو صلیب دی گئی تھی وہ حضرت مسیحؑ نہیں تھے کوئی اور تھا۔ ایک ایسا دعویٰ تھا جس کی ہر طرف سے تردید رہی نہیں بلکہ تضحیک) ہوتی۔ اس لئے اس عام خیال کی تردید کئے بغیر، حضرت مسیحؑ کی عظمت کو برقرار رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہو سکتا تھا کہ ان کے متعلق یہ مشہور کر دیا جائے کہ وہ صلیب کے تیسرے دن جی اٹھے اور پھر آسمان کی طرف اٹھا لئے گئے۔ اناجیل میں دیکھئے۔ متی اور یوحنا کی اناجیل میں آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے واقعہ کا کوئی ذکر نہیں۔ مرقس اور لوقا میں اخیر میں صرف ایک فقرہ میں اس کا ذکر آیا ہے: "یسوع ان سے کلام کرنے کے بعد آسمان پر اٹھایا گیا۔" حتیٰ کہ حضرت مسیحؑ کے دوبارہ جی اٹھنے کے متعلق بھی تمام اناجیل میں صرف مریم مگدلینی ہی عینی شاہد ہے (رینان صفحہ ۲۹۶) اور مریم مگدلینی وہی ہے جس میں سے اناجیل کے بیان کے مطابق، حضرت مسیحؑ نے سات بدروحوں کو نکالا تھا (متی ۱۶/۹)۔ عیسائیوں نے رفع الی السماء کا جو عقیدہ پھیلایا اس نے نہ صرف حضرت مسیحؑ کی عظمت اور بزرگی کو ہی مقام الوہیت تک پہنچا دیا۔ بلکہ شکستہ خاطر، افسردہ اور پژمردہ جماعت کے لئے مایوسیوں کی تاریکی میں امید کی ایک کرن بھی پیدا کر دی کہ وہ آنے والا آئے گا اور اس کے ساتھ ہی انھیں عظمت و اقتدار کی ایک نئی زندگی عطا کرے گا۔ (آنے والے" کے عقیدہ کے متعلق "ختم نبوت" کے عنوان کے تحت، معراج انسانیت میں تفصیل سے لکھا گیا ہے)

وہ آنے والا!

حالانکہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے آنے کے متعلق نہیں، بلکہ اس آنے والے کے متعلق کہا تھا جس کا اسم گرامی احمد تھا۔ گرفتاری سے تھوڑی دیر

پہلے (اناجیل کے بیان کے مطابق) حضرت مسیحؑ نے اپنے شاگردوں سے وعظ و نصیحت کے بعد فرمایا۔

> لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمھارے پاس نہ آئے گا، لیکن اگر جاؤں گا تو اُسے تمھارے پاس بھیجدوں گا۔ اور (وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصور وار ٹھہرائے گا۔ گناہ کے بارے میں اس لئے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے۔ عدالت کے بارے میں اس لئے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے۔ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں۔ مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا۔ لیکن جو کچھ سُنے گا وہی کہے گا۔ اور تمھیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا اس لئے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمھیں خبریں دے گا۔ (یوحنا ۱۶/۱۴)

اور اس سے ذرا پہلے۔

> لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کا روح جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے۔ تو وہ میری گواہی دے گا، اور تم بھی گواہ ہو۔ کیونکہ شروع ہی سے میرے ساتھ ہو۔ (یوحنا ۱۵/۲۶-۲۷)

حضرت مسیحؑ کی اس پیش گوئی کے متعلق دنیائے عیسائیت نے مختلف زمانوں میں جس قدر تحریف سے کام لیا ہے اُس کی تفصیل میں اُلجھے بغیر صرف اس ایک چیز سے اندازہ کر لیجیئے کہ اس وقت ہمارے سامنے ۴۳ء کا شائع کردہ (انگریزی) بائبل کا "مستند" نسخہ ہے جس میں اس آنے والے کے لئے (comforter) کا لفظ لکھا ہے۔ اور ۱۹۲۲ء کے اردو ترجمہ میں (جو خود برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی کا شائع کردہ ہے) اسے "مددگار" لکھا ہے۔ (comforter) اور "مددگار" میں جس قدر فرق ہے اس سے انگریزی زبان کا ایک مبتدی بھی واقف ہے۔ اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ اصل انجیل اور آج کے مروجہ نسخوں میں کس قدر اختلاف ہو چکا ہے۔ چنانچہ انجیل برنباس میں اس آنے والے کا نام تک بھی لکھا ہے اور ایک جگہ نہیں، کم از کم دس جگہ لکھا ہے[1]۔ آخری مرتبہ آپ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا۔

> پس جبکہ آدمیوں نے مجھ کو اللہ اور اللہ کا بیٹا کہا تھا۔ مگر یہ کہ میں خود دنیا میں بے گناہ تھا اس لئے اللہ نے ارادہ کیا کہ اس دنیا میں آدمی یہودا کی موت سے مجھ سے ٹھٹھا کریں۔ یہ خیال کر کے کہ وہ

---

[1] دیکھیئے برنباس صفحات ۲۲، ۶۶، ۶۹، ۱۱۰، ۱۲۴، ۱۴۶، ۱۴۷، ۲۴۳، ۲۹۴۔

میں ہی ہوں جو کہ صلیب پر مرا ہوں تاکہ قیامت کے دن میں شیطان مجھ سے ٹھٹا نہ کریں اور یہ بدنامی اس وقت تک باقی رہے گی جبکہ محمد رسول اللہ آئے گا جو کہ آتے ہی اس فریب کو ان لوگوں پر کھول دے گا جو کہ اللہ کی شریعت پر ایمان لائیں گے۔ (برنباس فصل ۲۲۲، صفحہ ۳۰۶)

فارقلیط حضرت عیسیٰؑ کی زبان ارامی تھی لیکن چونکہ ارامی زبان میں انجیل کا کوئی نسخہ دنیا میں موجود نہیں اس لئے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آپ نے اس آنے والے کے لئے کیا لفظ استعمال کیا تھا۔ یونانی ترجمہ میں فارقلیط کا لفظ آیا ہے۔ قرآن کریم میں اس پیش گوئی کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ○ (۶۱)

اور یاد کرو جب مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں جو تورات کی تصدیق کرنے کے لئے آیا ہوں جو میرے سامنے موجود ہے اور ایک رسول کی خوشخبری دینے کے آیا ہوں جس کا نام احمد ہوگا۔

مگر (دیکھو) جب وہ رسول (احمد) واضح دلائل و براہین کے ساتھ آگیا تو یہ لوگ کہنے لگے کہ وہ تو (اپنے دعوائے نبوت میں) صاف صاف جھوٹا ہے۔

یہ ہیں تفاصیل حضرت عیسیٰؑ کی حیات طیبہ کے آخری مراحل کے متعلق۔ وفاتِ حضرت مسیحؑ کے مسئلہ کو اتنی اہمیت کیوں حاصل ہے؛ اس کے متعلق ذرا آگے چل کر لکھا جائے گا۔

یہودیوں کی آخری تباہی

حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل کی طرف، قانون خداوندی کی آخری حجت کے اتمام کے لئے آئے قوم نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا اس کے بعد کونسی چیز باقی رہ گئی تھی جو قانونِ مکافات کی نتیجہ خیزی میں تاخیر کا موجب ہوتی؛ ان کی سرکشی اور معصیت کوشی، قہر الٰہی کے گرجتے ہوئے بادلوں اور کڑکتی ہوئی بجلیوں کی صورت میں ان کے سر پر آئی جس سے اب نجات کی کوئی راہ نہ تھی۔ باہمی خانہ جنگیوں سے ملک خونخوار درندوں کا بھٹ بن گیا۔ قتل و غارت گری، سلب و نہب، لوٹ مار۔ زندگی کا عام انداز ہوگیا۔ یہودیوں کو "ایک آنے والے" کا انتظار تو تھا ہی۔ ہر فریب کار نے اس عقیدہ سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور ان میں کتنے ہی

جھوٹے نبی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ملک کی بدامنی اس درجہ بڑھ گئی کہ اس شورش کو فرو کرنے کے لئے شاہنشاہ نیرو کو ایک خاص جرنیل (vespasian) متعین کرنا پڑا۔ اس سے بھی کام نہ چلا تو ایک دوسرے قہرمانی جرنیل (TITUS) کو بھیجا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں

سنہ۔ اب (مہینے) کی دسویں تاریخ کو، ایسے خوف و ہراس کے عالم میں، جس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ سقوطِ یروشلم عمل میں آیا۔ ہیکل کو جلا دیا گیا اور اس طرح یہودی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

اور یہ سب کچھ خدا کے مقرر کردہ قانونِ مجازات کے مطابق واقع ہوا جس کی خبر حضرت عیسیٰؑ نے پہلے ہی دے رکھی تھی۔

اور یسوع ہیکل سے نکل کر جا رہا تھا کہ اُس کے شاگرد اُس کے پاس آئے تاکہ اُسے ہیکل کی عمارتیں دکھائیں۔ اس نے جواب میں ان سے کہا۔ کیا تم ان سب چیزوں کو نہیں دیکھتے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہاں کسی پتھر پر پتھر باقی نہ رہے گا جو گرایا نہ جائے گا۔ (متی ۲۴ : ۱-۲)

اس طرح، ڈیڑھ ہزار برس کے گہوارۂ عروج و زوال کے بعد، بنی اسرائیل کا نام زندہ قوموں کی فہرست سے مٹ گیا اور خدا کا وہ جلیل القدر عہد جو اس نے اپنے مخلص بندے (حضرت ابراہیمؑ) کے ساتھ کیا تھا، اسرائیل کے گھرانے سے شاخِ اسمٰعیلؑ کی طرف منتقل ہو گیا وہ شاخ جسے حضور خاتم الانبیاءؑ کی شکل میں قیامت تک کے لئے سرسبز و شاداب رہنا تھا کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ۔ اس شجرِ مقدس کی طرح جس کی جڑیں پتال میں ہوں اور شاخیں جھوم جھوم کر آسمان کی پیشانی چوم رہی ہوں۔ اس آنے والے انقلاب کی خبر بھی حضرت عیسیٰؑ نے دیدی تھی۔ جب آپ نے اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں فرمایا تھا۔

شاخِ اسمٰعیلؑ

ایک اور تمثیل سنو۔ ایک گھر کا مالک تھا جس نے انگوری باغ لگایا۔ اور اُس کے چاروں طرف احاطہ گھیرا اور اس میں حوض کھودا اور بُرج بنایا۔ اور اُسے باغبانوں کو ٹھیکے پر دے کر پردیس چلا گیا۔ اور جب پھل کا موسم قریب آیا تو اس نے اپنے نوکروں کو باغبانوں کے پاس اپنا پھل لینے کو بھیجا۔ اور باغبانوں نے اُس کے نوکروں کو پکڑ کر کسی کو پیٹا اور کسی کو قتل کیا اور کسی کو سنگسار کیا، پھر اُس نے اور نوکروں کو بھیجا جو پہلوں سے زیادہ تھے اور اُنھوں نے ان کے ساتھ بھی اُسی طرح کیا۔ آخر اس نے اپنے بیٹے کو اُن کے پاس یہ کہہ کر بھیجا کہ وہ میرے بیٹے کا تو لحاظ کریں گے۔ جب باغبانوں نے بیٹے کو دیکھا تو آپس میں کہا کہ یہ وارث ہے۔ آؤ اسے قتل کرکے اس کی میراث پر قبضہ کرلیں

اور اُسے پکڑ کر باغ سے نکالا اور قتل کر دیا۔ پس جب باغ کا مالک آئے گا تو اُن باغبانوں کے ساتھ کیا کرے گا؟ اُنھوں نے اُس سے کہا اُن بُرے آدمیوں کو بری طرح ہلاک کرے گا اور باغ کا ٹھیکہ اور باغبانوں کو دے گا جو موسم پر اس کو پھل دیں۔ یسوع نے اُن سے کہا۔ کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی پڑھا کہ

جس پتھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے؟

اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لیلی جائے گی۔ اور اُس قوم کو جو اس کے پھل لائے دیدی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا اُس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے مگر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔

اور جب سردار کاہنوں اور فریسیوں نے اُس کی تمثیلیں سنیں تو سمجھ گئے کہ ہمارے حق میں کہتا ہے۔ (متی ۲۱: ۳۳-۴۵)

الساعت کی نشانی حضرت عیسیٰ تھے

اور یہ انقلاب بنی اسرائیل کے لئے حادثۂ قیامت سے کم نہ تھا کہ ایسی عظیم الشان قوم کا اس طرح مٹ جانا، قیامت نہیں تو اور کیا ہے! یہی وہ الساعۃ (موت کی گھڑی) تھی جس کے لئے حضرت عیسیٰ کو بطور نشانی بھیجا گیا تھا۔ وَ اِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَۃِ (۴۳: ۶۱) اور یہ گھڑی اس طرح سر پر آپہنچی کہ انھیں خبر تک بھی نہ ہوئی۔

وَ لَمَّا جَآءَ عِیْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُکُمْ بِالْحِکْمَۃِ وَلِاُبَیِّنَ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْہِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوْنِ ○ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ رَبِّیْ وَ رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ؕ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ○ فَاخْتَلَفَ

---

[1] اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم میں الساعۃ قیامت کے معنے آیا ہے لیکن اس کے معنی انقلاب بھی ہیں۔ اور جن اعمال کی سزا اس دنیا میں ملتی ہے ان کے ظہور نتائج کے لئے بھی الساعۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ الساعۃ جس کی نشانی حضرت عیسیٰ تھے، وہ انقلاب عظیم تھا جس نے دنیا بھر کی برکتیں بنی اسرائیل سے چھین کر امتِ مسلمہ کے حوالے کر دیں اور اس طرح یہ انقلاب نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں سے عمل میں آیا۔

الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ ۝ هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَن تَأْتِيَهُم بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ (۴۳ / ۶۳-۶۶)

اور (یاد کرو) جب واضح دلائل کے ساتھ عیسیٰ (بنی اسرائیل کے پاس) آیا اور اس نے کہا۔ میں تمہارے پاس حکمت و (موعظت کی باتیں) لایا ہوں۔ اور (اس لئے آیا ہوں کہ) تاکہ تمہارے لئے وہ بعض باتیں واضح کردوں جن میں تم اختلاف کرتے رہتے ہو۔ پس (تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اور میری (یعنی میرے لائے ہوئے احکام الٰہی کی) اطاعت کرو۔ بلاشبہ اللہ ہی میرا اور تمہارا رب کا پروردگار ہے۔ لہٰذا اُسی کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے " مگر اُن پر کوئی اثر نہیں ہوا) چنانچہ وہ جماعتیں آپس میں اختلاف کرنے لگیں۔ پس دردناک دن کے عذاب کی وجہ سے اُن لوگوں کے لئے بربادی ہے جنہوں نے (اپنی جانوں پر) ظلم کیا ہے۔ (معلوم ہوتا ہے کہ) وہ لوگ انتظار نہیں کر رہے ہیں مگر ساعت کا کہ وہ اُن کے پاس اس طرح یکبارگی آپہنچے کہ اُنھیں پتہ بھی نہ چلے۔

اُنھوں نے اللہ کی اس گراں بہا نعمت کو ٹھکرا دیا جو حضرت عیسیٰؑ کی وساطت سے اُنھیں ملنے والی تھی اور تھوڑے ہی عرصہ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ حضرت عیسیٰؑ کے وہی متبعین جو اس وقت کمزور و ناتوان نظر آتے تھے کس طرح اُن پر غالب آگئے۔ (پہلے عیسائی اور پھر حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کے صحیح متبع۔ جماعت مومنین)

وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۖ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝ فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ۝ (۳ / ۵۵-۵۶)

اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی ہے، اُنھیں قیامت تک تیرے منکروں پر برتری دوں گا اور بالآخر تم سب کو میری ہی طرف لوٹنا ہے۔ سو اُس دن اُن باتوں کا فیصلہ کردوں گا۔ جن میں تم ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہے ہو!

پھر جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، تو اُنھیں دنیا و آخرت، دونوں جگہ سخت عذاب دوں گا۔ اور (عذاب الٰہی سے بچانے میں) کوئی بھی اُن کا مددگار نہ ہوگا"

" عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا " کو سامنے رکھئے اور پھر اللہ کے قانونِ مکافاتِ عمل کی ہمہ گیری پر غور کیجئے کہ

یہ شوریدہ بخت قوم، کس ذلت و رسوائی اور محکومی و بے کسی کے عذاب میں مبتلا ہوئی۔

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

پیدائش حضرت عیسیٰؑ کے متعلق مزید تصریحات

حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے متعلق اناجیل کا بیان اور قرآن کریم کی متعلقہ آیات، شروع میں درج کی جا چکی ہیں۔ لیکن اس مسئلہ نے قلوب و اذہان میں جس قدر اہمیت اختیار کر رکھی ہے وہ مزید تفصیل بحث کی متقاضی ہے۔ عیسائیوں کے ہاں اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ ان کے مذہب کی تمام عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے۔ ابنیت و الوہیت مسیحؑ کے عقائد اسی بنا پر قائم ہیں کہ آپ کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی۔ لیکن خود ہمارے ہاں بھی اس کی اہمیت کچھ کم نہیں (اس کے وجوہات آگے چل کر ملیں گی) ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کریم کا اس باب میں کیا ارشاد ہے۔ قرآن نے جن مقامات پر ولادت حضرت عیسیٰؑ کا ذکر کیا ہے انہیں غور سے دیکھئے اور جس نتیجہ پر وہ مقامات پہنچا دیں انہیں صحیح سمجھئے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض مقامات کے یقینی مفہوم متعین کرنے میں ابھی زمانہ کی علمی سطح کے اور بلند ہونے کا انتظار کرنا پڑے تا آنکہ تاریخی انکشافات و اثری تحقیقات ان متشابہ آیات کو محکمات میں بدل دیں۔ قرآن نے خود اپنے متعلق کہا ہے کہ جوں جوں "آیات خداوندی" انفس و آفاق میں بے نقاب ہوتی جائیں گی قرآن کے دعاوی مثبت حقائق کی شکل میں سامنے آتے جائیں گے یعنی اس کے حقائق انسانی علم کی سطح کی بلندی کے ساتھ ساتھ کھلتے جائیں گے۔ لہٰذا ہم ان حقائق کو اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ باقی رہا یہ کہ ہم اپنے ذہن میں پہلے ایک عقیدہ قائم کر لیں اور پھر اس کے تائیدی شواہد تلاش کرنے کے لئے قرآن کریم کی ورق گردانی کریں تو یہ "تدبر فی القرآن" کا ایسا غلط طریقہ ہے جسے درحقیقت "تدبر فی القرآن" کہنا ہی غلط ہے۔ قرآن کریم کو اپنے خیالات و تصورات کے تابع لے آنا، بہت بڑی جسارت ہے۔ اس سے دلوں پر مہریں لگتیں اور آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ قرآن کریم کو خالی الذہن ہو کر سمجھنے کی کوشش کیجیے اس کے بعد اگر ایسی باتیں سامنے آئیں جو سردست آپ کی سمجھ میں نہیں آتیں تو قرآنی حقائق کو کھینچ تان کر اپنی عقل کے قالب میں ڈھالنے کی سعی ناکام نہ کیجئے بلکہ قرآنی حقائق کو اپنی جگہ محکم اور اٹل سمجھتے ہوئے انتظار کیجیے تا آنکہ مزید تحقیق و تدبر آپ کی عقل میں اتنی وسعت پیدا کر دے کہ اس میں قرآنی حقائق سما سکیں۔ اگر قرآن کریم کا یہ ارشاد ہو کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بغیر باپ کے ظہور میں آئی تھی تو بلا ادنیٰ تامل ہمارا اس پر ایمان ہے۔ ہم ہر لحہ بدلنے والی عقل کی خاطر، نہ بدلنے والے حقائق کو رکیک تاویلات سے موڑ توڑ نہیں سکتے۔ اور اگر قرآن کریم اس طرف لے جائے کہ آپ کی پیدائش عام اندازہ کے مطابق ہوئی تھی تو محض اس لئے کہ اس سے ایک

ایسے عقیدہ کی تردید ہوتی ہے جو ہم میں ایک عرصہ سے متوارث چلا آرہا ہے، بے معنی نکتہ آفرینیوں اور دورازکار موشگافیوں کی سعیِ لاحاصل بھی خود فریبی سے زیادہ نہیں۔ ہمارے تمام رجحانات و معتقدات قرآن کے تابع ہونے چاہئیں اور بس!

اناجیل کا بیان

قرآن کریم تک آنے سے پیشتر ہمیں ایک بار پھر اناجیل پر غور کر لینا چاہیئے۔ اناجیل جیسی کچھ بھی آج ہیں، بہر حال انہی کے بیانات کو سامنے رکھا جائے گا اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے، حضرت عیسیٰ کی مافوق الفطرت پیدائش کا ذکر متی اور لوقا کی اناجیل میں ہے۔ مرقس اور یوحنا کی اناجیل میں اس کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ حالانکہ مرقس (تاریخی تحقیق کی رُو سے) اناجیل اربعہ میں سب سے پہلی اور باقی اناجیل کی ماخذ ہے۔ اور یوحنا حواری، عیسائیوں کے نزدیک بہت برگزیدہ اور حضرت مسیحؑ کے خاص معتمد علیہ تھے۔

ہر چند متی اور لوقا کے متعلقہ اقتباسات پہلے بھی گذر چکے ہیں لیکن موضوع کو بیک وقت سامنے لانے کے لئے ان اقتباسات کا دوبارہ نقل کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ انجیل متی میں ہے۔

اب یسوع مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب اس کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہو گئی تو ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ پائی گئی۔ پس اس کے شوہر یوسف نے جو راستباز تھا اور اسے بدنام کرنا نہیں چاہتا تھا چپکے سے اس کے چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔ وہ ان باتوں کو سوچ ہی رہا تھا کہ خداوند کے فرشتے نے اُسے خواب میں دکھائی دے کر کہا۔ اے یوسف ابن داؤد۔ اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر۔ کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے۔ وہ بیٹا جنے گی اور تو اس کا نام یسوع رکھنا کیونکہ وہی اپنے لوگوں کو ان گناہوں سے نجات دے گا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ جو خداوند نے نبی کی معرفت کہا تھا وہ پورا ہو کہ

دیکھو ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی اور اُس کا نام عمانوایل رکھیں گے۔

(متی ۱ ۔ ۱۸ ۔ ۲۳)

اس سے ظاہر ہے کہ (متی کے بیان کے مطابق) حضرت مسیحؑ کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی تھی اور اُس پیش گوئی کے مطابق جو اس سے پیشتر کی گئی تھی یہ پیش گوئی تورات میں یوں مذکور ہے۔

تب نبی نے کہا۔ اے داؤد کے خاندان اب سنو۔ انسان کو تھکانا تمہارے آگے نہایت چھوٹی بات تھی۔

سو کیا تم میرے خدا کو بھی تھکاؤ گے؟ باوجود اس کے خداوند آپ تم کو ایک نشان دے گا۔ دیکھو کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی اور اس کا نام عمانوایل رکھے گی۔ وہ دہی اور شہد کھائے گا۔ جس وقت کہ وہ برا ترک کرنے کا اور بھلا پسند کرنے کا امتیاز پائے۔ پر اس سے آگے کہ یہ لڑکا بد ترک کرنے کا اور نیک پسند کرنے کا امتیاز پائے یہ سرزمین جسے تو برباد کرتا ہے اپنے دونوں بادشاہوں سے چھوڑ دی جائے گی۔ (یسعیاہ ۷-۱۳-۱۶)

اس پیش گوئی کے متعلق خود عیسائیوں میں عجیب وغریب اختلافات ہیں۔ ایک عیسائی محقق، (ڈاکٹر ڈیوڈسن) نے (کتاب یسعیاہ کی شرح میں) لکھا ہے کہ یسعیاہ نبی نے درحقیقت جو کچھ فرمایا تھا وہ اتنا ہی تھا کہ "ایک نوجوان لڑکی جو شادی کے قابل ہوگی بیٹا جنے گی۔ لیکن جب اس کتاب (یسعیاہ) کا یونانی میں ترجمہ ہوا تو اس کے بجائے "کنواری" کا لفظ لکھ دیا گیا۔ دوسرے محققین کا خیال ہے کہ اس پیش گوئی کا تعلق حضرت مسیحؑ سے ہے ہی نہیں۔ یسعیاہ نبی کا زمانہ حضرت مسیح سے قریب ۷۰۰ برس پیشتر کا ہے اور انھوں نے اس پیش گوئی میں اپنے زمانہ کے بادشاہ کو تسلی دی ہے۔ لہٰذا یہ واقعہ اسی زمانے میں ظہور پذیر ہو جانا چاہیے تھا۔

یہ تھا بہرحال انجیل متی کا بیان۔ اب انجیل لوقا کا بیان ملاحظہ فرمائیے۔

چھٹے مہینے جبرائیل فرشتہ خدا کی طرف سے گلیل کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرہ تھا ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا جس کی منگنی داؤد کے گھرانے کے ایک مرد یوسف نام سے ہوئی تھی اور اس کنواری کا نام مریم تھا۔ اور فرشتے نے اس کے پاس اندر آکر کہا۔ سلام تجھ کو جس پر فضل ہوا ہے۔ خداوند تیرے ساتھ ہے وہ اس کلام سے بہت گھبرا گئی اور سوچنے لگی کہ یہ کیسا سلام ہے۔ فرشتے نے اس سے کہا۔ اے مریم۔ خوف نہ کر۔ کیونکہ خدا کی طرف سے تجھ پر فضل ہوا ہے اور دیکھ تو حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی اُس کا نام یسوع رکھنا وہ بزرگ ہوگا۔ اور خدا تعالیٰ کا بیٹا کہلائے گا۔ اور خداوند خدا اس کے باپ داؤد کا تخت اُسے دے گا۔ اور وہ یعقوب کے گھرانے پر ابد تک بادشاہی کرے گا اور اُس کی بادشاہی کا آخر نہ ہوگا۔ مریم نے فرشتے سے کہا۔ یہ کیونکر ہوگا جس حال میں کہ میں مرد کو نہیں جانتی؟ اور فرشتے نے جواب میں اُس سے کہا کہ روح القدس تجھ پر نازل ہوگا اور خدا تعالیٰ کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالے گی۔ اور اس سبب سے وہ پاکیزہ جو پیدا ہونے والا ہے خدا کا بیٹا کہلائے گا۔

(لوقا ۱-۲۶-۳۵)

دیکھیے۔ خود متی اور لوقا کے بیانات میں بھی کس قدر اختلاف ہے۔

ابن یوسف

اب اس سے آگے بڑھئے۔ خود لوقا نے حضرت مسیحؑ کو یوسفؑ کا بیٹا لکھا ہے وہ اُسے دیکھ کر حیران ہوئے اور اس کی ماں نے اُس سے کہا۔ بیٹا۔ تو نے کیوں ہم سے ایسا کیا؟ دیکھ تیرا باپ اور میں کڑھتے ہوئے تجھے ڈھونڈتے تھے۔ (لوقا ۲/۴۸)

دوسری جگہ ہے

اور اس کا باپ اور اس کی ماں ان باتوں پر جو اس کے حق میں کہی جاتی تھیں تعجب کرتے تھے۔

(لوقا ۲/۳۳)

یوحنا کی انجیل میں بھی اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کو یوسف کا بیٹا کہا ہے۔

فلپس نے نتن ایل سے مل کر اس سے کہا کہ جس کا ذکر موسیٰؑ نے توریت میں اور نبیوں نے کیا ہے وہ ہم کو مل گیا۔ وہ یوسف کا بیٹا یسوع ناصری ہے۔ (یوحنا ۱/۴۵)

دوسری جگہ ہے

اور انھوں نے کہا۔ کیا یہ یوسف کا بیٹا یسوع نہیں ہے جس کے باپ اور ماں کو ہم جانتے ہیں۔ اب کیونکر کہتا ہے کہ میں آسمان سے اترا ہوں؟ (یوحنا ۶/۴۲)

متی کی انجیل میں ہے۔

جب یسوع یہ تمثیلیں ختم کر چکا تو ایسا ہوا کہ وہاں سے روانہ ہو گیا اور اپنے وطن میں آکر ان کے عبادت خانے میں انھیں ایسی تعلیم دینے لگا کہ وہ حیران ہو کر بولے کہ اس کو یہ حکمت اور معجزے کہاں سے مل گئے؟ کیا یہ بڑھئی کا بیٹا نہیں؟ اور اس کی ماں کا نام مریم اور اس کے بھائی یعقوب اور یوسف اور شمعون اور یہوداہ نہیں۔ (متی ۱۳/۵۳—۵۵)

پھر اناجیل میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ حضرت داؤدؑ کی نسل سے تھے اور لوقا اور متی میں حضرت مسیحؑ کا جو نسب نامہ دیا ہے (وہ اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف ہے) وہ یوسف نجار سے ہی حضرت داؤد تک پہنچتا ہے۔ متی کی انجیل (باب اول) میں یہ نسب نامہ حضرت ابراہیمؑ سے نیچے کی طرف آتا ہے۔ اور آخیر میں لکھا ہے "اور متان سے یعقوبؑ پیدا ہوا اور یعقوب سے یوسف پیدا ہوا جو اس مریم کا شوہر تھا جس سے یسوع پیدا ہوا جو مسیحؑ کہلاتا ہے۔" (متی ۱/۱۶) لوقا کی انجیل میں یہ نسب نامہ حضرت مسیحؑ سے اوپر کو آدم تک گیا ہے۔ اس طرح کہ "جب یسوع خود تعلیم دینے لگا تو برس تیس ایک کا تھا اور (جیسا کہ سمجھا جاتا تھا) یوسف کا بیٹا تھا۔ اور وہ عیلی کا اور وہ متات کا...... اور وہ شیث کا اور وہ آدم کا اور وہ خدا کا تھا۔" (لوقا ۳/۲۳—۳۸) غور فرمایا آپ نے حضرت مسیح کے متعلق اناجیل میں مذکور ہے کہ وہ حضرت داؤد

کی نسل سے تھا اور یہ سلسلہ یوسف نجار کی وساطت سے حضرت داؤدؑ تک پہنچتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان نسب ناموں کی رو سے بھی حضرت مسیحؑ، یوسف کے بیٹے ہی قرار پاتے ہیں۔ اور، جیسا کہ لوقا کی انجیل میں لکھا ہے، آپ کو ایسا ہی سمجھا جاتا تھا۔ ابن اللہ (یا بغیر باپ کے پیدائش) کا عقیدہ

عقیدہ ابنیت

بہت بعد کی پیداوار ہے۔ یعنی جب مسیحیت پر سینٹ پالؔ کے معتقدات کا رنگ غالب آگیا تو اس وقت ابنیت کا عقیدہ بھی مذہب عیسوی میں داخل ہوگیا۔ رومیوں کے نام سینٹ پال کے خط میں مذکور ہے۔

> مسیح جسم کے اعتبار سے تو داؤد کی نسل سے پیدا ہوا لیکن پاکیزگی روح کے اعتبار اور مُردوں میں سے جی اُٹھنے کے سبب قدرت کے ساتھ خدا کا بیٹا ٹھہرا (رومیوں کے نام ۱/۴)

یہاں سے عقیدۂ ابنیت کی پہلی اینٹ رکھی گئی۔ اور اگرچہ اس میں جسمانی اور روحانی کا فرق ملحوظ رکھا گیا لیکن جب ذرا آگے چل کر مذہب میں اور غلو ہوا تو یہ فرق بھی مٹ گیا۔ چنانچہ جب (۳۲۵ء میں) نیقیہ کی مشہور کونسل منعقد ہوئی ہے تو اس میں اس سوال نے بڑی اہمیت حاصل کر لی کہ اقانیم ثلاثہ (باپ، بیٹا۔ روح القدس) میں حضرت مسیح کا درجہ کیا ہے؟ بعض کی رائے تھی کہ بیٹا، باپ کے مقابلہ میں ازلی نہیں ہو سکتا لیکن کونسل نے اس عقیدہ کو کفر قرار دیا اور فیصلہ کر دیا کہ

> جو شخص یہ دعوےٰ کرے کہ کسی وقت میں خدا کے فرزند کا وجود نہ تھا یا پیدا ہونے سے قبل وہ موجود نہ تھا یا وہ نیست سے ہست کیا گیا یا کسی ایسے مادہ یا جوہر سے اس کی تخلیق ہوئی جو ربانی نہیں ہے یا وہ مخلوق یا متغیر ہے۔ ایسے شخص کو کلیسائے مقدس ملعون قرار دیتا ہے۔

اس فتوے کو قسطنطین نے بزور حکومت نافذ کر دیا (ملاحظہ ہو "معرکۂ مذہب و سائنس" از ڈریپر)۔ اب ظاہر ہے کہ اس قسم کے "خدا کے بیٹے" کو یوسف کا بیٹا کیسے سمجھا جا سکتا تھا۔ اس لئے لامحالہ یہ ماننا پڑا کہ حضرت مسیحؑ کی پیدائش بلا زمینی باپ کے ہوئی ہے۔ یہ ہیں مذہب عیسائیت میں "بن باپ" کے عقیدہ کے ارتقائی مراحل۔ چنانچہ شروع شروع میں خود عیسائیوں میں ایسے فرقے موجود تھے جو اس عقیدہ کے خلاف تھے۔ بالخصوص ابیانی فرقہ، جو سینٹ پال سے سخت نفرت کرتا تھا۔ یہ فرقہ چوتھی صدی عیسوی تک

ؔ سینٹ پال، روما کا ایک متشدد یہودی تھا جس نے حضرت عیسٰیؑ کے متبعین کی مخالفت اور تعذیب میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ ازاں بعد وہ خود عیسائی ہوگیا اور اس نے ایک ایسا مذہب ایجاد کیا جسے اصل عیسائیت سے دور کا بھی علاقہ نہ تھا۔ ابنیت، الوہیت، تثلیث۔ کفارہ وغیرہ کے عقائد اسی کے مفتریات سے ہیں۔

رینان کا بیان

موجود تھا لیکن جب مذکورہ صدر فتوی حکومت کے زور پر نافذ ہوا ہے تو یہ فرقہ یا تو رفتہ رفتہ دوسرے عیسائیوں میں جذب ہو گیا یا یہودیوں میں مدغم۔ اس باب میں رینان کی تحقیق بھی قابلِ غور ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

یہ چیز کہ مسیح کو اس بات کا خواب و خیال تک بھی نہ تھا کہ وہ خدا کے اوتار ہیں، ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ تصور، یہودی ذہنیت تک کے لئے بھی اجنبی تھا اور مختصر اناجیل میں اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ ہم اسے صرف یوحنا کی انجیل میں دیکھتے ہیں۔ لیکن یہ مسیح کے خیالات کی ترجمان نہیں کہلا سکتی .... (لیکن تماشا یہ کہ خود) انجیل یوحنا میں یہ چیز بھی موجود ہے کہ یہ بہتان کہ مسیح اپنے آپ کو خدا یا خدا کا ہمسر کہتا ہے، یہودیوں کا تراشیدہ ہے (دیکھئے یوحنا ۵/۱۸ و ۱۰/۳۳)۔ اسی انجیل میں مسیح اپنے آپ کو خدا سے کمتر بھی بتاتا ہے (یوحنا ۱۴/۲۸)....... وہ اپنے آپ کو عام آدمیوں سے بلند تر ضرور سمجھتا ہے لیکن اپنے آپ کو خدا سے ایک غیر محدود فاصلہ پر الگ قرار دیتا ہے۔ وہ "خدا کا بیٹا" ہے لیکن سب انسان "خدا کے بیٹے" ہیں۔ یا مختلف مدارج کے اعتبار سے "خدا کے بیٹے" بن سکتے ہیں (دیکھئے متی ۵/۹-۴۵ لوقا ۲/۳۸ و ۶/۳۵ و ۲۰/۳۶ یوحنا ۱/۱۲-۱۳ و ۱۰/۳۴-۳۵ - اعمال ۱۷/۲۸-۲۹) .... سامی زبان میں (اور تورات میں) لفظ "بیٹا" کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ (صفحہ ۱۸۱)

تورات میں بیٹے کا لفظ

تورات میں یہ لفظ عام آدمیوں کے لئے استعمال ہوا ہے سب سے پہلی کتاب پیدائش میں ہے۔

روئے زمین پر بہت آدمی ہونے لگے اور ان سے بیٹیاں پیدا ہونے لگیں تو خدا کے بیٹوں نے آدمیوں کی بیٹیوں کو دیکھا۔ (پیدائش ۶/۱-۲)

قُرب کے لئے بھی اس کا استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت یعقوبؑ کے متعلق حضرت موسیٰؑ کی زبان سے کہلایا گیا ہے۔

تب فرعون سے یوں کہیو کہ خداوند نے یوں فرمایا ہے کہ اسرائیل (یعقوب) میرا بیٹا بلکہ پہلوٹھا ہے۔ سو میں کہتا ہوں کہ میرے بیٹے (بنی اسرائیل) کو جانے دے تاکہ وہ میری عبادت کرے

(خروج ۴/۲۲-۲۳)

بنی اسرائیل کے متعلق دوسری جگہ ہے۔

بنی اسرائیل شمار میں دریا کی ریت کے ذروں کی مانند ہوں گے جو ماپے نہیں جاتے اور گنے نہیں جاتے

اور ایسا واقعہ ہوگا کہ اس جگہ جہاں انھیں کہا گیا ہے کہ تم میرے لوگ نہیں ہو اس کے عوض میں ان سے
کہا جائے گا کہ تم زندہ خدا کے زندہ فرزند ہو (ہوسیع نبی کی کتاب ۱/۱)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اگر حضرت مسیح کے زمانے میں آپ کے متعلق بیٹے کا لفظ استعمال بھی ہوا ہوگا تو اس کا کیا مفہوم ہوگا۔ لیکن بعد میں جب مذہب میں غلو و تشدد کا دور آیا تو اُسے کچھ سے کچھ معانی پہنا دیئے گئے اور پھر اناجیل میں بھی انہی معانی کے اعتبار سے تحریف کر دی گئی۔ چنانچہ خود اناجیل کا اختلاف و تضاد اس باب میں شاہد ہے۔ انجیل متی میں حضرت مسیحؑ اور پطرس کے ایک مکالمہ کے ضمن میں لکھا ہے۔

شمعون پطرس نے جواب میں کہا۔ تو زندہ خدا کا بیٹا مسیح ہے۔ یسوع نے جواب میں اس سے کہا کہ مبارک ہے تو شمعون بریوناہ۔ کیونکہ یہ بات گوشت اور خون نے نہیں بلکہ میرے باپ نے جو آسمان پر ہے تجھ پر ظاہر کی ہے اور میں بھی تجھ سے کہتا ہوں کہ تو پطرس ہے۔ اور میں اس پتھر پر اپنی کلیسا بناؤں گا۔ اور عالم ارواح کے دروازے اس پر غالب نہ آئیں گے۔ (متی ۱۶/۱۶-۱۸)

لیکن برنباس میں یہی مکالمہ ان الفاظ میں آیا ہے۔

یسوع نے جواب میں کہا "اور خود تمہارا میرے بارے میں کیا قول ہے؟" پطرس نے جواب دیا کہ "تو مسیح اللہ کا بیٹا ہے" تب اُس وقت یسوع برہم ہوا اور اُس کو غصہ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے جھڑکا "میرے پاس سے چلا جا۔ اس لئے کہ تو شیطان ہے اور مجھ سے بُرا سلوک کرنے کا قصد کرتا ہے"

(برنباس صفحہ ۱۰۲)

اور دوسری جگہ حضرت مسیح کا یہ قول بھی برنباس میں مذکور ہے۔

اور جبکہ یسوع نے یہ کہا اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے منہ پر مارا۔ پھر زمین پر سر دے مارا اور کہا "ہر وہ شخص ملعون ہو جو کہ میرے اقوال میں اس بات کو درج کرے کہ میں اللہ کا بیٹا ہوں" پس شاگرد ان باتوں کے سنتے وقت مردوں کی طرح بے جان سے ہو کر گر پڑے۔ تب یسوع نے یہ کہتے ہوئے اٹھایا "ہمیں اس وقت خدا سے ڈرنا چاہیئے اگر ہم یہ ارادہ کریں کہ اس دن میں خوف نہ کھائیں"

(برنباس صفحہ ۱۰۸)

اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت مسیحؑ نے اس لفظ کا استعمال مجازاً بھی جائز قرار نہیں دیا تھا تاکہ بعد میں اس پر حقیقت کی عمارت نہ استوار کر لی جائے۔

بہر حال یہ ہیں اناجیل کے بیانات۔ اس باب میں دورِ حاضر کی تحقیق کس نتیجہ پر پہنچی ہے اور اب متوسط الخیال عیسائیوں کا اس ضمن میں کیا عقیدہ ہے۔ اس کی تصریح آگے چل کر ملے گی۔

قرآن کریم کا بیان

اب آئیے قرآن کریم کی طرف۔ اس میں بالتصریح کہیں نہیں لکھا کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی تھی، نہ ہی یہ لکھا ہے کہ آپ یوسف کے بیٹے تھے۔ (قرآن کریم میں کئی ایک انبیاء کرام ایسے ہیں جن کے والد کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ حضرت موسیٰ کے والد کا نام بھی مذکور نہیں۔ والدہ ہی کا ذکر ہے)۔ جیسا کہ ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں۔ عیسائیوں کے نزدیک ولادت حضرت مسیحؑ کے مسئلہ کی اہمیت اس لئے تھی کہ یہ چیز بنیاد تھی الوہیت مسیحؑ۔ تثلیث اور کفارہ کے عقیدہ کی۔ قرآن کریم کو ان باطل عقائد کی تغلیط و تردید مقصود تھی، اس لئے اس میں ولادت حضرت مسیح کا ذکر اس انداز سے آیا ہے کہ اس سے ان عقائد باطلہ کی تردید ہو جائے۔ ان مبادیات کو پیش نظر رکھ کر قرآن کریم کی آیات کو دیکھئے۔ ولادت حضرت مسیحؑ کا تفصیلی تذکرہ سورۂ آل عمران اور سورۂ مریم میں آیا ہے۔ ان کی متعلقہ آیات پہلے گزر چکی ہیں لیکن توضیح مطالب کے لئے انہیں پھر درج کر دیا جاتا ہے۔ ان ہر دو مقامات میں ولادت حضرت مسیحؑ کی خوش خبری سے پہلے حضرت یحییٰؑ کی پیدائش کا ذکر آیا ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہے۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ سَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَ امْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ○

(۳/۳۹—۴۰)

پھر ایسا ہوا کہ فرشتوں نے زکریا کو پکارا اور وہ محراب میں کھڑا مصروف دعا تھا "خدا تھیں یحییٰ کی (یعنی ایک لڑکے کی جو پیدا ہوگا اور اس کا نام یحییٰ رکھا جائے) بشارت دیتا ہے۔ وہ خدا کے حکم سے ایک ہونے والے ظہور کی تصدیق کرنے والا، جماعت کا سردار، پارسا و مرتاض، اور خدا کے صالح بندوں میں سے ایک نبی ہوگا" زکریا نے جب یہ سنا تو کہا "خدایا، میرے یہاں لڑکا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے؟" حکم الٰہی ہوا "اسی طرح مشیت خداوندی کے مطابق۔

اس کے بعد حضرت مسیحؑ کے متعلق ہے۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ○ وَ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا وَّ مِنَ

الصّٰلِحِيْنَ ○ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○ (۳ـ۴۵، ۴۷)

اور (پھر) جب ایسا ہوا کہ فرشتوں نے کہا "اے مریم! اللہ تجھے اپنے کلام کے ذریعہ (ایک لڑکے) کی بشارت دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ ہوگا، اور مریم کا بیٹا کہلائے گا۔ وہ دنیا و آخرت دونوں میں ارجمند ہوگا، اور بچپنے میں اور بڑی عمر میں کلام کرے گا۔ نیز اللہ کے حضور مقرب اور اس کے بندوں میں سے ایک صالح انسان ہوگا۔" مریم (نے یہ بشارت سنی تو متعجب ہو کر) بولی "خدایا! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میرے لڑکا ہو؟ حالانکہ مجھے کسی مرد نے چھوا تک نہیں؟" ارشاد الٰہی ہوا "اسی طرح مشیت خداوندی کے مطابق تخلیق ہوتی ہے، وہ جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے، تو حکم دیتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح سورۂ مریم میں پہلے حضرت یحییٰؑ کی بشارت کا ذکر ہے۔

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۨ اسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ○ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّ كَانَتِ امْرَاَتِىْ عَاقِرًا وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ○ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَيْئًا ○ (۱۹ـ۷، ۹)

(اس پر حکم ہوا) "اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی (پیدائش کی) خوشخبری دیتے ہیں۔ اس کا نام یحییٰ رکھا جائے۔ اس سے پہلے ہم نے کسی کے لئے یہ نام نہیں ٹھہرایا ہے۔" زکریا نے متعجب ہو کر کہا "پروردگار! میرے یہاں لڑکا کیسے ہوسکتا ہے۔ میری بیوی بانجھ ہو چکی اور میرا بڑھاپا دور تک پہنچ چکا۔"

ارشاد ہوا "ایسا ہی ہوگا۔ تیرا پروردگار فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لئے کچھ مشکل نہیں۔ میں نے اس سے پہلے خود تجھے پیدا کیا۔ حالانکہ تیری ہستی کا نام و نشان نہ تھا۔"

اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے۔

وَاذْكُرْ فِى الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ○ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ○ قَالَتْ اِنِّىْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ

تَقِيًّا ٥ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ٥ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّ لَمْ اَكُ بَغِيًّا ٥ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَ لِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ٥ (۱۹/۱۲–۲۱)

اور (اے پیغمبر) کتاب میں مریم کا معاملہ بیان کر۔ اُس وقت کا معاملہ، جب وہ ایک مکان میں کہ پورب کی طرف تھا، اپنے گھر کے آدمیوں سے الگ ہو گئی۔ پھر اُس نے ان لوگوں کی طرف سے پردہ کر لیا۔ پس ہم نے اس کی طرف اپنی "روح" (فرستادہ) بھیجا اور وہ ایک بھلے چنگے آدمی کے روپ میں نمایاں ہو گیا۔ مریم اُسے دیکھ کر گھبرا گئی۔ (وہ) بولی "اگر تو نیک آدمی ہے، تو میں خدائے رحمٰن کے نام پر تجھ سے پناہ مانگتی ہوں!" اس نے کہا: میں تو تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں اور (وہ کہتا ہے کہ) تجھے ایک پاکیزہ فرزند عطا کر دے۔ مریم بولی: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے لڑکا ہو حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا نہیں اور نہ میں سرکش ہوں؟ فرشتے نے کہا: ہو گا ایسا ہی۔ تیرے پروردگار نے فرمادیا کہ یہ میرے لئے کچھ مشکل نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ اس لئے ہو گا کہ اسے لوگوں کے لئے ایک نشانی بنا دوں، اور میری رحمت کا اس میں ظہور ہو۔ اور یہ ایسی بات ہے جس کا ہونا طے پا چکا ہے!

پہلے سورۂ آل عمران کی متذکرہ صدر آیات پر نگاہ ڈالئے۔ جب حضرت زکریاؑ کو بیٹے کی بشارت ملی ہے تو آپ نے تعجب سے کہا کہ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَ امْرَاَتِيْ عَاقِرٌ (اے میرے پروردگار! میرے ہاں بیٹا کیسے ہو سکتا ہے کہ میں سن رسیدہ ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے؟)۔ اس آیت میں دو باتوں کا ذکر ہے جنھیں حضرت زکریاؑ نے ولادتِ فرزند کے لئے بطور موانع پیش کیا ہے۔ ایک اپنی سن رسیدگی اور دوسرے اپنی بیوی کا بانجھ پن۔ اللہ تعالیٰ نے ان موانع کو رفع کر دیا اور حضرت یحییٰؑ کی پیدائش عام انسانی بچوں کی طرح ظہور پذیر ہوئی۔ دیکھئے! حضرت زکریاؑ نے استعجاباً عرض کیا تھا کہ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ (میرے یہاں کس طرح لڑکا پیدا ہو سکتا ہے!) اس کے جواب میں فرمایا كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ۔ (اسی طرح ہو گا جس طرح ہوتا ہے ـــ اللہ اپنے قانونِ مشیت کے ماتحت جو چاہتا ہے کرتا ہے) یعنی اسی طرح ہو گا (كَذٰلِكَ) جس طرح مشیت کے کام ہوتے ہیں۔ جو کچھ مشیت کے تابع ہونا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے اسباب پیدا کر دیتا ہے اور اس طرح رکاوٹیں رفع ہو جاتی ہیں۔ حضرت زکریاؑ کے سلسلہ میں یہ رکاوٹیں کس طرح رفع ہوئیں؟ اس کے متعلق سورۂ انبیاء میں فرمایا کہ وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ (۲۱/۹۰) (ہم نے زکریاؑ کے لئے اس کی بیوی میں (حمل کی) صلاحیت پیدا کر دی)۔ "لَهٗ" سے مترشح ہے کہ حضرت زکریاؑ میں باوجود کبر سنی

اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ آپ کی بیوی عقیم تھیں سو وہ نقص دور کر دیا گیا۔ کَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کو بروئے کار لانے کے لئے سامان پیدا کر دیتا ہے۔

" جب حضرت مریمؑ کو بیٹے کی بشارت ملتی ہے تو آپ ہیکل میں راہبانہ زندگی بسر کر رہی تھیں۔ ایک راہبہ (NUN) کے لئے عائلی زندگی کا تصور بھی نہیں ہو سکتا، اس لئے حضرت مریمؑ نے عرض کیا کہ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ (۳/۴۷) "اے میرے پروردگار! میرے ہاں کیسے بیٹا پیدا ہوگا؟ اس کے جواب میں فرمایا کہ اسی طرح جس طرح مشیت کے ماتحت تخلیق ہوا کرتی ہے۔ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۳/۴۷) جب وہ کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیتا ہے تو اس کے لئے پھر اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ وہ کہدے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔" واضح رہے کہ "كُنْ فَيَكُوْنُ" کے معنی یہ نہیں کہ ایسا کہنے سے شے مطلوبہ خود بخود زمین سے پھوٹ کر باہر نکل آتی ہے۔ بلکہ مفہوم یہ ہے کہ اس اس شے کی تخلیق ابتدا ہو جاتی ہے اور وہ پھر ضروری مراحل طے کرنے کے بعد اپنی تکمیل تک جا پہنچتی ہے

اسی طرح سورۂ مریم کی مندرجہ صدر آیات کو دیکھئے۔ بشارت حضرت یحییٰؑ پر حضرت زکریاؑ نے عرض کیا۔

رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّ كَانَتِ امْرَاَتِىْ عَاقِرًا وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝ (۱۹/۸)

اے میرے پروردگار! میرے کیسے لڑکا ہوگا کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بڑھاپے میں بہت آگے بڑھ چکا ہوں"

جواب میں ارشاد ہوا۔ قَالَ كَذٰلِكَ ۔ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَيْئًا ۝ (۱۹/۹) "کہا۔ ایسا ہی ہوگا۔ تیرا رب کہتا ہے کہ یہ مجھ پر آسان ہے اور اس سے قبل میں نے تجھے پیدا کیا جب تو کوئی شے نہ تھا" یعنی جو موانع تم نے بیان کئے ہیں وہ بجا اور درست! لیکن یہ چیز اللہ کے لئے کچھ مشکل نہیں کہ وہ ان موانع کو دور کر دے۔ تم ان موانع پر ہی متعجب ہوتے ہو لیکن کیا یہ نہیں سوچتے کہ خود تمہاری (یعنی ایک انسان کی) تخلیق کس طرح عمل میں آئی ہے؟

اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کی بشارت کا ذکر ہے جسے سن کر حضرت مریمؑ نے عرض کیا۔

قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ وَّ لَمْ اَكُ بَغِيًّا ۝ (۱۹/۲۰)

مریم بولی "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے لڑکا ہو، حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا نہیں اور نہ میں سرکش ہوں"

اس کے جواب میں فرمایا۔

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝ (۱۹/۲۱)

فرشتہ نے کہا۔ ہوگا ایسا ہی۔ تیرے پروردگار نے فرمادیا کہ یہ میرے لئے کچھ مشکل نہیں۔ وہ کہتا ہے، یہ اس لئے ہوگا کہ اُسے لوگوں کے لئے ایک نیک نشانی بنادوں اور میری رحمت کا اُس میں ظہور ہو۔ اور یہ ایسی بات ہے جس کا ہونا طے پا چکا۔

یعنی یہاں بھی وہی الفاظ آئے ہیں جو حضرت زکریاؑ کے استعجاب کے جواب میں ارشاد ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ فرمایا کہ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا۔ یعنی یہ ایک طے شدہ امر ہے اور طے شدہ امر کے ظہور پذیر ہونے کے لئے سُنّت اللہ کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ کُنْ فَيَكُوْن۔ یعنی اس شے کا ابتدا سے انتہا تک مختلف مراحل طے کرنا۔ چنانچہ اگلی آیت میں ان مراحل کی تشریح فرمادی۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ۝ (۱۹/۲۲)

پھر اُس ہونے والے فرزند کا حمل ٹھہر گیا۔ وہ لوگوں سے الگ ہوکر دور چلی گئی۔

حضرت مریمؑ کو اپنے وقت پر حمل قرار پاگیا۔ جس طرح حمل قرار پایا کرتا ہے، اس کی تفصیل بیان کرنے کی قرآن کریم کو ضرورت نہ تھی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ حمل کس طرح قرار پایا کرتا ہے۔ كَذٰلِكِ۔ اُسی طرح جس طرح ہر شخص جانتا ہے اور جس طرح خود حضرت مریمؑ کے دل میں خیال گذرا تھا کہ اس کے لئے بشر کے ساتھ تمسک کی ضرورت ہے۔

ان مقامات کے علاوہ، اجمالی طور پر، سورۂ انبیاء میں بھی حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا ذکر آیا ہے اور وہاں بھی اس ذکر سے پہلے پیدائش حضرت یحییٰؑ کا ذکر موجود ہے جہاں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریاؑ کی بیوی میں (بانجھ پن دور کرکے) اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کردی تھی۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۫ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝ (۲۱/۹۰)

تو دیکھو ہم نے اُس کی پکار سن لی۔ اُسے (ایک فرزند) یحییٰ عطا فرمایا، اور اُس کی بیوی کو اس کے لئے تندرست کردیا۔ یہ تمام لوگ نیکی کی راہوں میں سرگرم تھے۔ (ہمارے فضل سے) اُمید لگائے ہوئے اور (ہمارے جلال سے) ڈرتے ہوئے ہمیں پکارتے تھے اور ہمارے آگے عجز و نیاز سے جھکے ہوئے تھے؛

اس کے بعد حضرت مریمؑ کا ذکر ہے۔

وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَ جَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ (۲۱/۹۱)

اور (اسی طرح) اُس عورت کا معاملہ ہے جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی (یعنی مریم کا معاملہ) پس ہم نے اپنی رُوح میں سے اُس میں پھونک دیا، اور اُسے اور اس کے بیٹے (مسیح) کو تمام دنیا کے لئے (سچائی کی) ایک نشانی بنا دیا۔!

حضرت زکریاؑ کے علاوہ حضرت ابراہیمؑ کے ہاں بھی کبرسنی میں اولاد ہوئی تھی اور اس کے لئے بھی اللہ تعالےٰ کی طرف سے بشارت ملی تھی (تفصیلی تذکرہ جوئے نور میں گذر چکا ہے) جب آپ کی بیوی نے اس پر تعجب کا اظہار کیا کہ اس سن رسیدگی میں اُن کے ہاں اولاد! تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ "کیا تم اللہ کے امر پر تعجب کرتی ہو؟" دیکھئے یہاں بھی اسی طرح امر اللہ کہا گیا ہے جس طرح حضرت عیسیٰؑ کے ضمن میں فرمایا کہ وہ اَمْرًا مَّقْضِيًّا (یعنی ایک طے شدہ امر تھا ۱۹/۲۱)

طعن و تشنیع کیوں؟

جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، حضرت مریم ایک راہبہ[1] کی زندگی بسر کر رہی تھیں جسے دنیاوی علائق سے کچھ واسطہ نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ساری عمر تجرد

---

[1] خانقاہیت (Monasticism) کی زندگی مذہب عیسویت کی ایجاد نہیں۔ اس کے آثار اس سے پہلے یہودیوں کے ہاں بھی موجود تھے اور مصریوں میں بھی۔ خود حضرت مریمؑ کی ابتدائی زندگی کے حالات اس پر شاہد ہیں کہ یروشلم کے ہیکل (خانقاہ) میں راہب اور راہبات ہوتی تھیں۔ یہ تارک الدنیا لوگ، عبادات میں مصروف رہتے اور انبیائے یہود کی پیش گوئیوں کے ماتحت ایک آنے والے مسیح کا انتظار کرتے۔ تفاصیل کے لئے دیکھئے۔

Spirt And Origin of Christian Monasticism, By J.O. Hannay نیز Benedictive Monasticism By E.L. Butler.

اور انسائیکلو پیڈیا اوف ریلیجنز اینڈ ایتھکس میں صراحت سے لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے قبل یہودیوں میں (بالخصوص اسینی فرقہ میں) رہبانیت کی زندگی آچکی تھی۔ اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں حضرت مریمؑ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بارہ برس کی عمر تک بطور راہبہ ہیکل میں رہی تھیں۔ اس کے بعد ہیکل کے پجاریوں کو اس کی تلاش ہوئی کہ اسے کسی عمر رسیدہ یہودی کی کفالت میں دیدیا جائے جو رنڈوا ہو تاکہ وہ (حضرت مریم) تجرد کی زندگی بھی بسر کرے اور ہیکل کا تقدس بھی داغدار نہ ہو۔

میں گذار دینی چاہیئے۔ آپ کو خدا کی طرف سے اشارہ ملا کہ انھیں متاہل زندگی بسر کرنی ہوگی کیونکہ انھیں ایک عظیم الشان رسول کی ابن بننا ہے۔ اس طے شدہ امر (امراً مقضیا) کے مطابق، حضرت مریمؑ نے خانقاہ کی زندگی چھوڑ کر عائلی زندگی اختیار کی۔ لیکن یہودیوں کے نزدیک یہ کوئی چھوٹا جرم نہ تھا۔ ایک راہبہ کی زندگی چھوڑ کر متاہل زندگی اختیار کر لینا، شرب خانقہیت میں ارتداد سے کم نہ تھا۔ اس لئے انھوں نے حضرت مریم کو مورد طعن و تشنیع بنلیا اور اپنے جوش انتقام میں اس پیکر عفت و ناموس کے خلاف طرح طرح کے الزام تراشے۔ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝ (۴/۱۵۶)۔ یعنی ان کے نزدیک ایک راہبہ کا نکاح، نکاح ہی نہیں قرار پا سکتا تھا۔ اس لئے اس کی اولاد کس طرح مستحسن نگاہوں سے دیکھی جا سکتی تھی؟ لہذا ان کی نظروں میں یہ فعل نہایت شنیع اور یہ امر (معاذ اللہ) موجب ہزار نفرین تھا۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حضرت مریم (اور ان کے شوہر) بچے کو لے کر مصر (یا رینان کی تصریح کے مطابق ناتا کی بستی) کی طرف چلی گئی تھیں۔ اناجیل کے بیان کے مطابق، وہاں سے واپسی کے بعد جب حضرت عیسیٰ قریب بارہ سال کے ہوئے تو انھوں نے ہیکل کے احبار و رہبان کی دسیسہ کاریوں کے خلاف آواز بلند کرنی شروع کر دی تھی۔ (اگرچہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ کو نبوت ملنے کے بعد کا ہے)۔ آپ کی یہ تنقید جس قدر سخت ہوتی تھی اس کا اندازہ اناجیل کے بیانات سے لگایا جا سکتا ہے۔ شلا متی کی انجیل میں ہے۔

اُس وقت یسوع نے بھیڑ سے اور اپنے شاگردوں سے یہ باتیں کہیں کہ فقیہ اور فریسی موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمھیں بتائیں، وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ انھیں اپنی انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کے دکھانے کو کرتے ہیں کیونکہ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں۔ اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجے کی کرسیاں۔ اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے ربّی کہلانا پسند کرتے ہیں۔ مگر تم ربّی نہ کہلاؤ۔ کیونکہ تمھارا استاد ایک ہی ہے اور تم سب بھائی ہو۔ اور زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو۔ کیونکہ تمھارا باپ ایک ہی ہے جو آسمانی ہے۔ اور نہ تم ہادی کہلاؤ۔ کیونکہ تمھارا ہادی ایک ہی ہے یعنی مسیح۔ لیکن جو تم میں بڑا ہے وہ تمھارا خادم بنے۔ اور جو کوئی اپنے آپ کو بڑا بنائے گا وہ چھوٹا کیا جائے گا۔ اور جو اپنے آپ کو چھوٹا بنائے گا وہ بڑا کیا جائے گا۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو۔ تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔ کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے! کہ ایک مرید کرنے کے لئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو۔ اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اُسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔

اے اندھے راہ بتانے والو۔ تم پر افسوس ہے! جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن اگر مقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔ اے احمقو اور اندھو۔ کونسا بڑا ہے؟ سونا یا مقدس جس نے سونے کو مقدس کیا؟ اور پھر کہتے ہو کہ اگر کوئی قربان گاہ کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں۔ لیکن جو نذر اس پر چڑھی ہو اگر اُس کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔ اے اندھو! کونسی بڑی ہے؟ نذر یا قربان گاہ جو نذر کو مقدس کرتی ہے۔ پس جو قربان گاہ کی قسم کھاتا ہے وہ اُس کی اور سب چیزوں کی جو اُس پر ہیں قسم کھاتا ہے۔ اور جو مقدس کی قسم کھاتا ہے وہ اُس کی اور اس کے رہنے والے کی قسم کھاتا ہے۔ اور جو آسمان کی قسم کھاتا ہے وہ خدا کے تخت کی اور اُس پر بیٹھنے والے کی قسم کھاتا ہے۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو۔ تم پر افسوس ہے! کہ پودینے اور سونف اور زیرے پر دہ یکی دیتے ہو۔ اور تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اے اندھے راہ بتانے والو۔ جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو۔ تم پر افسوس ہے! کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوب صورت دکھائی دیتی ہیں، مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو۔ مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو۔ تم پر افسوس ہے کہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راستبازوں کے مقبرے آراستہ کرتے ہو۔ اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے زمانے میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں اُن کے شریک نہ ہوتے۔ اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ ہم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہیں۔ غرض اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھر دو۔ اے سانپو۔ اے افعی کے بچو۔ تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچوگے؟ اس لئے دیکھو۔ میں نبیوں اور داناؤں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ اُن میں سے بعض کو قتل کروگے اور صلیب پر چڑھاؤگے اور بعض کو عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بہ شہر ستاتے پھروگے۔ تاکہ سب راستبازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا تم پر آئے۔ راستباز

ہابیل کے خون سے لے کر برکیاہ کے بیٹے زکریا کے خون تک جسے تم نے مقدس اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس زمانے کے لوگوں پر آئے گا۔

(متی ۲۳/۱-۳۶)

آپ اندازہ لگائیے کہ اس سے ان مقدسین کے طائفہ کے دل پر کیا گذرتی ہوگی؟ انھیں پہلے حضرت مریمؑ کے خلاف شکایت تھی کہ اس نے رسوم خانقاہی کو اس طرح سے توڑا۔ اس کے بعد یہ زخم کاری کہ اس کے ہاں جو بیٹا پیدا ہوا وہ اس انداز کا! یہ ہے وہ پس منظر جس میں قرآن نے کہا ہے کہ

فَأَتَتْ بِهِۦ قَوْمَهَا تَحْمِلُهُۥ ۖ قَالُوا۟ يَٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ۝ يَٰٓأُخْتَ هَٰرُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ ٱمْرَأَ سَوْءٍ وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا ۝ (۱۹/۲۷-۲۸)

جب مریم لڑکے کو لے کر اپنی قوم کے پاس آئی۔ اور وہ سواری پر تھا۔ تو وہ لوگ بول اٹھے۔ مریم! تو نے بڑی ہی عجیب بات کر دکھائی۔ اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں سرکش تھی۔

یعنی انھوں نے کہا "تمھارا گھرانا بڑا مذہب پرست تھا۔ تیرے ماں باپ، خانقاہ کے آئین و ضوابط کی بڑی پابندی کرتے تھے۔ ان کے دل میں ان مقدس قوانین و دساتیر کی بڑی عظمت تھی، تیری ماں نے تجھے ہیکل کی نذر کر دیا تھا۔ اس سے بڑھ کر عقیدت مندی اور کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن تو نے ان تمام آئین و ضوابط کو توڑ کر ہیکل کی عظمت کو برباد کر دیا۔ اپنے ماں باپ کی عقیدت مندی کو خاک میں ملا دیا۔ خانقاہ میں راہبہ بنی تھی تو ضبطِ نفس کے انداز بھی سیکھتی۔ اگر اس طرح کی (لا ستاہل) زندگی بسر کرنی تھی تو خانقاہ میں معتکف کیوں ہوئی تھی؟ یہ تو رہی تمھاری اپنی حالت۔ اس کے بعد تو نے جو بچہ جنا اس کی حالت یہ ہے کہ وہ قوم کے ایسے واجب الاحترام بزرگوں کے ساتھ ایسی گستاخی سے پیش آتا ہے اور ہیکل کے آئین و رسوم کے خلاف اس جرأت سے زبان کشائی کرتا ہے؟ بالآخر تمھارا اور تمھارے اس بچے کا اس سے مطلب کیا ہے۔ کیا تمھارے دل میں ہیکل اور اپنے آبا و اجداد کے مذہب کا کچھ احترام باقی نہیں رہا"؟ وغیرہ وغیرہ۔ اب ذرا تصور میں لائیے اس الم انگیز واقعہ کو کہ قوم کے بڑے بوڑھے۔ خانقاہ کے عمائد اور اراکین اس طرح بپھرے ہوئے درندوں کی طرح چاروں طرف سے امنڈ پڑے ہیں اور ان کے درمیان حضرت مریمؑ ساکت و صامت کھڑی ہیں۔ ہر طرف سے طعن و تشنیع کی بوچھار ہو رہی ہے لیکن وجۂ تشنیع وہ واقعہ ہے جو اللہ کی مشیت کے ماتحت، اس کے حکم کے مطابق، ایک طے شدہ فیصلہ (أَمْرًا مَّقْضِيًّا) کو پورا

کرنے کے لئے عمل میں آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اُن کے بیٹے کے خلاف بھی اس قسم کے غم و غصّہ کا اظہار کر رہے تھے۔ چنانچہ جب اُنھوں نے حضرت مریمؑ سے بار بار اصرار کیا کہ بتاؤ کہ یہ سارا ماجرا کیا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ خود کچھ جواب دیتیں، اُنھوں نے بچّے کی طرف اشارہ کر دیا کہ اس سے پوچھو۔ یہ تمھارے اعتراضات کا جواب دے گا۔

فَاَشَارَتْ اِلَیْہِ (۱۹/۲۹)

اس پر مریم نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

اس جواب پر اُن کے غصّہ کی آگ اور بھی زیادہ بھڑک اُٹھی۔ اُنھوں نے جوشِ غضب سے کہا کہ تم کیا کہتی ہو؟ سوال ہم نے تم سے کیا ہے۔ بجائے اس کے کہ اس کا کوئی جواب دو۔ ہمیں کہہ رہی ہو کہ ہم اس بچے سے پوچھیں؟ تم نے اس کا اندازہ ہی نہیں لگایا کہ اس سے تم نے ہماری کس قدر توہین کی ہے۔

قَالُوْا کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا ۝ (۱۹/۲۹)

اُنھوں نے کہا۔ " بھلا اس سے ہم کیا بات کریں جو ابھی گود میں بیٹھنے والا بچہ ہے۔

آپ دیکھئے کہ ان کے اس جواب میں کتنا گہرا طنز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو بچہ ابھی کل ہمارے ہاتھوں میں پیدا ہوا، اُس سے ہم کیا بات کریں؟ حضرت عیسیٰؑ نے اُن کی اس بات کو قابلِ اعتناء نہ سمجھا اور خود ہی جواب دیا کہ

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۛ اٰتٰىنِیَ الْکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۝ وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ ۪ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۝ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ ۫ وَ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ۝ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَ یَوْمَ اَمُوْتُ وَ یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ۝ .... (۱۹/۳۰-۳۴)

میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اُس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا۔ اُس نے مجھے بابرکت کیا، خواہ میں کسی جگہ ہوں اس نے مجھے صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا حکم دیا کہ جب تک زندہ رہوں یہی میرا شعار ہو۔ اس نے مجھے اپنی ماں کا خدمت گزار بنایا ایسا نہیں کیا کہ خود سر اور نافرمان ہوتا۔ مجھ پر اُس کی طرف سے سلامتی کا پیام ہے جس دن پیدا ہوا، جس دن مروں گا، اور جس دن پھر زندہ اُٹھایا جاؤں گا: "یہ ہے مریم کے بیٹے عیسیٰ کی سرگذشت۔ سچائی کی بات جس میں لوگ اختلاف کرنے لگے ہیں۔

اس جواب پر غور کیجئے۔ اس میں حضرت عیسیٰؑ نے اپنی پیدائش کے متعلق ایک حرف تک نہیں کہا۔ اس لئے کہ

سوال (کسی غیر معمولی طور پر) پیدائش کا نہیں تھا بلکہ اُن کا اعتراض یہ تھا کہ حضرت مریمؑ نے رسم ورہِ خانقاہی چھوڑ کر عائلی زندگی کیوں اختیار کی؟ اس کے جواب میں حضرت عیسیٰؑ نے اپنی نبوت اور کتاب کی طرف اشارہ کر کے یہ بتا دیا کہ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ان رسومِ خانقاہیت کو اصل مذہب سے کیا تعلق ہے؟ یہ سب تمھاری اختراعات ہیں۔ انھیں اس دین سے کچھ واسطہ نہیں جس کے تم مدعی بنے بیٹھے ہو۔ لیکن تم جسے تم نے درحقیقت کچھ کا کچھ بنا رکھا ہے اس لئے حضرت مریم نے تاہل کی زندگی اختیار کرنے میں کوئی گناہ نہیں کیا لہٰذا میں انھیں موردِ الزام قرار نہیں دیتا۔ یہ تمھاری شقاوت اور قساوتِ قلبی ہے جو عفیفہ کے خلاف دریدہ دہنی سے کام لے رہے ہو۔ میں تو ایسا شقی القلب نہیں ہو سکتا۔ یقیناً وہ حسنِ سلوک کی مستحق ہے۔ اور اس کے ساتھ میرا سلوک ایسا ہی ہوگا۔ وبرًا بوالدتی۔[1]

اس سے اس امر کی شہادت مل گئی کہ حضرت مریم نے مسلکِ خانقاہیت ترک کر دینے میں کسی

---

[1] انجیل میں اس کے برعکس یہ درج ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اپنی والدہ سے درشتی سے پیش آیا کرتے تھے۔ متی میں ہے

جب وہ بھیڑ سے یہ کہہ ہی رہا تھا تو دیکھو اس کی ماں اور بھائی باہر کھڑے تھے اور اُس سے باتیں کرنی چاہتے تھے کسی نے اس سے کہا۔ دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے باتیں کرنی چاہتے ہیں۔ اس نے خبر دینے والے کے جواب میں کہا۔ کون ہے میری ماں۔ اور کون ہیں میرے بھائی؟ اور اپنے شاگردوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ دیکھو میری ماں اور میرے بھائی یہ ہیں۔ کیونکہ جو کوئی میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلے وہی میرا بھائی اور بہن اور ماں ہے (متی ۱۲)

اس میں شبہ نہیں کہ اس وعظ میں حضرت عیسیٰؑ نے وہ عظیم الشان اصول بیان فرمایا ہے جس کی تبلیغ کے لئے تمام حضرات انبیائے کرامؑ تشریف لاتے رہے۔ یعنی انسانوں کی تقسیم باعتبار کفر و ایمان نہ بلحاظِ نسب و قومیت۔ لیکن اس واقعہ سے دو باتیں واضح ہیں۔ یا تو حضرت مسیحؑ کی والدہ آپ پر ایمان نہیں رکھتی تھیں اور "آسمانی باپ" کی مرضی پر نہیں چلتی تھیں۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ میری ماں وہ نہیں۔ میری ماں (اور بھائی) یہ لوگ ہیں جو خدا کی مرضی پر چلتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر عیسائیوں کے ہاں حضرت مریم کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے اور اس کے بعد حضرت مریمؑ کی پرستش کیا معنی رکھتی ہے! اور اگر یہ غلط ہے تو پھر حضرت مسیحؑ کے اس سلوک کو کیا کہئے؟ (بہرحال یہ استفسار عیسائی حضرات سے ہے؟)

قرآن کریم نے حضرت یحییٰؑ کے متعلق بھی لکھا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ سے نیک سلوک کرتے تھے اور سرکش و جبار نہ تھے (۱۹/۱۴) معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عام طور پر والدین سے اچھا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ اسی لئے اس خصوصیت کا ذکر نمایاں طور پر کیا گیا ہے۔

جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا اس لئے نہ آپ اور نہ آپ کا لڑکا کسی طعن و تشنیع کا مورد قرار پا سکتا تھا۔ اسی لئے دوسرے مقام پر اللہ تعالےٰ نے اسے حضرت عیسیٰؑ اور آپ کی والدہ پر اپنا انعام قرار دیا ہے۔

إِذْ قَالَ اللَّهُ يَٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ ۔ إِذْ أَيَّدتُّكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ ، تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ (۵/۱۱۰) نیز (۳/۴۶)

اور جب اللہ کہے گا۔ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! میں نے تم پر اور تمھاری ماں پر جو احسان کئے ہیں انھیں یاد کرو۔ جب ایسا ہوا تھا کہ میں نے روح القدس سے تمھیں تقویت دی تھی۔ تم لوگوں سے چھوٹی عمر اور بڑی عمر میں (وعظ و نصیحت کی) باتیں کرتے تھے۔

یہ ہیں ولادتِ حضرت مسیح کے متعلق واقعات جو قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ انہی کے پیش نظر عیسائیوں سے کہا گیا کہ جب حقیقتِ حال یہ ہے تو پھر ابنیت کے عقیدہ کے کیا معنی؟

مَا كَانَ لِلَّهِ أَن يَتَّخِذَ مِن وَلَدٍ ۖ سُبْحَانَهُ ۚ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ ۝ وَإِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝ (۱۹/۳۵-۳۶)

اللہ کے لئے کبھی یہ بات نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ وہ اس سے بہت دور ہے (کہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے) اس کی شان تو یہ ہے کہ جب کوئی کام کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے، تو حکم کرتا ہے کہ ہو جا! اور اس کام (کی ابتدا) ہو جاتی ہے۔

اور (مسیح کی تو ساری پکار یہ تھی:) "بلاشبہ اللہ ہی میرا اور تمھارا سب کا پروردگار ہے۔ بس اسی کی بندگی کرو۔ یہی سچائی کا سیدھا راستہ ہے!"

لیکن بایں ہمہ عیسائیوں نے باہمی اختلاف کیا (جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے) اور اس قسم کا باطل عقیدہ لے کر بیٹھ گئے۔

فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِن بَيْنِهِمْ ۖ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِن مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۱۹/۳۷)

مگر پھر اس کے بعد مختلف فرقے آپس میں اختلاف کرنے لگے۔ تو جن لوگوں نے حقیقتِ حال سے انکار کیا، اُن کی حالت پہ افسوس! اُس دن کے منظر پر افسوس، جو آنے والا ہے، اور (جو) بڑی

سخت دن ہوگا!

رُوح پھونکنے سے مُراد

حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے سلسلہ میں یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم میں اپنی روح پھونک دی۔ فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا (۲۱/۹۱) روح کے متعلق "ابلیس و آدم" (عنوان ملائکہ) میں بہ صراحت لکھا جا چکا ہے۔ آپ ایک مرتبہ متعلقہ مقام پر نگاہ ڈال لیجئے جہاں سے یہ واضح ہو جائے گا کہ اس سے مفہوم امر الٰہی بھی ہے۔ پھر نفخ روح سے یہ مُراد نہیں کہ سچ مچ کوئی شے پھونکدی جاتی ہے۔ یہی نفخ روح خود تخلیق انسانی کے ضمن میں بھی آیا ہے جس سے مراد اس ہیولیٰ انسان میں، جوہر انسانیت کی بیداری (خدائی صفات کی نمود) ہے (دیکھئے ابلیس و آدم۔ عنوان "انسان" اور اس میں (۳۲/۹؛ ۱۵/۲۹؛ ۳۸/۷۲) یہی نفخ روح، مولود حضرت مریم کے متعلق ہے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا (۲۱/۹۱) میں فیہا کی ضمیر مؤنث ہے لیکن سورۂ تحریم میں فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا (۶۶/۱۲) آیا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس مؤخر الذکر آیت میں فیہ کی ضمیر کا مرجع، فرج ہے (آیت قرآن کریم سے نکال کر دیکھئے) لیکن قیاس غالب یہ ہے کہ فیہ میں (ضمیر مذکر) حضرت عیسیٰ کی طرف راجع ہے۔ جن کا ذکر مستور ہے۔ اس لئے کہ دوسری جگہ خود حضرت عیسیٰ کو رُوحٌ مِّنْهُ کہا گیا ہے۔ (۴/۱۷۱)

مندرجہ صدر آیت میں حضرت عیسیٰ کو اللہ کا کلمہ کہا گیا ہے۔ نیز سورۂ آل عمران میں ہے۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝ (۳/۴۵)

(اور پھر) جب ایسا ہوا کہ فرشتوں نے کہا "اے مریم! اللہ تجھے اپنے کلام کے ذریعہ (ایک لڑکے کی) بشارت دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ ہوگا، اور مریم کا بیٹا کہلائے گا۔ وہ دنیا و آخرت، دونوں میں ارجمند ہوگا۔

کلمہ کے معنی

کلمہ کے معنی کیا ہیں؟ قرآن کریم میں یہ لفظ (کلمہ جمع کلمات) متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے۔ سب سے پہلے عام "بات" کے معنوں میں (دیکھئے ۹/۷۴؛ ۱۸/۵؛ ۲۳/۱۰۰) نیز کلمہ کے معنی ایسی بات کے بھی ہیں جس میں کوئی خصوصیت ہو۔ مثلاً قصۂ آدم میں ہے

کہ ہبوط کے بعد آدم نے اپنے رب سے کلمات سیکھ لئے (۲/۳۷) نیز دیکھئے (۴/۹ ؛ ۲۹/۴۲ ؛ ۴۴/۳) اسی سلسلہ میں آگے قدم بڑھائیے تو کلمہ کے معنی شن اور مقصد کے ملیں گے۔ سورۂ ابراہیم میں احقاق حق اور ابطال باطل کا عظیم الشان اصول بیان کیا گیا ہے (جس کی تشریح کا یہ موقع نہیں) جس میں فرمایا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۙ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ﹰاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۝ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۝ (۱۴/۲۴ ـ ۲۷)

کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ نے کس طرح ایک مثال بیان کی؛ ایک اچھی بات کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھا درخت، جڑ اس کی جمی ہوئی اور ٹہنیاں آسمان میں پھیلی ہوئیں۔ اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل پیدا کرتا رہتا ہے (اس کی ٹہنیاں کبھی بغیر پھل کے نہیں رہ سکتیں) اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ سوچیں سمجھیں! اور نکمی بات کی مثال کیا ہے جیسے ایک نکما درخت۔ زمین کی سطح پر اس کی جڑ کھوکھلی۔ جب چاہا اکھاڑ پھینکا۔ اس کے لئے جماؤ نہیں اللہ ایمان والوں کو جینے اور مضبوط رہنے والی بات کے ذریعہ جماؤ اور مضبوطی دیتا ہے۔ دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ اور نافرمانوں پر (جماؤ اور مضبوطی کی) راہ گم کر دیتا ہے، اور وہ سب کچھ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق کرتا ہے۔

بمعنی قوانینِ الٰہیہ

ظاہر ہے کہ خدا کے مخلص بندوں کی ان تدابیر و مقاصد عالیہ کے استحکام و بر و مندی کی وجہ یہ ہے کہ وہ مشیتِ ایزدی سے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور خود قوانینِ الٰہیہ کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انھیں استحکام و ثبات حاصل ہو۔ اس لئے قوانینِ الٰہیہ کے لئے بھی کلمات اللہ کے الفاظ آئے ہیں۔ سورۂ انعام میں ہے۔

وَ لَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ لَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (۶/۳۴)

اور (دیکھو) یہ واقعہ ہے کہ تم سے پہلے بھی خدا کے رسول جھٹلائے گئے۔ سو انھوں نے لوگوں کے جھٹلانے اور اذیت دینے پر صبر کیا اور اپنے کام میں لگے رہے) یہاں تک کہ (بالآخر) ہماری مدد آ پہنچی، اور یاد رکھو، یہ اللہ کا مقررہ قانون ہے) کوئی نہیں جو اس کے قوانین کو بدل دینے والا ہو۔ اور رسولوں کے حالات میں سے بعض کے حالات تو تم تک پہنچ ہی چکے ہیں۔

اور اللہ کے قوانین صدق و عدل سے پورے ہو کر رہتے ہیں۔

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ (۶/۱۱۵)

اور یاد رکھو) تمھارے پروردگار کا قانون سچائی اور انصاف کے ساتھ (پورا ہو کر رہے گا یوں سمجھو کہ) پورا ہو گیا۔ اس کے قوانین کا کوئی بدلنے والا نہیں۔ وہ (سب کچھ) سننے والا (سب کچھ) جاننے والا ہے۔

یعنی اس دنیا میں جماعت حقہ (حزب اللہ) کی کامیابی اور فائز المرامی اور حیاتِ اخروی میں سرخروئی و سرفرازی۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۞ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ (۱۰/۶۳-۶۴)

یہ وہ لوگ ہیں کہ ایمان لائے اور زندگی ایسی بسر کی کہ برائیوں سے بچتے رہے۔ ان کے لئے دنیا کی زندگی میں بھی (کامرانی و سعادت کی) بشارت ہے اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ اللہ کے قوانین اٹل ہیں۔ کبھی بدلنے والے نہیں۔ اور یہی سب سے بڑی فیروزمندی ہے جو انسان کے حصہ میں آ سکتی ہے۔

یہی وہ قانون (کلمہ۔ اصول) تھا جس کے مطابق ساحرین فرعون کو ناکامی اور حضرت موسیٰ کو کامرانی نصیب ہوئی۔ سورۂ یونس میں ہے۔

وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ○ (۱۰/۸۲)

وہ حق کو اپنے قوانین کے مطابق مزید ثابت کر دکھائے گا۔ اگرچہ ان لوگوں کو جو مجرم ہیں، ایسا ہونا پسند نہ آئے۔

اس لئے کہ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ خدا کے فرستادگان ہمیشہ غالب و منصور رہیں گے۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ○ (۳۷/۱۷۱)

اور یہ حقیقت ہے کہ ہمارا قانون ہمارے بندوں (یعنی رسولوں) کی نسبت پہلے ہی سے ہو چکا ہے (کہ وہ کامیاب ہو کر رہیں گے)

وَ اِذْ یَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَ یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ یَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِیْنَ ۝ (۸/۷)

اور (مسلمانو!) جب ایسا ہوا تھا کہ اللہ نے تم سے وعدہ فرمایا تھا۔ (دشمنوں کی) دو جماعتوں میں سے کوئی ایک تمہارے ہاتھ ضرور آئے گی اور تمہارا حال یہ تھا کہ چاہتے تھے کہ جس جماعت میں لڑائی کی طاقت نہیں (یعنی قافلہ والی) وہ ہاتھ آجائے، اور (خدا کا چاہنا دوسرا تھا) خدا چاہتا تھا، اپنے قانون کے ذریعہ حق کو ثابت کر دے اور دشمنانِ حق کی جڑ بنیادیں کاٹ کر رکھ دے!

لیکن تدابیر باطل کی جڑیں کٹنے کے لئے مُہلت اور وقفہ ضروری ہے اور یہ بھی اللہ ہی کا قانون ہے۔

وَ مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ فِیْمَا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ۝ (۱۰/۱۹)

اور (ابتداء میں) انسانوں کی ایک ہی اُمت تھی پھر الگ الگ ہو گئے۔ اور اگر تمہارے پروردگار کی جانب سے یہ قانون مقرر نہ ہو چکا ہوتا (کہ لوگوں کو آزادیٔ عمل دی گئی ہے) تو جن باتوں میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں ان کا فیصلہ کبھی کا ہو چکا ہوتا!

سورۂ ہود میں ہے

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِیْهِ ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّهُمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ ۝ (۱۱/۱۱۰)

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی۔ پھر اس میں اختلاف کیا گیا، اور اگر تیرے پروردگار کا پہلے سے یہ قانون مقرر نہ ہو چکا ہوتا، (یعنی یہ کہ دنیا میں ہر انسان کو مہلت عمل ملتی ہے) تو البتہ اُن کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور اُن لوگوں کو اس کی نسبت شبہ ہے کہ حیرانی میں پڑ رہے ہیں۔

سورۂ طٰہٰ میں ہے۔

وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى ۝ (۲۰/۱۲۹)

اور (اے پیغمبرؐ) اگر ایسا نہ ہوتا کہ پہلے سے تیرے پروردگار نے (اس بارے میں) ایک قانون ٹھہرایا ہے تو اسی گھڑی ان پر (جرم کا) الزام لگ جاتا اور مقررہ وقت نمودار ہو جاتا!

ایک دوسرے مقام پر۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَ لَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۴۱/۴۵﴾

اور (اے پیغمبرؐ!) یہ واقعہ ہے کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات) دی اور اس میں پھر اختلاف بھی کیا گیا۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا کہ پہلے سے تیرے پروردگار نے ایک قانون مقرر کر دیا ہے تو اسی گھڑی اُن کے مابین فیصلہ کر دیا گیا ہوتا اور بے شک وہ لوگ اس کے متعلق شبہ میں ڈالنے والے شک میں گرفتار ہو رہے ہیں!

اور سورۂ شوریٰ میں ہے۔

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۞ (۴۲/۱۴ نیز ۴۲/۲۱)

اور (اے پیغمبرؐ!) یہ لوگ متفرق نہیں ہوئے مگر اس کے بعد کہ اُن کے پاس (خدا کی طرف سے) علم آگیا۔ (اور یہ اختلاف) محض آپس کے عناد کی وجہ سے (عمل میں آیا) اور اگر ایسا نہ ہوتا کہ پہلے سے تیرے پروردگار نے (اس بارے میں) ایک مقررہ مدت کے لئے ایک قانون بنا دیا ہوا ہے۔ تو اُن کے درمیان اُسی گھڑی فیصلہ کر دیا گیا ہوتا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جن لوگوں کو اُن کے بعد کتاب دی گئی ہے (یعنی اہل انجیل) وہ بھی اس کے متعلق شبہ میں ڈالنے والے شک میں گرفتار ہیں!

جب قانونِ خداوندی کا یہ حصہ پورا ہو جاتا ہے اور مہلت کے عرصہ کے بعد ظہور نتائج کا وقت آجاتا ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت مکافاتِ عمل کو روک نہیں سکتی۔ یہ بھی اللہ کا کلمہ (قانون) ہے۔

اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ؕ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ۞ (۳۹/۱۹)

تو (اے پیغمبر اسلامؐ) جس پر عذاب کے متعلق قانونِ الٰہی ثابت ہو چکا ہے۔ (اور میزانِ الٰہی

میں مجرم قرار دیا جاچکا ہے) تو کیا ایسے لوگوں کو جو (گویا کہ) جہنم میں پہنچ چکے ہیں تم بچا سکتے ہو؟ (ظاہر ہے کہ نہیں)

اس سے ذرا آگے ہے۔

وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا ۚ قَالُوا بَلَىٰ وَلَٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكَافِرِينَ ○ (۳۹/۷۱)

اور (دیکھو) انکار کرنے والوں کو جہنم کی طرف اکٹھا کرکے ہانک کر لیجایا جائے گا۔ حتیٰ کہ وہ جہنم کے قریب پہنچ جائیں گے اور اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور اس کے محافظ اُن سے سوال کریں گے کہ "کیا تمہارے پاس تمہارے رسول نہیں پہنچے تھے جو تم پر تمہارے پروردگار کی آیتیں تلاوت کرتے اور تمہیں اس دن کی ملاقات سے ڈراتے؟" وہ جواب دیں گے۔ "کیوں نہیں (ضرور پہنچے تھے) مگر (ہم انکار ہی کرتے رہے۔ اور) انکار کرنے والوں پر قانونِ عذاب ثابت ہوچکا تھا (چنانچہ اس کے مطابق ہمیں اپنے اعمال کی سزا بھگتنے کے لئے یہاں آنا پڑا۔

اور اس سے اگلی سورت میں ہے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَالْأَحْزَابُ مِن بَعْدِهِمْ ۖ وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوهُ ۖ وَجَادَلُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ فَأَخَذْتُهُمْ ۖ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ○ وَكَذَٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ أَصْحَابُ النَّارِ ○ (۴۰/۵-۶)

(اور دیکھو) ان سے پہلے قوم نوحؑ نے اور پھر ان کے بعد دوسری جماعتوں نے بھی (اپنے اپنے رسولوں کی) جھٹلایا اور ہر جماعت نے اپنے رسول کے متعلق یہی ارادہ کیا کہ اُسے پکڑ لیں۔ اور اوچھے طریقوں سے انھوں نے (رسولوں کا) مقابلہ کیا تاکہ اس طرح حق کو مٹا ڈالیں چنانچہ (جب) میں نے انھیں پکڑ لیا تو (بتاؤ) میرا عذاب کیسا رہا؟

اور (اے پیغمبر!) بالکل اسی طرح سے تیرے پروردگار کا یہ قانون ان لوگوں کے خلاف جو انکار کرنے والے ہیں ثابت ہوچکا ہے کہ بلاشبہ وہ لوگ جہنم والے ہیں۔

اسی کلمہ (قانون) کا ذکر سورۂ ہودؑ میں ان الفاظ میں آیا ہے۔

وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ○ (۱۱/۱۱۹)

اور (پھر دیکھو اسی اختلاف ذکر و عمل کا نتیجہ ہے کہ) تمھارے پروردگار کا قانون پورا ہو کر رہا کہ البتہ ایسا ہوگا کہ میں جہنم کو، کیا جن اور کیا انسان، سب سے بھرپور کر دوں!

اللہ کے اس اٹل قانون کے ماتحت کفر و ایمان کے فیصلے ہوتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ (۱۰/۹۶)

(اے پیغمبر!) جن لوگوں پر اللہ کا قانون صادق آگیا ہے (یعنی اس کا یہ قانون جو آنکھیں بند کر لے گا، اُسے کچھ نظر نہیں آئے گا) وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔

یعنی جو شخص آنکھیں بند کر لے اُسے دکھائی نہیں دے سکتا۔ سورۂ یونس میں ہے۔

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ (۱۰/۳۳)

(اے پیغمبر!) اسی طرح تیرے پروردگار کا قانون ان لوگوں پر صادق آگیا جو (دائرۂ ہدایت سے) باہر ہوگئے ہیں کہ وہ ایمان لانے والے نہیں!

اللہ کے یہی قوانین ہیں جو اس کی کتاب میں منضبط ہیں اور جن کے ماتحت دنیائے اعمال میں ہر چیز کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

وَاتْلُ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَ لَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ○ (۱۸/۲۷)

اور (اے پیغمبر!) تیرے پروردگار کی کتاب جو تجھ پر وحی کی گئی ہے اس کی تلاوت میں لگا رہ۔ اللہ کے قوانین کوئی بدل نہیں سکتا، اور تجھے اُس کے سوا کوئی سہارا ملنے والا نہیں!

ان کلمات کو آپ احکام[1] الٰہیہ کہہ لیجئے یا اُس کے وعدے۔ پیش گوئیاں یا قوانین بات ایک ہی ہے۔

---

[1] سورۂ بقرہ میں جہاں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ارشاد ہے کہ

وَ اِذِ ابْتَلٰى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ○ (۲/۱۲۴)

(باقی صفحہ ۱۱۵ پر)

اگر کوئی کہے کہ سنکھیا مت کھانا۔ اس سے موت واقع ہو جائے گی۔ تو یہ ایک حکم بھی ہے اور پیش گوئی بھی۔ قانون بھی ہے اور تنذیر بھی۔ جو اسے سچا مان لے گا، ہلاکت سے محفوظ ہو جائے گا۔ جو انکار کرے گا تباہ ہو جائے گا۔ اسی کا نام ایمان اور کفر ہے۔

قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنِّى رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ٱلَّذِى لَهُۥ مُلْكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۖ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْىِۦ وَيُمِيتُ ۖ فَـَٔامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِ ٱلنَّبِىِّ ٱلْأُمِّىِّ ٱلَّذِى يُؤْمِنُ بِٱللَّهِ وَكَلِمَٰتِهِۦ وَٱتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝ (۷/۱۵۸)

(اے پیغمبر! تم لوگوں سے کہو) "اے افرادِ نسلِ انسانی! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں وہ خدا کہ آسمانوں کی اور زمین کی ساری بادشاہت اُسی کے لئے ہے۔ کوئی معبود نہیں مگر اُسی کی ذات وہی جلاتا ہے، وہی مارتا ہے؛ پس اللہ پر ایمان لاؤ، اور اُس کے رسول، نبی اُمّی پر، کہ اللہ اور اس کے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۱۴ کے بعد)

اور پھر غور کرو، وہ واقعہ) جب ابراہیم کو اُس کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا تھا اور وہ اُن میں پورا اُترا تھا۔ جب ایسا ہوا، تو خدا نے فرمایا، اے ابراہیم! میں تجھے انسانوں کے لئے امام بنانے والا ہوں (یعنی دنیا کی آنے والی قومیں اور نسلیں تیری دعوت قبول کریں گی اور تیرے نقشِ قدم پر چلیں گی) ابراہیم نے عرض کیا، جو لوگ میری نسل میں سے ہوں گے، اُن کی نسبت کیا حکم ہے؟ ارشاد ہوا، جو ظلم و معصیت کی راہ اختیار کریں، تو اُن کا میرے عہد میں کوئی حصہ نہیں!

وہاں کلمات سے مراد احکام خداوندی ہی ہیں۔ اور سورۂ زخرف میں جہاں فرمایا۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِيمُ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِۦٓ إِنَّنِى بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُونَ ۝ إِلَّا ٱلَّذِى فَطَرَنِى فَإِنَّهُۥ سَيَهْدِينِ ۝ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِى عَقِبِهِۦ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ (۴۳/۲۶-۲۸)

اور یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا، "بلاشبہ میں اُن چیزوں سے بری ہوں جن کی تم عبودیت (اطاعت و محکومیت) اختیار کرتے ہو۔ سوائے اُس ذات کے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ بیشک وہ میری رہنمائی فرمائے گا۔" اور ابراہیم نے اس بات کو اپنی اولاد میں باقی رہنے والی بات بنا دیا۔ کہ شاید وہ (اس حقیقت عظمیٰ کو یاد رکھیں، اور صحیح مقصد کی طرف) رجوع کریں!

وہاں اس سے مفہوم ان قوانین و احکام کی اساس یعنی پیغام توحید ہے۔

کلمات (یعنی اس کی تمام کتابوں) پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو تاکہ (کامیابی کی) راہ تم پر کھل جائے۔

کتاب فطرت اور کلام اللہ میں

یہ قوانین کتاب فطرت کے ایک ایک صفحہ پر بکھرے ہوئے ہیں۔ (اور جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے قرآن کریم میں محفوظ ہیں) ان کا احاطہ ناممکن ہے۔ ذرا کسی ماہر علم الافلاک سے پوچھئے کہ جس کہکشاں کو آپ کے شاعر گرد مرہ کہہ کر اپنا جی بہلا لیتے ہیں وہ کتنی وسعت ناآشنا اور حدود فراموش کائناتوں کا مجموعہ ہے جن میں سے ہر کائنات اتنی بڑی ہے کہ ہماری دنیا اس کے سامنے رائی کے دانہ کی بھی نسبت نہیں رکھتی۔ ان کائناتوں میں کلمات اللہ کا حصر و احاطہ کس کے بس کی بات ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (۱۸/۱۰۹)

(اے پیغمبر!) اعلان کر دے۔ اگر میرے پروردگار کے کلمات لکھنے کے لئے دنیا کے سمندر سیاہی بن جائیں، تو سمندر کا پانی ختم ہو جائے گا، مگر میرے پروردگار کے کلمات ختم نہ ہوں گے۔ اگر ان سمندروں کا ساتھ دینے کے لئے ویسے ہی سمندر اور بھی پیدا کر دیں، جب بھی وہ کفایت نہ کریں!

سورۂ لقمان میں ہے۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۳۱/۲۷)

اور (دیکھو) اگر تمام وہ درخت جو زمین میں ہیں قلم بن جائیں اور سمندر (روشنائی بن جائے) جس کی امداد کے لئے سات سمندر اس کے بعد اور آجائیں (اور خدا کے کلمات لکھنے شروع کئے جائیں۔ تو) اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے۔ بلاشبہ وہ بڑا ہی جاننے والا اور بڑی ہی حکمت والا ہے!

حضرت عیسیٰ کلمۃ اللہ تھے

کلمۃ اللہ کے ان معانی کو سامنے رکھئے اور پھر غور کیجئے ان آیات پر جن میں حضرت عیسیٰ کو کلمۃ اللہ کہا گیا ہے (ان آیات کو پہلے درج کیا جا چکا ہے۔ لیکن مفہوم کی وضاحت کے لئے ایک مرتبہ پھر درج کیا جاتا ہے) سورۂ نساء میں ہے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ

اِلٰی مَرْیَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ز فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ نف وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ط اِنْتَهُوْا خَیْرًا لَّكُمْ ط اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ط سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ یَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ م لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ط وَ كَفٰی بِاللّٰهِ وَكِیْلًا ۝ (۴/۱۷۱)

اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو (یعنی حقیقت واعتدال سے نہ گذر جاؤ) اور اللہ کے بارے میں حق کے سوا اور کچھ نہ کہو۔ مریم کا بیٹا عیسیٰ مسیح، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کا رسول ہے اور اس کے کلمہ کا ظہور ہے جو مریم پر القاء کیا گیا تھا، نیز ایک روح ہے جو اس کی جانب بھیجی گئی۔ پس چاہیئے کہ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ، اور یہ بات نہ کہو کہ خدا تین ہیں۔ دیکھو ایسی بات کہنے سے باز آجاؤ کہ تمہارے لئے بہتری ہو۔ حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ ہی اکیلا معبود ہے (اس کے سوا کوئی نہیں) وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے لئے کوئی بیٹا ہو۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اسی کے لئے ہے (وہ بھلا اپنے کاموں کے لئے اس بات کا کیوں محتاج ہو کہ کسی کو بیٹا بنا کر دُنیا میں بھیجے؟) کارسازی کے لئے خدا کا کارساز ہونا بس ہے!

اور سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ ۝ (۳/۴۵)

اور (پھر) جب ایسا ہوا تھا کہ فرشتوں نے کہا "اے مریم! اللہ تجھے اپنے کلمہ کے ذریعہ (ایک لڑکے کی) بشارت دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ ہوگا، اور مریم کا بیٹا کہلائے گا۔ وہ دُنیا و آخرت، دونوں میں ارجمند ہوگا، اور بچپنے میں اور بڑی عمر میں، یکساں طور پر (وعظ وہدایت کا) کلام کرے گا۔ نیز اللہ کے حضور مقرب اور اس کے بندوں میں سے ایک صالح انسان ہوگا"

کلمہ کے معنی تدبیر۔ حکم۔ وعدہ۔ قانون۔ بشارت۔ کچھ بھی لیجیئے مفہوم واضح ہے۔ یعنی حضرت عیسیٰ تدبیر الٰہیہ کے سلسلۂ زریں کی ایک کڑی تھے جسے انسانوں کی رشد وہدایت کے لئے حضرات انبیاء کرام کی شکل میں دنیا میں بھیجا جاتا رہا۔ یا آپ اس وعدہ کی تکمیل تھے جو حضرت مریمؑ سے کیا گیا تھا (کہ انھیں ایک آبرومند بیٹا عطا کیا جائے گا)۔ یا امر الٰہی (خدا کا حکم) تھا جو قانونِ مشیت کے تابع پورا ہوا جیسے اللہ کا ہر امر ایک قاعدہ اور قانون کے ماتحت پورا ہوتا ہے۔ سورۂ تحریم میں حضرت مریمؑ کے متعلق ارشاد ہے۔

وَ مَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ٥ (۶۶/۱۲)

اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی (عصمت و پاک دامنی کی حفاظت کی چنانچہ اس (بچے) میں ہم نے اپنی روح پھونکدی اور اس نے اپنے پروردگار کے کلمات اور کتابوں کی تصدیق کی تھی۔ اور وہ تھی ہی مطیع و فرماں بردار لوگوں میں سے۔

یہاں کلمات کے معنی کتب (احکام) اور قانتت (فرماں پذیر) سے واضح ہو جاتے ہیں۔ اس سے بھی واضح تر الفاظ ہیں، اگر دو آیات ماقبل بھی سامنے رکھ لی جائیں، جہاں ارشاد ہوا۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَّ قِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ٥ وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَ نَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ وَ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ٥ (۶۶/۱۰-۱۱)

(اور دیکھو) انکار کرنے والوں کے لئے خدا نے نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کی مثال بیان فرمائی ہے۔ وہ دونوں ہمارے بندوں میں سے دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں۔ مگر ان دونوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کی تو نوح اور لوط ان دونوں کو خدا کی (گرفت) سے کچھ بھی نہ بچا سکے اور ان دونوں سے کہدیا گیا کہ جہاں اور بہت سے جانے والے ہیں ان کے ساتھ تم بھی جہنم کے اندر چلی جاؤ! اور (اس کے برعکس) ایمان لانے والوں کے لئے خدا نے فرعون کی بیوی کی مثال بیان فرمائی ہے (یاد کرو) جب اس نے (بارگاہِ الٰہی میں) عرض کیا تھا " پروردگار! میرے لئے اپنے قرب حضور میں جنت میں ایک مکان بنادے (اور مجھے اس دنیا سے جلد اٹھالے) اور مجھے فرعون اور اس کے کرتوتوں سے نجات عطا فرما۔ اور (نہ صرف فرعون ہی سے، بلکہ) تمام ظلم کرنے والی قوم سے مجھے نجات عطا فرمادے (جو اپنے اعمال سے خود اپنے اوپر ظلم کرنے کی عادی ہوگئی ہے اور احساسِ ظلم بھی کھو چکی ہے)۔

اس کے بعد وہ آیت ہے جس میں حضرت مریمؑ کا ذکر ہے اور جو پہلے لکھی جا چکی ہے۔ ان آیات سے مفہوم

ظاہر ہے کہ حضرت مریم ایک نیک بخت اور پارسا مجسمۂ عفت و عصمت اور پیکرِ ناموس و شرافت تھیں جنھوں نے اپنے اعمالِ حیات سے احکامِ الٰہیہ کی تصدیق کر دی۔ یہی کچھ حضرت یحییٰؑ کے متعلق فرمایا۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا ۢ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ سَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ (۳/۳۹)

پھر ایسا ہوا کہ فرشتوں نے زکریا کو پکارا اور وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا "خدا تمھیں یحییٰ کی (یعنی ایک لڑکے کی جو پیدا ہوگا اور اُس کا نام یحییٰ رکھا جائے گا) بشارت دیتا ہے۔ وہ خدا کے حکم سے ایک ہونے والے ظہور کی تصدیق کرنے والا، جماعت کا سردار، پارسا و مرتاض اور خدا کے صالح بندوں میں سے ایک نبی ہوگا۔

یہاں اگر کلمہ کے معنی وعدہ کے لئے جائیں تو بھی مفہوم صاف ہے کہ حضرت یحییٰؑ کی پیدائش خدا کے اُس وعدہ کی تصدیق تھی جو اُس نے اپنے بندے زکریاؑ سے کیا تھا کہ اسے ایک فرزند سعید و صالح عطا فرمائے گا)۔ یہ معنی اگر حضرت مریمؑ پر بھی منطبق کئے جائیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ کے وعدے جو اُس نے بنی اسرائیل سے کر رکھے تھے کہ تم میں ایک مسیح پیدا ہوگا، ان کی تصدیق حضرت مریمؑ کی وساطت سے ہوگئی۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ حضرت عیسیٰؑ کو کلمۃ اللہ کہنے سے ان میں (جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے) کسی طرح بھی شانِ الوہیت پیدا نہیں ہوجاتی۔ کائنات کی ہر شے کلمۃ اللہ ہے اور انہی میں سے حضرت عیسیٰؑ ہیں[1]۔

---

[1] عیسائیوں کے مختلف فرقے مختلف انداز سے حضرت مسیح میں صفاتِ الوہیت کے قائل ہیں۔ ان میں اسکندریہ کے عیسائی آپؑ کو لوگاس (LOGOS) یعنی ازلی کلمۃ اللہ کہتے تھے۔ قرآن کریم نے کلمۃ اللہ کی تشریح فرما کر اس حقیقت کو بھی بے نقاب کر دیا کہ حضرت عیسیٰؑ کے کلمۃ اللہ ہونے سے نہ اُن میں شانِ الوہیت پیدا ہوسکتی ہے نہ ازلیت و سرمدیت۔ (وہ کلمۃ اللہ ان ہی معانی میں ہیں جن میں اوپر ذکر کیا جاچکا ہے۔ لہٰذا اللہ کے ایک برگزیدہ بندے اور بس!

قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۛ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ○ (۱۹/۳۰)

اُس نے کہا "میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اُس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا۔"

عیسائیوں نے اس (LOGOS) کے نظریہ پر اپنے فلسفۂ الٰہیات کی ایک عظیم عمارت قائم کر رکھی ہے جس کی رُو سے یہ لوگاس (کلمۃ اللہ) تثلیث کے اقانیم ثلاثہ کا اقنوم ثانی ہے۔ لیکن یہ فلسفہ یونان سے مستعار لیا گیا ہے اور اسے

پیدائشِ عیسیٰؑ کے ضمن میں قرآن کریم کی ابھی ایک آیت اور باقی ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿۳/۵۹﴾

اللہ کے نزدیک تو عیسیٰ ایسا ہی ہے جیسے آدم۔ اسے مٹی سے پیدا کیا، پھر اس کی بناوٹ کے لئے حکم فرمایا کہ ہو جا، اور (جیسی کچھ مشیتِ الٰہی تھی، اسی کے مطابق) ہو گیا۔

مثلِ آدم سے مفہوم

بیان کیا جاتا ہے کہ نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد حضرت عیسیٰؑ کے متعلق قرآنی عقائد پر بحث و تحیص کی غرض سے نبی کریمؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا۔ سورۂ آلِ عمران کی مندرجہ صدر اور اس سے متصل دو تین دوسری آیات اسی واقعہ کے متعلق بتائی جاتی ہیں۔ آیت مندرجہ صدر میں چونکہ حضرت عیسیٰؑ کی مماثلت و مشابہت آدم سے بیان کی گئی ہے اس لئے اس سے بالعموم ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ پیدائشِ آدم کی طرح حضرت عیسیٰ کی پیدائش بھی مافوق العادت طریق سے ظہور میں آئی تھی۔ لیکن اس آیتِ مقدسہ کو جب قرآن کریم کی دوسری متعلقہ آیات کی روشنی میں دیکھا جائے (جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے) تو پھر محض اس مماثلت سے اس نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ آیت بطور الزامی جواب کے ہے۔ یعنی عیسائیوں سے یہ کہا گیا ہے کہ بفرضِ محال (جیسا کہ تم کہتے ہو) اگر یہ صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت مسیح بن باپ کے پیدا ہوئے تھے تو بھی اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ وہ ابن اللہ تھے۔ اگر بن باپ کے پیدا ہو جانے سے کوئی شخص ابن اللہ ہو سکتا ہے تو آدم جو باپ اور ماں دونوں کے بغیر پیدا ہوئے تھے اُن کے متعلق کیا مانا جائے؟ انھیں تو ابن اللہ سے کچھ بڑھ کر ہونا چاہیئے! یہ توجیہہ بھی لطیف ہے۔ لیکن اس آیت میں ارشاد ہے کہ إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ یعنی "اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ الزامی جواب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ ہمارے نزدیک حقیقتِ حال یوں ہے۔

ہم "ابلیس و آدم" میں بیان کردہ قصۂ آدم میں دیکھ چکے ہیں کہ وہ آدمؑ جس کی تخلیق کا

(صفحہ ۱۱۵ کا بقیہ فٹ نوٹ)

اس پیغامِ خداوندی سے کچھ علاقہ نہیں ہے جس کے علمبردار حضرت عیسیٰؑ تھے۔ درحقیقت یہ سب شاخسانے عقیدۂ ابنیت کی پیداوار ہیں جس نے اللہ کے ایک رسول اور انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

ذکر آیا ہے کسی شخصِ واحد کا نام نہیں۔ بلکہ اس سے مراد خود نوعِ انسانی ہے جس کی تخلیق کی ابتدا مٹی سے ہوئی اور ارتقائی مدارج طے کرتے کرتے موجودہ شکل پیدا ہو گئی۔ اس اعتبار سے قرآن کریم نے متعدد مقامات پر عام انسانوں سے یہی کہا ہے کہ تمہاری تخلیق مٹی سے ہوئی ہے۔ تفصیل انسان اور آدم کے عنوانوں میں (ابلیس و آدم میں) گذر چکی ہے۔ یہاں دو ایک آیات درج کی جاتی ہیں۔ سورۂ حج میں ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ مُخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَنْ يُتَوَفَّى وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ إِلَى أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ؕ

(۲۲/۵)

لوگو! اگر تمہیں اس بارے میں شک ہے کہ آدمی (دوبارہ) جی اٹھے گا، تو اس بات پر غور کرو ہم نے تمہیں (کس چیز سے) پیدا کیا؟ مٹی سے۔ پھر (تمہاری پیدائش کا سلسلہ کس طرح جاری ہوا؟) اس طرح کہ پہلے نطفہ ہوتا ہے۔ پھر "علقہ" بنتا ہے (یعنی جونک کی طرح ایک چیز) پھر متشکل اور غیر متشکل گوشت کا ایک ٹکڑا۔ اور یہ اس لئے ہوتا ہے تم پر (اپنی قدرت کی کارفرمائیاں) واضح کر دیں۔ پھر دیکھو جس نطفہ کو ہم چاہتے ہیں (تکمیل تک پہنچائیں) اسے عورت کے رحم میں ایک مقررہ وقت تک ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ پھر (جب نطفہ تکمیل کے تمام اندرونی مراتب طے کر لیتا ہے تو) طفولیت کی حالت میں تمہیں باہر نکالتے ہیں۔ پھر تم پر (یکے بعد دیگرے) ایسی حالتیں طاری کرتے ہیں کہ (بالآخر) اپنی جوانی کی عمر کو پہنچ جاتے ہو۔ پھر تم میں کوئی تو ایسا ہوتا ہے جو (بڑھاپے سے پہلے ہی) مر جاتا ہے۔ کوئی ایسا ہوتا ہے جو بڑھاپے تک پہنچتا، اور اس طرح (عمر کی نکمی حالت کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے، کہ سمجھ بوجھ کا درجہ پا کر پھر ناسمجھی کی حالت میں پڑ جائے۔

سورۂ روم میں ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ إِذَا أَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُونَ ۝ (۳۰/۲۰)

اور دیکھو، یہ بات بھی اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر غور کرو کہ تم انسان

بن کر (اپنی مزدوریوں کے لئے) زمین کے مختلف گوشوں میں منتشر ہوجاتے ہو!

آدم! (یعنی نوع انسانی) کی تخلیق کی ابتدا مٹی سے ہوئی۔ لیکن ابتدا کو انتہا تک پہنچنے کے لئے مختلف تدریجی مراحل طے کرنے پڑے اور یہی کن فیکون ہے۔ اسی قسم کا کن فیکون حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے سلسلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ وہاں بھی مقصود ابتدا سے انتہا تک مختلف تدریجی مراحل طے کرنے سے ہے حضرت یحییٰ کی پیدائش کا ذکر بھی پہلے گذر چکا ہے۔ جب حضرت زکریا نے بیٹے کی موعودہ ولادت پر اظہار تعجب کیا تو ارشاد ہوا کہ تعجب کیا ہے! وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا (۱۹/۹) اس سے پیشتر ہم تمہیں پیدا کر چکے ہیں دراں حالیکہ تم کچھ بھی نہ تھے۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت زکریا کی اپنی پیدائش عام حالات کے ماتحت ہی ہوئی تھی۔ اسی طرح حضرت یحییٰ کی پیدائش ہوئی۔ یہی ارشاد مثل عیسےٰ کمثل آدم میں ہے

اس آیت کے صحیح مفہوم میں دشواری اس لئے پڑتی ہے کہ آدم کے متعلق صحیح قرآنی مفہوم سامنے نہیں آتا۔ آدم کے متعلق (جیسا کہ عام عقیدہ ہے) یہی سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مٹی کا پتلا بنا دیا اور اس میں جان ڈال دی۔ پھر اس کی پسلی سے اسکی بیوی نکالی۔ اور ان دونوں سے پھر سلسلۂ تخلیق آگے بڑھا۔ لیکن جیسا کہ عنوان آدم وانسان (ابلیس وآدم) میں بتصریح لکھا جا چکا ہے تخلیق انسانی کا یہ تصور ذہن انسانی کے عہد طفولیت کی پیداوار ہے۔ قرآن کریم نے انسانی پیدائش کے متعلق نظریۂ ارتقا کی واضح تشریح کردی ہے۔ اس کی روشنی میں آدم اور اس کی تخلیق کے متعلق حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔ تخلیق آدم (یعنی نوع انسانی) کے متعلق اس حقیقت کو سامنے رکھئے۔ پھر آیۂ زیر نظر اِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ) کا مفہوم بھی واضح ہوجائے گا۔ یعنی (اے عیسائیو) تم اپنے ذہن میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے متعلق کچھ بھی عقائد رکھو۔ اللہ کے نزدیک تو اُن کی پیدائش نوع انسانی کی پیدائش کے مثل ہے جو اپنی ابتدا سے انتہا تک مختلف مدارج طے کر کے تکمیل تک پہنچی۔ ایسا ہی حضرت عیسیٰ کے متعلق ہوا۔

الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ○ (۳/۵۹)

(اے پیغمبر! مسیح کے انسان ہونے اور اس کی پیدائش کی نسبت جو کچھ کہا گیا ہے، تو یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے امر حق ہے (کبھی مٹنے والی نہیں، پس عیسائیوں کے عالمگیر اعتقاد باطل کے مقابلہ میں اس دعوے کی کامیابی کتنی ہی تعجب انگیز دکھائی دیتی ہو، لیکن بالآخر کامیابی اسی کے لئے ہے) تو دیکھو، ایسا نہ ہو کہ شک وشبہ کرنے والوں میں سے ہوجاؤ!

اور اگر اس کے باوجود تم (اپنی کج بحثی پر قائم ہو تو۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ○ (۳/۶۱)

پھر جو کوئی تم سے اس بارے میں جھگڑا کرے، حالانکہ علم و یقین تمھارے سامنے آچکا ہے تو تم اُس سے کہو (میرے پاس مسیح کے انسان ہونے کے لئے علم و یقین موجود ہے۔ اگر تم بھی اس کی اُلوہیت کے لئے ویسا ہی علم و یقین رکھتے ہو تو) آؤ (یوں فیصلہ کرلیں کہ) ہم دونوں فریق میدان میں نکلیں اور) اپنے اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بلائیں اور خود بھی شریک ہوں پھر عجز و نیاز کے ساتھ خدا کے حضور التجا کریں۔ (ہم دونوں میں سے جس کا دعویٰ جھوٹا ہو، تو) جھوٹوں پر خدا کی پھٹکار ہو!

یہ ہے ساری حقیقت پیدائش حضرت عیسیٰؑ کی۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ○ (۳/۶۲-۶۳)

(اے پیغمبر!) یہ جو کچھ بیان کیا گیا، بلاشبہ بیان حق ہے، اور کوئی ہستی لائق اطاعت و محکومیت نہیں ہے، مگر صرف اللہ کی ذات یگانہ۔ اور یقیناً اسی کی ذات ہے جو سب پر غالب (اور اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والی ہے! پھر اگر یہ لوگ (فیصلہ کا یہ طریقہ) قبول نہ کریں تو اللہ مفسدوں کا حال خوب جانتا ہے (ان لوگوں کے دلوں کا کھوٹ اُس کی نظر سے پوشیدہ نہیں!)

قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ کو مثل آدم اس لئے بھی کہا ہے کہ اناجیل کے بیان کے مطابق، حضرت عیسیٰؑ خود اپنے آپ کو ابن آدم کہا کرتے تھے۔ مثلاً انجیل متی میں ہے۔

تب اس نے (مسیح نے) شاگردوں کے پاس آکر کہا اب سوتے رہو اور آرام کرو۔ دیکھو وقت آپہنچا ہے اور ابن آدم گنہگاروں کے ہاتھ میں حوالے کیا جاتا ہے
(متی باب ۲۶ ۔ صفحات ۴۵-۴۶)

---

[1] مباہلہ کا مفہوم ایک اور بھی ہے۔ لیکن اس کی تشریح کا یہ موقع نہیں۔

لہٰذا جو اپنے آپ کو ' ابنِ آدم ' کہتا ہے اس کی پیدائش کی مثال خود آدم (آدمی) کی ہے۔ وہ آدمی کا بیٹا ہے اور آدمی ہی کی طرح خود بھی پیدا ہوا ہے۔

اِن سوالات کی اہمیت کیوں؟

پیدائش اور وفات حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہم قرآن کریم سے یہ کچھ سمجھ سکے ہیں لیکن اگر آپ ان نتائج سے متفق نہ ہوں تو قرآنی آیات آپ کے سامنے ہیں (جیسا کہ متعدد بار لکھا جا چکا ہے) آپ ان پر خود غور کیجئے کیونکہ قرآن ہر ایک کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن تدبر فی القرآن میں خارجی اثرات کو داخل نہ ہونے دیجئے کہ اللہ کی کتاب محکم اس سے بہت بلند و بالا ہے۔ اس باب میں آپ کی قلبی کیفیات کا ہمیں پورا پورا اندازہ ہے۔ اس لئے کہ ان مسائل (بالخصوص وفات و حیات حضرت مسیحؑ) کو اس قدر اہمیت حاصل ہو گئی ہے کہ ہر شخص کا اس بحث میں اُلجھنے کو جی چاہتا ہے۔ حالانکہ آپ غور کیجئے تو حضرت عیسیٰؑ کی وفات علمی دنیا میں ایک تاریخی سوال اور دُنیائے مذہب میں قرآنی مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے۔ جس طرح قرآن کریم کے متعدد دیگر مسائل کو غور و فکر اور تاریخی انکشافات کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے اسی طرح اس پر بھی غور و تدبر ہونا چاہیئے اس سے زیادہ اسے کچھ اہمیت نہیں۔ عیسائیوں میں یہ مسئلہ ان کے مذہب کی بنیاد و اساس کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اُن کے ہاں اس کی خاص اہمیت کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ سوال دین کے اصول و اساس میں سے نہیں۔ لیکن دورِ حاضرہ میں (بالخصوص بعض مخصوص مقاصد کے ماتحت) اسے اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ اس سوال کو کفر و ایمان کا معیار بنا دیا گیا ہے۔ جب آپ سنجیدگی سے اس سوال پر غور کریں گے تو یقیناً حیران رہ جائیں گے کہ جب کسی قوم کے سامنے کوئی زندہ نصب العین حیات نہیں رہتا تو کس طرح اس کے قوائے عملیہ مفلوج ہو جاتے ہیں اور وہ کس طرح اپنا سارا وقت منطقی موشگافیوں اور دور از کار فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں میں صرف کرتی اور ان لاحاصل نظری مباحث کو خاص اہمیت دے کر اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھتی ہے۔ جب تک مسلمانوں کی نگاہوں کے سامنے زندگی کا واضح نصب العین اور اُن کے قلوب میں اس کے حصول کی تڑپ تھی وہ اس قسم کے مباحث میں کبھی وقت ضائع نہیں کرتے تھے آپ صدرِ اوّل کی تاریخ پر نگاہ ڈالیئے جب ایک مختصر سی مقدس جماعت نے ہر طاغوتی قوت کا تختہ اُلٹ کر رکھ دیا تھا۔ آپ کو کہیں اس قسم کے نظری مسائل کی خار دار جھاڑیاں نظر نہیں پڑیں گی جو اُن کے دامنِ خیال و قوت کو اُلجھا کر بے گانۂ منزل بنا دیں۔ اُس وقت ہوتا یہ تھا کہ اُن کے خدا نے ایک حکم دیا، مرکز نے اُس کی تشکیل فرما دی اور اُنھوں نے اس کی تکمیل کر کے دکھا دی۔

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد　　اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں

نظری مسائل اور مسلمان

دنیا کی کوئی قوت نہ تھی جو اس بے پناہ جذبۂ عمل واطاعت کے سامنے ٹھہر سکتی۔ لیکن اس کے بعد جب دورِ انحطاط شروع ہوا تو شکست خوردہ طاغوتی قوتوں نے اِدھر اُدھر سے سر نکالا۔ قیصریت۔ برہمنیت۔ کورانہ تقلید کی لعنت ایک ایک کرکے ان کے قلب ونگاہ کی دنیا پر مسلط ہوگئی۔ اسی کے ساتھ یہود ونصاریٰ اور ایران وروما کے زخم خوردہ جیوش وعساکر اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کے انتقام کے لئے صف آرا ہوگئے۔ اب میدانِ جہاد کی جگہ مناظروں کے اکھاڑوں نے لے لی اور قرآنی نظام کی جگہ عجمی تصوراتِ زندگی نے۔ عیسائی احبار اپنے "خدائے مصلوب" کے چھنے ہوئے مقام الوہیت کی بازیابی کی فکر میں تھے۔ انھوں نے اپنے عقائد کو اس طرح غیر شعوری طور پر مسلمانوں کی ذہنیت پر مرتسم کرنا شروع کیا کہ کچھ عرصے کے بعد وہی عقائد ان کے اجزائے دین بن گئے اور یہود ونصاریٰ کی منظم سازشوں سے روایات کی شکل اختیار کر گئے۔ قرآن پیچھے چلا گیا اور اس قسم کی وضعی روایات آگے بڑھ آئیں اور یوں

حقیقت خرافات میں کھو گئی

اس کے بعد معاند قوتوں کی مسلسل کوشش رہی کہ مسلمان ان نظری مسائل کی خاردار جھاڑیوں سے نکلنے نہ پائیں۔ اپنے ہاں تو انھوں نے تقسیمِ عمل کا اصول رائج کر لیا جس کی رو سے پوری کی پوری قوم حصولِ قوت وسطوت میں سرگرمِ عمل رہتی لیکن کچھ لوگ اس غرض کے لئے الگ کر دیئے جاتے کہ وہ مسلمانوں کو مناظروں کی تھپکیاں دے دے کر سلاتے رہیں۔ اس طرح ہوا یہ کہ

یاں اہلِ فسوں ساز نے باتوں میں لگایا
دے پیچ اُدھر زُلف اڑا لے گئی دل کو

خود فریب وحقیقت فراموش مسلمان سمجھ ہی نہ سکا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ گذشتہ زمانے میں کیا کچھ ہوا؟ اگر آپ اس کے سمجھنے کی زحمت نہ بھی گوارا کریں تو بھی جو کچھ آپ کے سامنے ہوا اسی سے اندازہ لگائیے کہ یہ کچھ کس طرح ہوا؟ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ گذشتہ پچاس سال سے، جبکہ پُرانی دنیا ایک پورے انقلاب سے گزر کر یکسر نئی دنیا میں تبدیل ہوچکی ہے اور صفحۂ ارض پر ایک عجیب ہنگامۂ رستخیز برپا ہے، ہندی (اور اب پاکستانی) مسلمان کی ساری قوتیں اس عقدہ کے حل کرنے میں صرف ہو رہی ہیں کہ

ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟

"جدید نبوت!"

بھلا مسلمان دورِ حاضرہ کی "جدید قادیانی نبوت" کی کامیابی وناکامی کے اندازے مردم شماری کے اعداد وشمار سے لگاتا ہے اور خوش ہوجاتا ہے کہ

دس کروڑ کے سمندر میں اس "نبوت" کے متبعین کی تعداد چند قطروں سے زیادہ نہیں۔ لیکن وہ نہیں سوچتا کہ اس "نبوت" نے کس طرح اس بحرِ ذخار کو اس کی اپنی ہی موجوں کے طلسم پیچ و تاب میں اُلجھائے رکھا تو یوں اس کی وہ قیامت خیز تلاطم انگیزیاں جو دنیا کا نقشہ بدل دینے کے لئے کافی ہو سکتی تھیں اپنے ہی بھنوروں میں گھر کر ضائع ہو گئیں۔ کیا یہ کامیابی کوئی چھوٹی کامیابی ہے؟ مسلمان اس نصف صدی کی روداد پڑھ پڑھ کر خوش ہوتا ہے کہ ہم نے بحث و جدل کا فلاں میدان مارا۔ اور ہمارے فلاں مولوی صاحب نے فلاں مناظرہ جیتا۔ اور آسمان اس پر ہنس رہا ہوتا ہے کہ

وائے نادانی۔ قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو
اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو

اس تمام طلسم پیچ و تاب کا ذمہ دار کون ہے؟ وہ چند روایات جن میں مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بجسد عنصری آسمان پر زندہ ہیں اور قیامت کے قریب دوبارہ نازل ہوں گے۔ ان چند روایات نے آج تک مسلمانوں کے پاؤں کہیں ٹکنے ہی نہیں دیئے۔ اس کے ساتھ ہی ہر صدی کے آخیر پر ایک مجدد اور پھر ایک "مہدی آخر الزماں" کی آمد سے متعلقہ روایات۔ مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ایک "آنے والے" کے لئے کھڑکی خود کھول دی۔ لیکن جب کوئی اس کھڑکی کے راستے اندر آیا تو اس کے ساتھ گتھم گتھا ہونا شروع ہو گئے۔ ان سے پوچھئے کہ جس دروازہ کو "ختم نبوت" کے عظیم الشان قفل نے بند کیا تھا اس میں اس قسم کے دریچوں اور کھڑکیوں کی گنجائش ہی کہاں تھی؟ آپ کو معلوم ہے کہ "اس جدید نبوت" کی بحث کا مدار کیا ہوتا ہے؟ پہلے قرآن کی رو سے ثابت کیا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ فوت ہو چکے ہیں۔ بہت اچھا۔ بات ختم ہو گئی! لیکن بات تو اُس کے نزدیک ختم ہو جائے جو قرآن کریم کو دین کا مدار مانے۔ اب وہ آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھئے کہ فلاں روایت میں حضرت عیسیٰؑ کے آنے کی خبر موجود ہے۔ اس لئے وہ آنے والا "مسیح ابنِ مریم" نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا مثیل ہوگا۔ اور وہ مثیلِ مسیحؑ تشریف لے آئے ہیں۔ بس یہ ہے ساری گتھی۔ اور اس کا حل؟ کس قدر آسان!! یعنی اُن سے کہئے کہ

"آنے والے" کا عقیدہ

(۱) آپ مانتے ہیں کہ قرآن سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ فوت ہو چکے اور اُن کے دوبارہ تشریف لانے کا ذکر قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ اس لئے

(۲) کوئی روایت جو حضرت عیسیٰؑ کی آمد کی خبر دیتی ہے وضعی اور جھوٹی ہے جو ہمارے لئے سند نہیں ہو سکتی۔ اب فرمائیے کیا ارشاد ہے؟ لیجئے بحث ختم ہو گئی۔ لیکن یہاں تو مصیبت یہ ہے کہ ان روایات کو محکم اور اٹل سمجھا جاتا ہے اور قرآنی آیات کے معانی اس طرح کئے جاتے ہیں جس سے کسی نہ کسی طرح

وہ روایات بھی قرار پا جائیں۔ جب تک آپ کی یہ روش ہے قیامت تک کے لئے مدعیانِ مسیحیت و مہدویت آتے رہیں گے اور آپ کو انہی لاطائل مسائل میں اُلجھا اُلجھا کر ختم کر دیں گے۔

مسلمان کی زندگی

اور اگر سچ پوچھئے تو اس جھگڑے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ آپ تو "مدعیٔ نبوت و مہدویت و مجددیت" کا ذکر کرتے ہیں، قرآن کے نزدیک عام مسلمان ہونے کے لئے جو معیار ہے ذرا اسے سامنے لایئے اور پھر آئینے میں دیکھئے کہ خط و خال کیا کہتے ہیں؟ قرآن کا ارشاد ہے کہ

وَ مَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۝ (۵:۴۴)

اور جو کوئی خدا کی نازل کی ہوئی کتاب کے مطابق فیصلے نہ کرے تو ایسے ہی لوگ ہیں جو کافر ہیں (یعنی حق سے منکر ہو گئے ہیں)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ یَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَ یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا۝ (۴:۶۰)

(اے پیغمبر!) کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر نظر نہیں کی جن کا دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ تم سے پہلے نازل ہو چکا ہے، وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن (عمل کا حال یہ ہے کہ) چاہتے ہیں، اپنے جھگڑے تصفیے سرکش اور شریر (طاغوتی) قوت کے آگے لے جائیں حالانکہ انھیں حکم دیا جا چکا ہے کہ اُس سے انکار کریں۔ اصل یہ ہے کہ شیطان چاہتا ہے کہ انھیں اس طرح گمراہ کر دے کہ راہ راست سے دور جا پڑیں۔

فرمایئے جو شخص یا قوم اس روش زندگی پر نہ صرف قانع ہی ہو بلکہ اس کے استحکام میں ساعی بھی ہو اس سے کفر و اسلام پر بحث کیسی؟ آپ "نبوت" کہتے ہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ زندگی کی اس روش پر قائم رہتے ہوئے اپنا اسلام تو ثابت کرو۔

ذہن کا ذکر کیا یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

آپ شروع سے دیکھتے چلے آرہے ہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے اسلام محض چند عقائد و رسوم کا نام نہیں بلکہ یہ ایک نظامِ اطاعت و حکومت ہے جسے عملاً دنیا میں رائج و نافذ ہونا ہے۔ یہ نظام اپنے حکم میں کسی اور نظام کو شریک نہیں کر سکتا۔ حضرات انبیاء کرامؑ دنیا میں یہی کرتے رہے۔ یہی اُن کا مشن تھا۔ ختم نبوت کے بعد اس سلسلہ کو جاری رکھنا اسلام کے متبعین کا فریضہ تھا۔ آج بھی اگر کسی کے لئے کوئی کام

صحیح معنی میں ایمان و عمل کا مظاہر کہلا سکتا ہے تو یہی ہے۔

اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

یہی ایک کسوٹی ہے جس پر صحیح پرکھ ہو سکتی ہے۔ لیکن دوسروں سے کیا کہیئے۔ یہ حقیقت خود ہمارے ہاں کے ارباب مذہب کی نگاہوں سے بھی اوجھل ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے مسلمان کی زندگی کیا ہے ان کے نزدیک بھی "نجات" کا دارومدار آمین بالجہر و خفی۔ رفع یدین۔ فاتحہ خلف الامام۔ حیات و ممات مسیح کے مسائل پر ہے اس لئے دونوں فریق انہی نظری مسائل کی بحث میں خوش ہیں۔ جیسے وہ ویسے ہم۔

ہوسِ منزلِ لیلیٰ نہ تو داری و نہ من	جگرِ گرمیٔ صحرا نہ تو داری و نہ من
دل و دیں در گرو زہرہ وشانِ عجمی	آتشِ شوقِ سلیمیٰ نہ تو داری و نہ من
خزفے بود کہ از ساحلِ دریا چیدیم	دانۂ گوہرِ یکتا نہ تو داری و نہ من
بہ کہ با نورِ چراغ تہِ داماں سازیم	طاقتِ جلوۂ سینا نہ تو داری و نہ من

عیسائیوں کا غلو

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، عیسائیوں نے ابتداءً فرطِ عقیدت سے حضرت عیسیٰؑ کی شان میں غلو اور مبالغہ سے کام لیا۔ یہی مبالغہ سینٹ پال کے وقت حقیقت کی شکل اختیار کرنے لگا۔ نیقیہ کی کونسل نے اسے عقائد کا رنگ دیا۔ اور ٹرنٹ کی کونسل میں اس نے اس ایمان کی صورت اختیار کرلی کہ

> ہم ایمان لائے رب یسوع مسیح ابن اللہ پر جو باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ جو باپ (خدا) کے ہاں جملہ کائنات سے پہلے پیدا ہوا۔ عین ذات ہے۔ الہ، الہ اور نور، نور ہے۔ عین خدا ہے۔ مولود ہے مخلوق نہیں، باپ اور اس کا جوہر ایک ہے ..... ہم انسانوں کی نجات کے واسطے اس کا نزول وحلول ہوا......... (مزید تفصیل معراجِ انسانیت میں ظہر الفساد کے عنوان میں ملے گی)

جب حضرت مسیحؑ کو یہ مقام دیا گیا تو حضرت مریمؑ کا مقام خود تصور میں آسکتا ہے۔ چنانچہ آپ کے متعلق "مقدس کلیسا" کا یہ فیصلہ ہے کہ

> وہ خدا کے نزدیک بڑی قوتوں کی مالکہ ہے۔ وہ جو کچھ مانگتی ہے اسے دیا جاتا ہے۔ وہ ہمارے لئے سرچشمۂ خیر ہے کیونکہ وہ ہمارے خدا سے مانگتی ہے۔ چونکہ وہ خدا کی ماں ہے اس لئے وہ اس کی درخواست کو مسترد نہیں کرسکتا اور چونکہ وہ ہماری بھی ماں ہے اس لئے وہ ہماری سفارش سے انکار نہیں کرسکتی......... ہم اپنی نجات کے لئے جو دعائیں اس سے کرتے ہیں وہ

مستجاب ہوتی ہیں۔ (Catholic School Book p.158)

حتیٰ کہ سپنگلر کے بیان کے مطابق آج بھی رومن کیتھولک کے ہاں رسومات اور دعاؤں میں (حضرت مسیح) کا درجہ اُن کی والدہ سے دوسرے درجہ پر آتا ہے۔" (جلد دوم صفحہ ۲۲۴)

ان کی موجودہ روش ان عقائد کے متعلق اب عیسائی محققین کی روش کیا ہے؟ اس کا اندازہ ایک مشہور مسیحی عالم دینیات ریورینڈ چارلس اینڈرسن اسکاٹ) کے اس مضمون سے لگائیے جو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں شامل ہے۔ اس مقالہ میں وہ لکھتا ہے کہ

پہلی تین انجیلوں (متی۔ مرقس، لوقا) میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ انجیلوں کے لکھنے والے یسوع کو انسان کے سوا کچھ اور سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا، ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی روح سے فیض یاب ہوا تھا اور خدا کے ساتھ ایک ایسا غیر منقطع تعلق رکھتا تھا جس کی وجہ سے اگر اس کو خدا کا بیٹا کہا جائے تو حق بجانب ہے۔ خود متی اس کا ذکر بڑھئی کے بیٹے کی حیثیت سے کرتا ہے اور ایک جگہ بیان کرتا ہے کہ پطرس نے اس کو "مسیح" تسلیم کرنے کے بعد الگ ایک طرف لیجا کر اسے ملامت کی۔ (متی ۱۶، ۲۲) لوقا میں ہم دیکھتے ہیں کہ واقعہ صلیب کے بعد یسوع کے دو شاگرد اماؤس کی طرف جاتے ہوئے اس کا ذکر اس حیثیت سے کرتے ہیں کہ وہ "خدا اور ساری امت کے نزدیک کام اور کلام میں قدرت والا نبی تھا۔" (لوقا ۲۴، ۱۹)

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اگرچہ "مرقس" کی تصنیف سے پہلے مسیحیوں میں یسوع کے لئے لفظ 'خداوند' (LORd) کا استعمال عام طور پر چل پڑا تھا، لیکن نہ مرقس کی انجیل میں یسوع کو کہیں اس لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور نہ متی کی انجیل میں۔ بخلاف اس کے دونوں کتابوں میں یہ لفظ اللہ کے لئے بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ یسوع کے ابتلاء کا ذکر تینوں انجیلیں پورے زور کے ساتھ کرتی ہیں جیسا کہ اس واقعہ کی شایان شان ہے، مگر مرقس کی "فدیہ" والی عبارت (مرقس ۱۰، ۴۵) اور آخری فسح کے موقع پر چند الفاظ کو مستثنیٰ کر کے ان کتابوں میں کہیں اس واقعہ کو وہ معنی نہیں پہنائے گئے ہیں جو بعد میں پہنائے گئے، حتیٰ کہ اس بات کی طرف کہیں اشارہ تک نہیں کیا گیا ہے کہ یسوع کی موت کا گناہ یا کفارہ سے کوئی تعلق تھا۔

آگے چل کر وہ پھر لکھتا ہے!

یہ بات کہ یسوع خود اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتا تھا، متعدد عبارتوں سے ظاہر ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ "مجھے آج اور کل اور پرسوں اپنی راہ پر چلنا ضرور ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے

یا ہلاک ہو" (لوقا ۔ ۱۳ ، ۲۳) وہ اکثر اپنا ذکر" ابن آدم "کے نام سے کرتا ہے ...... یسوع کہیں اپنے آپ کو " ابن اللہ " نہیں کہتا ، اور اس کے دوسرے ہم عصر بھی جب اس کے متعلق یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو غالباً اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اس کو " مسیح " سمجھتے ہیں۔ البتہ وہ اپنے آپ کو مطلقاً بیٹے کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے ..... مزید برآں وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو بیان کرنے کے لئے بھی " باپ " کا لفظ اسی اطلاق شان میں استعمال کرتا ہے ...... اس تعلق کے بارے میں وہ اپنے آپ کو منفرد نہیں سمجھتا تھا بلکہ ابتدائی دور میں دوسرے انسانوں کو بھی خدا کے ساتھ اس خاص گہرے تعلق میں اپنا ساتھی سمجھتا تھا ، البتہ بعد کے تجربے اور انسانی طبائع کے گہرے مطالعہ نے اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ اس معاملہ میں وہ اکیلا ہے۔

پھر یہی مصنف لکھتا ہے :-

عید پنتکست کے موقع پر پطرس کے یہ الفاظ کہ " ایک انسان جو خدا کی طرف سے تھا " یسوع کو اس حیثیت میں پیش کرتے ہیں جس میں اس کے ہم عصر اس کو جانتے اور سمجھتے تھے ..... انجیلوں سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یسوع بچپن سے جوانی تک بالکل فطری طور پر جسمانی و ذہنی نشو و نما کے مدارج سے گزرا ، اس کو بھوک لگتی تھی ، وہ تھکتا اور سوتا تھا وہ حیرت میں مبتلا ہو سکتا تھا اور دریافت احوال کا محتاج تھا ، اس نے دکھ اٹھایا اور مرا ۔ اس نے یہی نہیں کہ سمیع و بصیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ صریحاً اس سے انکار کیا ہے ..... درحقیقت اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اگر دعویٰ کیا جائے تو یہ اس پورے تصور کے بالکل خلاف ہوگا جو ہمیں انجیلوں سے حاصل ہوتا ہے بلکہ اس دعوے کے ساتھ آزمائش کے واقعہ کو اور کھوپڑی کے مقام پر جو واردات گذریں ان میں سے کسی کو بھی مطابقت نہیں دی جا سکتی ۔ تاوقتیکہ ان واقعات کو بالکل غیر حقیقی قرار نہ دیا جائے یہ ماننا پڑے گا کہ مسیح جب ان سارے حالات سے گذرا تو وہ انسانی علم کی عام محدودیت اپنے ساتھ لئے ہوئے تھا اور اس محدودیت میں اگر کوئی استثناء تھا تو صرف اسی حد تک جس حد تک پیغمبرانہ بصیرت اور خدا کے یقینی شہود کی بنا پر ہو سکتا ہے ۔ پھر مسیح کو قادر مطلق سمجھنے کی گنجائش تو انجیلوں میں اور بھی کم ہے ۔ کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر خود مختارانہ کام کرتا تھا ۔ اس کے برعکس وہ بار بار دعا مانگنے کی عادت سے اور اس قسم کے الفاظ سے کہ " یہ چیز دعا کے سوا کسی اور ذریعہ سے نہیں مل سکتی " اس بات کا صاف اقرار کرتا ہے کہ اس کی ذات قطعاً خدا پر منحصر ہے ۔ فی الواقع یہ بات ان انجیلوں کی تاریخی حیثیت سے

معتبر ہونے کی ایک اہم شہادت ہے کہ اگرچہ ان کی تصنیف و ترتیب اس زمانے سے پہلے مکمل ہوئی تھی جبکہ مسیحی کلیسا نے مسیح کو الٰہ سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ پھر بھی ان دستاویزوں میں ایک طرف مسیح کے فی الحقیقت انسان ہونے کی شہادت محفوظ ہے اور دوسری طرف ان کے اندر کوئی شہادت اس امر کی موجود نہیں ہے کہ مسیح اپنے آپ کو خدا سمجھتا تھا۔

اس کے بعد یہ مصنف پھر لکھتا ہے۔

وہ سینٹ پال تھا جس نے اعلان کیا کہ واقعہ رفع کے وقت اسی فعل رفع کے ذریعے سے یسوع پورے اختیارات کے ساتھ "ابن اللہ" کے مرتبہ پر علانیہ فائز کیا گیا...... یہ "ابن اللہ" کا لفظ یقینی طور پر ذاتی ابنیت کی طرف ایک اشارہ اپنے اندر رکھتا ہے جسے پال نے دوسری جگہ یسوع کو "خدا کا بیٹا" کہہ کر صاف کر دیا ہے۔ اس امر کا فیصلہ اب نہیں کیا جا سکتا کہ آیا وہ ابتدائی عیسائیوں کا گروہ تھا یا پال تھا جس نے مسیح کے لئے لفظ "خداوند" کا خطاب اصل مذہبی معنی میں استعمال کیا۔ شاید یہ فعل مقدم الذکر گروہ ہی کا ہو۔ لیکن بلاشبہ وہ پال تھا جس نے اس خطاب کو پورے معنی میں بولنا شروع کیا، پھر اپنے مدعا کو اس طرح اور بھی زیادہ واضح کر دیا کہ "خداوند یسوع مسیح" کی طرف بہت سے وہ تصورات اور اصطلاحی الفاظ منتقل کر دیئے جو قدیم کتب مقدسہ میں خداوند یہوہ (اللہ تعالےٰ) کے لئے مخصوص تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مسیح کو خدا کی دانش اور خدا کی عظمت کے مساوی قرار دیا اور اسے مطلق معنی میں خدا کا بیٹا ٹھیرایا۔ تاہم متعدد حیثیات اور پہلوؤں سے مسیح کو خدا کے برابر کر دینے کے باوجود پال اس کو قطعی طور پر اللہ کہنے سے باز رہا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ایک دوسرے مضمون "مسیحیت" میں ریورنڈ جارج ولیم ناکس مسیحی کلیسا کے بنیادی عقیدے پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

عقیدہ تثلیث کا فکری سانچہ یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ہمارے لئے ایک عجیب قسم کا مرکب ہے۔ مذہبی خیالات بائیبل کے اور ڈھلے ہوئے ایک اجنبی فلسفے کی صورتوں میں۔

باپ، بیٹا اور روح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں۔ آخری اصطلاح اگرچہ خود یسوع نے شاذ و نادر ہی کبھی استعمال کی تھی اور پال نے بھی جو اس کو استعمال کیا اس کا مفہوم بالکل غیر واضح تھا، تاہم یہودی لٹریچر میں یہ لفظ شخصیت اختیار کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پس اس

عقیدہ کا مواد یہودی ہے (اگرچہ اس مرکب میں شامل ہونے سے پہلے وہ بھی یونانی اثرات سے مغلوب ہو چکا تھا) اور مسئلہ خالص یونانی۔ اصل سوال جس پر یہ عقیدہ بنا، وہ نہ کوئی اخلاقی سوال تھا نہ مذہبی بلکہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا، یعنی یہ کہ ان تینوں اقانیم (باپ بیٹے اور روح) کے درمیان تعلق کی حقیقت کیا ہے؟ کلیسا نے اس کا جو جواب دیا وہ اس عقیدہ میں درج ہے جو نیقیا کی کونسل میں مقرر کیا گیا تھا، اور اسے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام خصوصیات میں بالکل یونانی فکر کا نمونہ ہے۔

اسی سلسلہ میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے ایک دوسرے مضمون تاریخ کلیسا (CHURCH HISTORY) کی یہ عبارت بھی قابلِ ملاحظہ ہے۔

تیسری صدی عیسوی کے خاتمہ سے پہلے مسیح کو عام طور پر "کلام" کا جسدی ظہور تو مان لیا گیا تھا تاہم بکثرت عیسائی ایسے تھے جو مسیح کی الوہیت کے قائل نہ تھے۔ چوتھی صدی میں اس مسئلہ پر سخت بحثیں چھڑی ہوئی تھیں جن سے کلیسا کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ آخر کار ۳۲۵ء میں نیقیہ کی کونسل نے الوہیت مسیح کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتب کر دیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی کچھ مدت تک جھگڑا چلتا رہا لیکن آخری فتح نیقیہ ہی کے فیصلے کی ہوئی جسے مشرق اور مغرب میں اس حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا کہ صحیح العقیدہ عیسائیوں کا ایمان اسی پر ہونا چاہیئے۔ بیٹے کی الوہیت کے ساتھ روح کی الوہیت بھی تسلیم کی گئی اور اسے اصطباغ کے کلمہ اور رائج الوقت شعائر میں باپ اور بیٹے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس طرح نیقیہ میں مسیح کا جو تصور قائم کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدۂ تثلیث اصل مسیحی مذہب کا ایک جزءِ لاینفک قرار پا گیا۔

پھر اس دعوے پر کہ "بیٹے کی الوہیت مسیح کی ذات میں مجسم ہوئی تھی" ایک دوسرا مسئلہ پیدا ہوا جس پر چوتھی صدی میں اور اس کے بعد بھی مدتوں تک بحث و مناظرہ کا سلسلہ جاری رہا۔

مسئلہ یہ تھا کہ مسیح کی شخصیت میں الوہیت اور انسانیت کے درمیان کیا تعلق ہے؟ ۴۵۱ء میں لیڈن کی کونسل نے اس کا یہ تصفیہ کیا کہ مسیح کی ذات میں دو مکمل طبیعتیں مجتمع ہیں، ایک الٰہی طبیعت دوسری انسانی طبیعت اور دونوں متحد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جداگانہ خصوصیات بلا کسی تغیر و تبدل کے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ تیسری کونسل میں جو ۶۸۰ء میں بمقام قسطنطنیہ منعقد ہوئی، اس میں اتنا اور اضافہ کیا گیا کہ یہ دونوں طبیعتیں اپنی الگ الگ خواہشیں بھی رکھتی ہیں، یعنی مسیح بیک وقت دو مختلف حیثیتوں کا حامل

ہے....... اسی دوران میں مغربی کلیسا نے گناہ اور فضل و کرم کے مسئلہ پر خاص توجہ کی اور یہ سوال مدتوں زیر بحث رہا کہ نجات کے معاملہ میں خدا کا کام کیا ہے اور بندے کا کام کیا۔ آخر کار ۵۲۹ء میں اورینج کی دوسری کونسل میں .... یہ نظریہ اختیار کیا گیا کہ ہبوطِ آدم کی وجہ سے ہر انسان اس حالت میں مبتلا ہے کہ وہ نجات کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھا سکتا۔ جب تک وہ اس فضل خداوندی سے، جو اصطباغ میں عطا کیا جاتا ہے، نئی زندگی نہ حاصل کرے، اور یہ نئی زندگی شروع کرنے کے بعد بھی اسے حالتِ خیر میں استمرار نصیب نہیں ہو سکتا۔ جب تک فضلِ خداوندی دائماً اس کا مددگار نہ رہے، اور فضلِ خداوندی کی یہ دائمی اعانت اسے صرف کیتھولک کلیسا ہی کے توسط سے حاصل رہ سکتی ہے۔

اور انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا میں مذکور ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ کنواری سے پیدا ہونے کا عقیدہ بھی کفارہ کے دائرہ میں لے جاتا ہے۔

کفارہ کا عقیدہ

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ ابنیت، اور الوہیت وغیرہ کے عقائد درحقیقت بنیاد ہیں کفارہ کے عقیدہ کی۔ اور کفارہ کی بنیاد یہ ہے کہ ہر بچہ (ہبوطِ آدم کی وجہ سے) فطرتاً گناہگار پیدا ہوتا ہے اور اس کی فطرت کی یہ خباثتِ ازلی کسی عمل سے دُھل نہیں سکتی۔ اس کے لئے یہ ایمان ضروری ہے کہ خدا بشکلِ مسیح دنیا میں آیا اور اس نے انسانوں کی نجات کے لئے اپنے آپ کو صلیب پر لٹکوایا۔ یوں اس کی قربانی، نوعِ انسانی کے گناہوں کا کفارہ بن گئی۔ اس عقیدہ کی رو سے ہر انسانی بچہ کی فطرت کو گناہگار تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ عیسائی اس عقیدہ کا ماخذ خود حضرت مسیحؑ کو قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجز اینڈ ایتھکس کا مضمون نگار لکھتا ہے کہ

کئی بالواسطہ طریقوں سے (حضرت) مسیح بھی انسانی قلب کے فطری طور پر گناہگار ہونے کو تسلیم کرتے ہیں۔

بڑے بڑے نامور عیسائی مصنفین اس عقیدہ کی اہمیت اور صداقت کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں مسٹر (T.S. ELIOT) اپنی کتاب (After Strange Gods) میں لکھتا ہے۔

میرے نزدیک "نظری گناہ" کا عقیدہ ایک عظیم الشان حقیقت ہے۔

ایک بہت بڑا عیسائی مشنری (DOOLITTLE) چین گیا اور وہاں برسوں تک عیسائیت کی تعلیم کی تبلیغ کرتا رہا۔ لیکن ان سے فطرتِ انسانی کی ازلی خباثت کے عقیدہ کو منوا نہ سکا۔ چنانچہ وہ اہلِ چین کی اس "جہالت" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ یہ بدبخت مخلوق بائبل کے اس عقیدہ کی معقولیت اور صداقت کو تسلیم نہیں کرتی۔
(The Social Life of Chinese)

پادری صاحب کو تعجب تھا کہ چین کے "جہلا" ایسی معقول تعلیم کی صداقت کو نہیں مانتے۔ لیکن انھیں کیا معلوم تھا کہ چار ہی روز بعد، خود ان کے اپنے ہاں کے ارباب دانش و بینش بھی اس کی "معقولیت" سے انکار کر بیٹھیں گے۔ چنانچہ (R.F. Jonmston) اپنی کتاب (Confucianism and modern china) میں (Westminster confession) کے حوالے سے لکھتا ہے۔

> ازلی گناہ کا عقیدہ درحقیقت "ازلی خرابی" ہے جس کی وجہ سے ہم ہر قسم کے خیر سے بیزار اور ہر قسم کے شر کی طرف مائل رہتے ہیں۔

سر ہنری جونس اپنی کتاب (A Fith that EnQoires) میں اس عقیدہ کی تردید و تکذیب کے بعد فطرت انسانی کے نیک ہونے کے عقیدہ کا اعلان کرتا ہے۔
(SIR JAMES IRVINE) نے سینٹ اینڈریوز کے گرجے میں ایک بصیرت افروز تقریر کے دوران میں کہا کہ

> جو چیز میرے دل میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت لئے ہوئے ہے وہ یہ ہے کہ میرے تجربے نے میرے اس احساس کو اور بھی زیادہ شدید کر دیا ہے کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے نیک ہے۔

(Times London, Dated 20-1-1933)

مشہور عالم نفسیات (William Mc Dougall) اپنی کتاب (Character And the Conduct of Life) میں لکھتا ہے۔

> اب دور حاضر کے بچے کی عزت نفس کو شروع ہی سے اس عقیدہ سے ٹھیس نہیں لگائی جاتی کہ وہ فطرتاً بد واقع ہوا ہے بلکہ اب اس کی تربیت اس کلیہ کے ماتحت عمل میں آتی ہے کہ وہ فطرتاً نیک ہے اور وہ ایک مہذب اور شستہ ماحول میں یقیناً نیکی، سچائی اور حسن کا متلاشی ہو گا۔ یہ یقیناً فوز عظیم ہے۔

مسٹر (A.E. TAYLOR) لکھتا ہے کہ "یہ عقیدہ ایک بطلان ہے۔" اور

> میں کسی ایسے سائنٹفک اور خدا کی طرف دعوت دینے والے مذہب کا استقبال کروں گا جو ہمیں فطرت انسانی پر ایسی مضحکہ انگیز تہمت پر ایمان رکھنے کی ضرورت سے بچا لے۔

(Mind- July 1912)

غور کیا آپ نے کہ دنیائے عیسائیت کے یہ اراکین و عمائد اپنے ان غیر فطری عقائد سے تنگ آکر فطرت کی صحیح تعلیم کے لئے کس طرح مضطرب اور بے قرار ہیں؟ مسٹر ٹیلر کسی ایسے مذہب کی تلاش میں دیوانہ وار پھر رہے ہیں جو خدا کی وحدانیت اور فطرت انسانی کے خیر ہونے کی تعلیم دے۔ اور تعلیم بھی علیٰ وجہ البصیرت دے۔ اے کاش! کہیں مسٹر ٹیلر کے سامنے قرآن کریم ہوتا تو اسے اس حسرت و حرماں نصیبی سے یوں مضطرب و حیران نہ ہونا پڑتا۔ وہ قرآن جس کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا گیا ہے (۹۵/۴) اور اسے عزت و تکریم عطا کی گئی ہے (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ ۱۷/۷۰)۔ اور جس نے برملا کہہ دیا کہ اس کی نجات و سعادت اور شقاوت و بدبختی کا فیصلہ یکسر اس کے اپنے اعمال پر ہے (لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى ۵۳/۳۹) اور آدم (یا کسی اور) کا گناہ کسی دوسرے پر اثر انداز نہیں ہو سکتا (لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى ۵۳/۳۸) اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ ہماری دعوت علیٰ وجہ البصیرت دعوت ہے (اُدْعُوْا إِلَى اللهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ ۱۲/۱۰۸) یہ حقائق اگر مسٹر ٹیلر کے سامنے ہوتے تو اسے معلوم ہو جاتا کہ اُسے جس چشمۂ زندگی کی تلاش ہے وہ کہاں مل سکتا ہے؛ لیکن یہ حقائق ان لوگوں کے سامنے ہیں یا نہیں۔ غور طلب چیز تو یہ ہے کہ دنیا کس طرح کشاں کشاں۔ طوعاً و کرہاً (اپنے غلط معتقدات و تصورات کو چھوڑ کر) اسلام کی تعلیم کی طرف بڑھے چلی آرہی ہے۔ (تفصیل اس کی ابلیس و آدم میں وحی کے عنوان میں ملاحظہ فرمائیے) عیسائیت کا سارا مدار اس عقیدہ پر ہے کہ انسان فطری طور پر گناہوں سے ملوث ہے اور اب دنیا علیٰ وجہ البصیرت اس عقیدہ کا بطلان کر رہی ہے اور یہ سب قرآن کی تعلیم کی بنا پر ہے جو شعوری اور غیر شعوری طور پر ذہنوں کو متاثر کئے جا رہی ہے۔ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ۔

ایک اور آیت واقعۂ تصلیب سے متعلق سورۂ نساء کی حسب ذیل آیات پر ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈالئے۔

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۙ بَلْ رَّفَعَهُ اللهُ إِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۝ (۴/۱۵۷-۱۵۹)

ان آیات کا عام ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔

اور (نیز) ان کا یہ کہنا کہ ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو جو خدا کے رسول رہنے کا دعویٰ کرتے تھے سولی پر چڑھا کر قتل کر ڈالا۔ حالانکہ (واقعہ یہ ہے کہ) نہ تو انھوں نے قتل کیا، اور نہ سولی پر چڑھا کر ہلاک کیا۔ بلکہ حقیقت ان پر مشتبہ ہو گئی۔ اور جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا تو بلاشبہ وہ اس کی نسبت شک و شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس بارے میں ان کے پاس کوئی یقینی بات نہیں ہے، بجز اس کے کہ ظن و گمان کے پیچھے جائیں اور یقیناً انھوں نے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف بلند کر لیا، اور اللہ سب پر غالب رہنے والا، اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے۔

اور (دیکھو) اہل کتاب میں سے کوئی نہ ہوگا، جو اپنی موت سے پہلے اس پر ضرور ہی یقین نہ لے آئے اور قیامت کے دن وہ (اللہ کے حضور) ان پر شہادت دینے والا ہوگا۔

ان میں سے آیات ۱۵۸ – ۱۵۷ کی تشریح تو پہلے گذر چکی ہے۔ آیت ۱۵۹ غور طلب ہے۔ یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ یہودی اور عیسائی دونوں اس بات پر متفق تھے کہ حضرت عیسیٰؑ کی موت صلیب پر واقع ہو چکی ہے۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کی اور واضح الفاظ میں فرمادیا کہ یہ قطعاً غلط ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ "اہل کتاب میں سے کوئی نہیں ہوگا جو اپنی موت سے قبل اس (حقیقت) پر یقین نہ لے آئے"۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد نزول قرآن سے لے کر قیامت تک کے تمام اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) نہیں ہو سکتے اس لئے کہ یہ چیز خلاف مشاہدہ ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس سے مراد وہ یہود و نصاریٰ ہیں جو نزول آیت کے وقت مخاطب تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے بیشتر وہ تھے جو بعد میں مسلمان ہو گئے اور وہ حضرت مسیحؑ کے متعلق اس صداقت پر ایمان لے آئے جو قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے، لیکن ایسے یہود و نصاریٰ بھی تو تھے جو مسلمان نہیں ہوئے اس لئے یہ قیاس بھی درست نہیں۔

بعض حضرات اس سے مفہوم یہ لیتے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ آسمان سے نازل ہوں گے تو اس وقت تمام اہل کتاب ان کی (حضرت مسیحؑ کی) موت سے پیشتر ان پر ایمان لے آئیں گے۔ لیکن یہ مفہوم (جیسا کہ تصریحات سابقہ سے ظاہر ہے) دور از کار ہے۔ اس لئے کہ جب نزول حضرت عیسیٰؑ کا کوئی ذکر قرآن کریم میں نہیں تو یہ خیال اپنی طرف سے بڑھا کر دیگر آیات کا مفہوم اس کے مطابق متعین کرنا قرآن فہمی نہیں۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس آیت میں "اہل الکتاب" سے مراد صرف عیسائی ہیں۔ عیسائی اپنے مرنے سے پہلے، حضرت مسیحؑ کے کفارہ کا اقرار کرتے ہیں اور اسی سے ان کی نجات ہوتی ہے۔ (بلکہ پادری آکر ان سے اس امر کا اقرار لیتا ہے) کفارہ کے معنی یہ ہیں کہ حضرت مسیح نے اپنے ماننے والوں کے گناہوں کا کفارہ، صلیب پر

جان دے کر دیا۔ یعنی ہر عیسائی مرنے سے پہلے حضرت مسیحؑ کے صلیب پر جان دینے کا اقرار کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ واقعہ یہ ہے کہ خود عیسائیوں کو بھی یقینی طور پر پتہ نہیں کہ صلیب کا واقعہ کیا تھا اور جسے صلیب پر چڑھایا گیا تھا وہ حضرت مسیح ہی تھے یا کوئی اور۔ لیکن اس کے باوجود اب، ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اس بات پر کہ فی الواقعہ حضرت مسیحؑ ہی کو صلیب دی گئی تھی، اس قدر محکم ایمان رکھتے ہیں کہ جب تک مرنے سے پہلے اس ایمان کو دُہرا نہ لیں، اپنی بخشش کا یقین نہیں کرتے۔ جب یہ اپنی بخشش کے لئے خدا کے سامنے جائیں گے تو اس وقت حضرت مسیح ان کے خلاف شہادت دیں گے (کہ انھوں نے یہ عقیدہ کیسے وضع کر لیا تھا؟)

دشمن سے محبت یا عدل؟

ایک چھوٹی سی بات اور بھی۔ انجیل کی تعلیم (منسوب الیٰ حضرت عیسیٰؑ) یہ ہے کہ "دشمن سے محبت کرو"۔ (متی ۵/۴۴) یہ تعلیم بڑی خوش آیند اور بنگاہ فریب نظر آتی ہے۔ لیکن ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے کہ انسان سے اس کا تقاضا کس طرح درست ہے؟ کیا یہ کسی دھڑکنے والے دل سے ممکن بھی ہے کہ وہ اپنے دشمن سے محبت کرے۔ محبت ایک لطیف جذبہ ہے جس کا سرچشمہ ہم آہنگی و یگانگت ہے۔ عداوت اور محبت ایسے متضاد و متباین جذبات کا نام ہے جن میں کسی صورت میں بھی ہم آہنگی و یگانگت پیدا نہیں ہو سکتی۔ چونکہ یہ مطالبہ انسانی جذبات کے خلاف ہے اس لئے تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ کسی نے دشمن سے محبت کی ہو۔ خود حضرت مسیح کی تعلیم کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں انھوں نے صاف صاف کہدیا کہ میں دنیا میں صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ باپ کو بیٹے سے اور ماں کو بیٹی سے جُدا کرانے۔ ظاہر ہے کہ یہ قطع و برید بنا بر عداوت ہی ہو گی نہ کہ محبت کا نتیجہ۔ (ذاتی عداوت و محبت نہیں بلکہ اصولی فرق کے مطابق)

اس کے برعکس دیکھئے قرآن کریم نے دشمن کے متعلق جو تعلیم پیش کی ہے وہ کس قدر شرف انسانیت پر مبنی اور ممکن العمل ہے۔ فرمایا

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا (۵/۸)

اور (دیکھو) ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی تمھیں اس بات کے لئے اُبھار دے کہ (اس کے ساتھ) انصاف نہ کرو۔

غور کیجئے دشمن سے عدل کرنا ناممکن نہیں محبت کرنا ناممکن ہے۔ "دشمن سے بھی انصاف کرو" کس قدر بلند اصول ہے اور کیسا ممکن العمل! اس باب میں مشہور عالم اجتماعیات (William A. Brend) اپنی کتاب (Foundations of Human conflicts) میں لکھتا ہے کہ "انجیل کا

یہ حکم کہ دشمن سے بھی محبت کرو ایک ایسا مطالبہ ہے جو نفسیاتی ناممکنات میں سے ہے۔ (صفحہ ۳۰)

حضرت عیسیٰ کا تذکار جلیلہ اور اُس کے تضمنات ختم ہو گئے۔ یہاں ہم نے دیکھ لیا کہ یہودیوں کے بعد عیسائیوں کو اُن کا جانشین بنایا گیا۔ لیکن انھوں نے بہت جلد توحید کو چھوڑ کر اس قدر مشرکانہ عقائد اپنے ہاں داخل کر لئے کہ

یوم الحسرت

یہ کسی طرح بھی انعاماتِ الٰہیہ کی وراثت کے مستحق نہ رہے۔ اس لئے خدا کے غیر متبدل قانون کی رُو سے یہ انعامات اُن سے چھین کر اس جماعت کے حوالے کر دیئے گئے جنھیں اللہ نے وراثتِ کتاب کے لئے منتخب کیا تھا۔ یہ انقلاب کس طرح رونما ہو؟ اس کی تفصیل معراج انسانیت میں ملے گی۔ یہاں صرف ایک اشارہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ سورۂ مریم میں ہے۔

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۱۹/۳۵-۳۸)

اللہ کے لئے یہ بات نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنا لے۔ وہ اس سے بہت بلند ہے اُس کی شان تو یہ ہے کہ جب کوئی کام کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے، تو بس حکم کرتا ہے کہ ہو جا! اور اس کا حکم کرنا ہی ہو جانا ہے!

اور (مسیح کی تو ساری پکار یہ تھی:) بلاشبہ اللہ ہی میرا اور تمھارا، سب کا پروردگار ہے۔ پس اُسی کی اطاعت و محکومیت اختیار کرو۔ یہی (سچائی کا) سیدھا راستہ ہے!

مگر پھر اس کے بعد مختلف فرقے آپس میں اختلاف کرنے لگے۔ تو جن لوگوں نے حقیقت حال سے انکار کیا، ان کی حالت پر افسوس! اُس دن کے منظر پر افسوس جو آنے والا ہے، (اور جو) بڑا ہی سخت دن ہو گا!

جس دن یہ ہمارے حضور حاضر ہوں گے، اُس دن ان کے کان کیسے سننے والے اور اُن کی آنکھیں کیسی دیکھنے والی ہوں گی! لیکن آج کے دن ان ظالموں کا کیا حال ہے؟ آشکارا گمراہی میں کھوئے ہوئے۔

اس کے بعد ارشاد ہے۔

وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (۱۹/۳۹)

اور (اے پیغمبر!) انھیں اُس (آنے والے) دن سے بھی خبردار کر دے جو بڑا ہی پچھتانے کا دن ہوگا اور جب ساری باتوں کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اس وقت تو یہ لوگ غفلت میں پڑے ہیں اور اس بات پر یقین لانے والے نہیں۔

یہ یوم الحسرت کونسا تھا؟ وہ دن جب بیت المقدس کی کنجیاں عیسائی احبار و رہبان کے ہاتھوں سے اور ان کا تخت و تاج قیصر (ہرقل) کے قبضہ سے نکل کر عربوں کی اونٹ چرانے والی صحرانشین قوم کے سپرد کیا گیا کہ وراثتِ ارض کا فیصلہ اللہ کے قانونِ مشیت کے تابع ہوتا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَ مَنْ عَلَيْهَا وَ اِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ۝ (۱۹/۴۰)

ہم ہی زمین کے وارث ہیں اور اُن تمام لوگوں کے بھی جو زمین پر بسے ہوئے ہیں، اور ہماری ہی طرف سب کو لوٹنا ہے۔

ہم "ابلیس و آدم" باب "رسالت" میں دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے ہر رسول کو کتاب عطا فرمائی، اس لئے کہ پیغام کے بغیر پیغامبر (رسول) کا مقصد ہی کچھ نہیں۔ لیکن جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر رسول کا تذکرہ نہیں کیا اسی طرح قرآن کریم میں ہر کتاب کا نام بھی درج نہیں کیا۔ اس سے قبل زبور اور توراۃ کا ذکر آچکا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ پر جو کتاب نازل کی گئی تھی اس کا نام انجیل ہے۔

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَ قَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۝ (۵۷/۲۷)

پھر دیکھو (اُن نبیوں کے بعد) ہم نے انہی کے نقشِ قدم پر اپنے رسولوں کو یکے بعد دیگرے بھیجا۔ اور اُن کے بعد (پھر) مریم کے بیٹے عیسیٰ (جیسے جلیل القدر پیغمبر) کو بھیجا اور اسے انجیل عطا فرمائی۔

نور و ہدایت

وہ انجیل جس میں نور و ہدایت تھی۔

وَ قَفَّیْنَا عَلٰۤی اٰثَارِہِمْ بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ التَّوْرٰىۃِ ۪ وَ اٰتَیْنٰہُ الْاِنْجِیْلَ فِیْہِ ہُدًی وَّ نُوْرٌ ۙ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ التَّوْرٰىۃِ وَ ہُدًی وَّمَوْعِظَۃً لِّلْمُتَّقِیْنَ ۝ (۵/۴۶)

اور پھر (اُن نبیوں کے پیچھے) اُنہی کے نقش قدم پر ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو چلایا تورات کی تصدیق کرتا ہوا، جو اُس کے سامنے موجود تھی۔ اور ہم نے اسے انجیل دی جس میں ہدایت اور روشنی تھی اور تورات کی جو پہلے سے موجود تھی (سرتاسر) تصدیق تھی۔ نیز متقی انسانوں پر (سعادت کی) راہ کھولنے والی اور اپنی تعلیم میں یکسر) پند و نصیحت!

کیا دنیا میں کوئی اور مذہب بھی ہے جو "دوسرے" مذاہب کی کتب مقدسہ کا ذکر اس توصیف و ستائش سے کرے؟ یہ کتاب (انجیل) خود اللہ تعالیٰ نے سکھائی تھی۔

وَ یُعَلِّمُہُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ وَ التَّوْرٰىۃَ وَ الْاِنْجِیْلَ ۝ (۳/۴۸)

اور (اے مریم!) اللہ اُس (ہونے والے لڑکے) کو کتاب اور حکمت کا علم عطا فرمائے گا۔ نیز توریت و انجیل کا۔

اسی کا اعلان حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا۔

اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ اذْکُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْکَ وَ عَلٰی وَالِدَتِکَ ۘ اِذْ اَیَّدْتُّکَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۟ تُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَہْدِ وَ کَہْلًا ۚ وَ اِذْ عَلَّمْتُکَ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ وَ التَّوْرٰىۃَ وَ الْاِنْجِیْلَ (۵/۱۱۰)

اُس دن اللہ کہے گا "اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! میں نے تم پر اور تمہاری ماں پر جو انعام کئے ہیں انھیں یاد کرو!

جب ایسا ہوا تھا کہ میں نے روح القدس سے تمھیں قوت دی تھی۔ تم لوگوں سے کلام کرتے تھے۔ چھوٹی عمر میں بھی اور بڑی عمر میں بھی اور جب ایسا ہوا تھا کہ میں نے تمھیں کتاب و حکمت اور توریت و انجیل سکھا دی تھی۔

یہود و نصاریٰ کا دعوےٰ تھا کہ حضرت ابراہیم یہودی یا نصرانی تھے۔ قرآن کریم نے کہا کہ تورات و انجیل تو حضرت ابراہیم کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ پھر آپ ان کے تبع کیسے ہوسکتے ہیں؟

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (۳/۶۵)

اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو (کہ اُن کا طریقہ یہودیت کا طریقہ تھا یا نصرانیت کا طریقہ تھا) حالانکہ تورات و انجیل (جن کے نام پر یہ گروہ بندیاں کی گئی ہیں) نازل نہیں ہوئی ہیں۔ مگر اس کے بہت بعد (پس ظاہر ہے کہ جس گروہ بندی کا اُس وقت وجود ہی نہ تھا، وہ کیونکر اُس کا پیرو ہو سکتا ہے؟) کیا (اتنی موٹی سی بات بھی) تم نہیں سمجھ سکتے؟

اصلی تورات و انجیل میں جہاد و سرفروشی کی وہی تعلیم تھی جو قرآن کریم میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (۹/۱۱۱)

بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے اُن کی جانیں بھی خرید لیں، اور اُن کا مال بھی۔ اور اس قیمت پر خرید لیں کہ اُن کے لئے بہشت (جاودانی زندگی) ہو۔ وہ (کسی دنیوی مقصد کی راہ میں نہیں بلکہ) اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ یہ وعدہ اللہ کے ذمہ ہو چکا (یعنی اس نے ایسا ہی قانون ٹھہرا دیا) تورات، انجیل، قرآن (تینوں کتابوں) میں (یکساں طور پر) اس کا اعلان ہے۔ اور اللہ سے بڑھ کر کون ہے جو اپنا عہد پورا کرنے والا ہو؟ پس (مسلمانو!) اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ سے چکایا، خوشیاں مناؤ، اور یہی ہے جو بڑی سے بڑی فیروزمندی ہے!

حتیٰ کہ اُن میں نبی اکرمؐ کے مقدس رفقا کا تذکرہ بھی تھا کہ وہ کس طرح خدا کی بادشاہت کو زمین پر قائم کریں گے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚۖ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ○ (۲۶/۲۹)

اللہ کا رسول محمدؐ! اور جو لوگ اُس کے ساتھ (تبلیغ و اشاعتِ دین میں اُس کے مددگار اور دست و بازو) ہیں وہ منکرینِ حق کے مقابلہ میں بڑے ہی سخت اور آپس میں بہت ہی رحمدل ہیں (اے مخاطب!) تو اُنہیں (خدا کے حضور میں) رکوع اور سجدے کرتا ہوا پائے گا۔ وہ لوگ (ہر دم) اللہ کے فضل اور خوشنودی کے طلبگار رہتے ہیں۔ سجدہ کے اثر کی وجہ سے اُس کی نشانیاں اُن کے چہروں پر ثبت ہیں۔ اُن کی یہی مثال تورات میں بیان کی گئی ہے۔ اور یہی مثال انجیل میں بھی! بالکل کھیتی کی طرح جو اوّلاً اپنی سوئی نکالتی ہے۔ پھر اسے مضبوط کرتی ہے۔ چنانچہ وہ موٹی ہوتی جاتی ہے اور پھر اپنی نالوں پر سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے۔ کھیتی کرنے والوں کو (اس کی یہ کیفیت) بڑی ہی پسند آتی ہے (کیونکہ یہ وقت اُن کی محنت و مشقت کے ثمرات حاصل کرنے کا ہوتا ہے۔)
لیکن ان حقائق سے انکار کرنے والوں کے دل اس سے جل بھن جاتے ہیں۔ اللہ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور اُن میں سے جن لوگوں نے نیک کام کئے ہیں مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔

محرّف انجیل لیکن یہ سب کچھ اس انجیل میں تھا جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تھی نہ کہ اس میں جسے انسانی ہاتھوں نے بُری طرح سے محرّف کر ڈالا۔ حتیٰ کہ آج جن کتابوں کو اناجیل کے نام سے پیش کیا جاتا ہے (خود عیسائی محققین کو اعتراف ہے کہ اُن کی اصلیت کا کچھ علم نہیں) انجیل کی تاریخ اور عیسائیوں کے اعترافات کی تفصیل معراجِ انسانیت میں ملے گی)، بہر حال نزولِ قرآن کے وقت عیسائیوں کی یہ حالت تھی کہ وہ حقیقی انجیل کو بالکل چھوڑ چکے تھے (کہ اس کے وجود کا کہیں بھی پتہ نہ تھا)۔ انجیل کی تعلیم قرآن میں آچکی تھی لیکن وہ اس کا، ضد اور تعصب کی بنا پر انکار کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اللہ کے انعام و اکرام سے یکسر محروم ہو گئے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَاۗءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ○ (۵/۶۶)

اور اگر وہ تورات اور انجیل کو اور جو کچھ اُن کے پروردگار سے اُن پر نازل ہوتا ہے، (راست بازی کے ساتھ)، قائم رکھتے، تو ضرور ایسا ہوتا کہ اُن کے اوپر سے بھی (کہ آسمان ہے) اور

اُن کے قدموں کے نیچے سے بھی (کہ زمین ہے) اُنھیں برکت ملتی، لیکن اُنھوں نے تورات و انجیل کی تعلیم ضائع کر دی) ان میں سے ایک گروہ ضرور میانہ رو ہے. لیکن زیادہ تر ایسے ہی ہیں کہ جو کچھ کرتے ہیں بُرائی ہی بُرائی ہے۔

نزولِ قرآن کے وقت نصاریٰ کی کیا حالت تھی اس کا تذکرہ اپنے مقام پر آئے گا۔

خلاصہ مبحث انبیائے بنی اسرائیل میں حضرت عیسیٰؑ نمایاں خصوصیت کے حامل ہیں۔ آپ کی حیاتِ طیبہ باعتبار زمانہ ایسی مختصر کہ گویا ایک شعلۂ مستعجل۔ خود اناجیل سے بھی، جو درحقیقت (اپنی موجودہ شکل میں آپ کی سیرت کی کتابیں ہیں)، آپ کی زندگی کے آخری ڈیڑھ دو سال سے زیادہ کے حالات نہیں ملتے۔ لیکن باعتبار اثر و نتائج ایک طرف ایسی ہمہ رس کہ بنی اسرائیل جیسی قوم کی ہلاکت و بربادی کے خلاف خدا کی آخری حجت اور دوسری طرف ایسی ہمہ گیر کہ تھوڑے سے عرصہ میں نوعِ انسانی کے ایک کثیر حصّہ کے قلوب و اذہان پر چھا جانے والی۔ پھر اس ڈیڑھ دو سال کے کوائف حیات بھی معتقدین اور مخالفین کے افراط و تفریط کے گہوارہ میں اس طرح جنہاں کہ اگر قرآن کریم کا مرکزِ ثقل سامنے نہ آتا تو چشمِ تحقیق آپ کے صحیح مقام سے کبھی آشنا نہ ہو سکتی۔ قوم بنی اسرائیل اپنے عروج و اقبال کی انتہائی بلندیوں سے زوال و انحطاط کی آخری پستیوں میں گر چکی تھی۔ دنیاوی اعتبار سے رومیوں کے شکنجۂ استبداد میں جکڑی ہوئی اور دینی اعتبار سے خدا کی جگہ انسانوں (یعنی احبار و رہبان) کے خود ساختہ قوانین کی غیر فطری زنجیروں میں گرفتار۔ ایسے میں حضرت عیسیٰؑ ایک انقلاب آفریں پیغام لے کر آئے تاکہ اس شوریدہ بخت قوم کو جسمانی اور روحانی ہر طرح کی غلامی سے نجات دلا کر ایک خدا کی چوکھٹ پر جھکنے کے آئین سکھائیں۔ جس سے اُن کی ذلتیں، عظمتوں میں اور پستیاں سرفرازیوں میں بدل جائیں۔ لیکن معلوم ہوا کہ مرض لاعلاج ہو چکا تھا۔ اور مریض اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں دوائی سے چڑھ اور طبیبِ مشفق سے عداوت پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ اس بدقسمت قوم کے علماء و مشایخ نے محض اپنی سیادت و قیادت قائم رکھنے کے لئے نہ صرف آپؑ کے پیغام حیات بخش کی مخالفت کی بلکہ آپ کے خلاف سازش کر کے آپؑ کی جان کے دشمن ہو گئے۔ وہ ان مشئوم تدابیر میں مصروف تھے۔ اور آسمان خود ان کے انجام و عواقب پر ہنس رہا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ اُن کی دست بُرد سے محفوظ رکھے گئے۔ باقی رہی آپ کی حواریوں کی جماعت سو اُس کی تسکین کا سامان آپ نے یہ مژدہ سُنا کر بہم پہنچا دیا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آپؑ کے بعد وہ نبی آخر الزماںؐ آئے گا جو آپ کے (بلکہ تمام انبیائے سابقہ علیہم السلام) کے پیغام کی تکمیل کر دے گا۔ یہودی خوش تھے کہ انھیں بہت بڑی "کامیابی"

حاصل ہوئی ہے۔ لیکن زمانہ کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ اُن کی یہ خوشی درحقیقت چراغ کا وہ خندۂ سحری تھا جس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے گل ہو جاتا ہے۔ شجر ابراہیمیؑ کی یہ شاخِ فلسطینی جس نے تر و تازگی کی صلاحیت اپنے اندر سے کھو دی تھی، یوں خشک ہو کر رہ گئی کیونکہ خود حضرت ابراہیمؑ سے "لا ینال عہدی الظالمین" فرما دیا گیا تھا۔ اور اس کے بعد برگ و بار اس شاخِ حجازی کے حصہ میں آیا جس میں شادابی و شگفتگی کے عنوانات کھلکھلا کر ہنس رہے تھے کہ

قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

شاخِ اسماعیلی کی ان شادابیوں کا تذکرہ معراج انسانیت میں ملے گا۔

وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأْوُوا إِلَى الْكَهْفِ

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن

چو پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

اصحابِ کہف

سابقہ عنوان میں بتایا جا چکا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ان کے متبعین پر سخت آزمائش و ابتلاء کا دور آیا۔ معاندانہ قوتیں چاروں طرف سے سیلابِ بلا کی طرح ہجوم کر کے اُمنڈ آئیں۔ یہ دُنیا کی نگاہوں سے چھپے چھپے اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ حکومت کی سختیاں۔ یہودیوں کی دسیسہ کاریاں۔ کہیں پناہ کی جگہ نہ ملتی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بستیوں سے دُور جنگل اور ویرانوں میں کہیں چھپ چھپا کر زندگی کے دن بسر کریں۔ اس خلوت گزینی اور گوشہ نشینی نے رفتہ رفتہ منظم رہبانیت کی شکل اختیار کر لی۔ خانقاہیت (Monasticism) کے خطوط و آثار عیسائیت سے پہلے بھی موجود تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان عیسائیوں میں بعض ایسے بھی ہوں جن کے رگ و پے میں خانقاہیت کے جراثیم پہلے سے موجود ہوں۔ درمیان میں یہ جراثیم دب گئے اور اب جو فضا سازگار ملی تو انھوں نے پھر سے انگڑائیاں لینی شروع کر دیں۔ اس تصورِ زندگی نے آہستہ آہستہ ایک ایسی متعین صورت اختیار کر لی کہ اس کے قواعد و ضوابط مرتب ہونے لگے اور خانقاہیت ایک خاص شعارِ زندگی اور مسلکِ حیات قرار پا گئی۔

خانقاہیت

قرآن کریم نے جہاں یہود و نصاریٰ کے اور غلط معتقدات و رسومات کی تردید کی ہے وہاں اس حقیقت کو بھی بے نقاب کر دیا ہے کہ رہبانیت کی یہ زندگی حضرت مسیحؑ (یا کسی اور رسول) کی تعلیم نہ تھی جو منجانب اللہ لوگوں تک پہنچائی گئی ہو۔ بلکہ یہ ان لوگوں کا خود ساختہ مسلک تھا۔

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَ قَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَ جَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ رَهْبَانِيَّةَ ِۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ

اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ○ (۵۷ / ۲۷)

پھر اُن کے بعد ہم نے اُن ہی کے نقشِ قدم پر اپنے (دوسرے) رسولوں کو بھیجا اور اُنہی کے بعد ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ (جیسے جلیل القدر پیغمبر) کو بھیجا اور ہم نے اُسے انجیل عطا فرمائی اور اُن لوگوں کے دلوں میں جنھوں نے (صحیح معنی میں) انجیل کی پیروی کی رحمدلی اور مہربانی پیدا کر دی۔ اور (یہ) رہبانیت جسے ان لوگوں نے (از خود) گھڑ لیا ہے ہم نے اُن پر فرض نہیں کی تھی۔ ہم نے تو صرف اپنے قوانین سے ہم آہنگی فرض قرار دی تھی (مگر ان لوگوں نے از خود نئی نئی پابندیاں اپنے اوپر عائد کر لیں) چنانچہ کرنے کو تو یہ مسلک اختیار کر لیا لیکن یہ لوگ کما حقہٗ اسے نبھا نہ سکے۔ چنانچہ ہم نے ان لوگوں کو جو اُن میں سے (صحیح طور پر) ایمان لائے تھے ان کا اجر عطا کر دیا اور (ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں، ورنہ) اُن میں سے بہت سے فسق و فجور کی زندگی بسر کرنے والے ہیں۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، شروع شروع میں یہ زاویہ نشینی اور خلوت گزینی مستبد قوتوں کے جور و ستم سے بچنے کے لئے اختیار کی گئی تھی اس لئے ان غاروں اور نہ خانوں میں بڑے بڑے عمدہ گہر تابدار چمکتے نظر آتے تھے۔ لیکن جب اس نے ایک متعین رسم کی سی صورت اختیار کر لی تو یہی خانقاہیں ان تمام انسانیت سوز معائب و جرائم کے مرکز بن گئیں جن کے تصور سے حیا کی روح کانپ اُٹھے۔ قرآن کریم نے اس ابتدائی دور کی خلوت گزینی کا ایک واقعہ اپنے درخشندہ اوراق میں محفوظ کر لیا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ

قصۂ اصحابِ کہف

مستبد طاغوتی قوتیں اللہ کا نام لینے والوں پر کس طرح گوشۂ عافیت تنگ کر دیتی ہیں۔ لیکن بالآخر فلاح و فوز انہی کے ساتھ ہوتی ہے جو حق و استقامت پر جمے رہتے ہیں۔ یہ واقعہ اصحاب کہف یا اصحاب رقیم کے نام سے متعارف ہے اور سورۂ کہف میں مذکور۔ سرِ داستاں ان آیات سے سامنے آتا ہے۔

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ○ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ○ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۙ (۱۸ / ۹ - ۱۱)

(اے مخاطب!) کیا تو خیال کرتا ہے کہ غار اور رقیم والے ہماری نشانیوں میں سے کوئی عجیب نشانی تھے؟ (کوئی خارقِ عادت بات تھی؟ نہیں۔ بات ایسی نہیں تھی۔ بعد میں لوگوں نے اسے ایسا بنا دیا) جب ایسا ہوا تھا کہ چند جوان غار میں جا بیٹھے تھے اور اُنھوں نے دُعا کی تھی "پروردگار! تیرے

حضور سے ہم پر رحمت ہو اور تو ہمارے اس کام کے لئے کامیابی کا سامان ہیا کر دے "۔ پس غار میں کئی برسوں تک ہم نے اُن کے کان (دنیا کی طرف سے) بند کر رکھے۔

غور سے دیکھئے تو سارے قصّہ کا ملخص انہی چار آیات کے اندر جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ اس کے آگے اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ ہم قصّۂ اصحاب الحجر (جوئے نور) میں دیکھ چکے ہیں کہ حجر نبطی حکومت کا دارالسلطنت تھا، لیکن اس سے پیشتران کا دارالحکومت ایک اور شہر تھا جسے رقیم کہا جاتا تھا۔ جب رومیوں نے شام اور فلسطین کا علاقہ فتح کیا ہے تو اس شہر کو شہرت حاصل ہوئی لیکن رقیم کے نام سے نہیں بلکہ پیٹرا کے نام سے جسے عربوں نے اپنے ہاں بطرا کہہ کر پکارا۔ دورِ حاضرہ کی اثری تحقیقات نے اس شہر کے کھنڈرات کا سراغ لگالیا ہے۔ جہاں سے پرانے غاروں کے اندر خانقاہوں کے آثار ملے ہیں۔ یہ شہر اس شاہراہ پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتی تھی اس لئے نزولِ قرآن کے وقت عرب اصحاب کہف (غار والوں) یا اصحاب الرقیم (بطرا والوں) کے قصّہ سے آشنا تھے۔ لیکن انہی تفاصیل کے ساتھ جو لوگوں میں عام طور پر پھیل چکی تھیں۔ قرآن کریم نے انھیں " اصحاب الکھف والرقیم " کے نام سے پکار کر ان دونوں ناموں کی طرف اشارہ کر دیا جن سے یہ لوگ متعارف تھے۔

رقیم

اس واقعہ کی ابتداء یوں ہوتی ہے کہ چند نوجوان تھے جن کے دل میں حق پرستی کا جذبہ موجزن تھا۔ اور وہ معاشرہ میں صحیح آسمانی انقلاب لانا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ کوشش مفاد پرست اربابِ اقتدار کی سخت مخالفت کا موجب بنی ہوگی۔ چنانچہ وہ ان کے دستِ تظلّم و استبداد سے محفوظ رہنے کی خاطر بستی سے دور، کسی غار میں جا چھپے اور وہاں اپنے پروگرام کی تیاریوں میں مصروف رہے۔ اس دوران میں وہ باہر کی دنیا سے الگ تھلگ رہے۔ اس کے بعد جب باہر کی دنیا کے حالات مساعد ہوئے تو وہ پھر بستی کی طرف آئے اور انہوں نے آکر دیکھا کہ زمانہ نے باطل پرستی کا زیادہ عرصہ تک ساتھ نہیں دیا اور وہی حق پرستی جو بستیوں اور آبادیوں سے دھکیل کر نکال دی گئی تھی ان آبادیوں اور بستیوں پر غالب آچکی تھی۔

ان غار والوں کے متعلق عوام میں طرح طرح کے قصّے مشہور تھے (اور مسلکِ خانقاہیت کے اربابِ حلّ و عقد انھیں اور بھی بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہوں گے۔) قرآن نے رسول اللہ سے کہا کہ ہم تمھیں ان کی بابت ٹھیک ٹھیک بات بتلاتے ہیں۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۝ۖ وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖٓ

اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ٥ (۱۸/۱۳-۱۴)

(اے پیغمبر!) ہم ان لوگوں کی خبر ٹھیک ٹھیک تیرے آگے بیان کر دیتے ہیں۔ وہ چند نوجوان تھے جو نظامِ خداوندی پر ایمان لا چکے تھے اور ان پر اس کے قیام کی راہیں دُور تک کھل چکی تھیں۔ اور ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ جب (راہِ حق میں) کھڑے ہوئے تو انھوں نے (صاف صاف) کہہ دیا "ہمارا پروردگار تو وہی ہے جو آسمان و زمین کا پروردگار ہے۔ ہم اُس کے سوا کسی اور کے اقتدار کو تسلیم نہیں کرتے۔ اگر ہم ایسا کریں تو یہ بڑی ہی بیجا بات ہو گی۔"

ان کے برعکس قوم کی یہ حالت تھی کہ

هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۚ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ٥ (۱۸/۱۵)

"یہ ہماری قوم کے لوگ ہیں جو اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کو پکڑے بیٹھے ہیں۔ وہ اگر معبود ہیں تو کیوں اس کے لئے کوئی روشن دلیلیں پیش نہیں کرتے؟ (ان کے پاس تو کوئی دلیل نہیں) پھر اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ کہہ کر بہتان باندھے؟"

ان کا یہ اعلان کرنا تھا کہ ان پر چاروں طرف سے مخالفتوں کا ہجوم ٹوٹ پڑا۔ چنانچہ وہ باہمی مشورہ سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہمیں اس وقت ان کا کھل کر مقابلہ نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں ان سے الگ ہو کر اپنی تیاریاں کرنی چاہئیں۔ اس فیصلہ کے مطابق وہ بستی سے نکل کر دُور ایک غار میں چلے گئے۔

خلوت گزینی

وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ يُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا (۱۸/۱۶)

(پھر وہ آپس میں کہنے لگے کہ) جب ہم نے ان لوگوں سے اور اُن سے جن کی یہ اللہ کے سوا عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرتے ہیں، کنارہ کشی کر لی تو چاہیئے کہ غار میں چل کر پناہ لیں۔ ہمارا پروردگار اپنی رحمت کا سایہ ہم پر پھیلائے گا، اور ہمارے اس معاملے کے لئے (سارے) سر و سامان مہیا کر دے گا۔

وہ جس غار میں جا کر چھپے اس کا رُخ شرقاً غرباً نہیں بلکہ شمالاً جنوباً تھا جس کی وجہ سے سورج کی شعاعیں اُس کے اندر داخل نہیں ہو سکتی تھیں۔ لیکن اس کے اندر جگہ کشادہ تھی۔

وَ تَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ اِذَا

غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ○ (۱۸/۱۷)

اور وہ جس غار میں جا کر بیٹھے، وہ اس طرح واقع ہوئی تھی کہ جب سورج نکلے تو تم دیکھو کہ اُن کے دہنے جانب سے ہٹا ہوا رہتا ہے، اور جب ڈوبے تو بائیں جانب کترا کر نکل جاتا ہے (یعنی کسی حال میں بھی اس کی شعاعیں اندر نہیں پہنچتیں) اور وہ اس کے اندر ایک کشادہ جگہ میں تھے۔ یہ اللہ کے انتظام کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھی جس طرف اللہ نے ان کی راہ نمائی کر دی تھی۔ جسے خدا کی راہ نمائی میسر آجائے تو وہی صحیح منزل تک پہنچ سکتا ہے اور جس پر وہ راہ گم کر دے تو تم کسی کو اس کا کارساز اُس کا راہ دکھانے والا نہ پاؤ گے!

اگرچہ وہ غار میں محفوظ تھے لیکن اس کے باوجود کسی حفاظتی تدبیر سے غافل نہیں رہتے تھے۔ حتیٰ کہ نیند کی حالت میں بھی یکسر بے خبر نہیں ہوتے تھے۔ وہ سوتے اس طرح تھے کہ باہر سے اگر ان پر کسی کی نظر پڑ جائے تو وہ یہی سمجھے کہ یہ جاگ رہے ہیں۔ (وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۱۸/۱۸) وہ رات بھر یا دوپہر کے وقت جب وہ آرام کرتے تھے) اپنی پوزیشن کو وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے تھے (وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۱۸/۱۸) اور غار کے دہانے پر ان کا کتا اپنے بازو پھیلائے، دروازے کا راستہ روکے، چوکنا بیٹھا رہتا تھا کہ کوئی خطرہ ہو تو انھیں اس سے آگاہ کر دے (وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ۱۸/۱۸) غرضیکہ انھوں نے وہاں کیفیت ایسی پیدا کر رکھی تھی کہ اگر کسی کو معلوم بھی ہو جائے کہ وہاں کوئی رہتا ہے اور اندر جھانکے تو ڈر کے مارے اُلٹے پاؤں بھاگ اٹھے (لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا۔ ۱۸/۱۸)

دوبارہ آبادی کی طرف

وہ اس غار میں ایک عرصہ تک رہے اور چپکے چپکے اپنی تیاریاں کرتے رہے۔ وہ ان تیاریوں میں اس جذب و انہماک سے مصروف تھے کہ انھیں یاد بھی نہ تھا کہ انھیں وہاں کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ جب انھوں نے فیصلہ کیا کہ اب باہر نکلنے کا وقت آگیا ہے تو ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ ہم بھلا یہاں کتنا عرصہ رہے ہوں گے؟ (قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ۔ ۱۸/۱۹) تاکہ اس کا اندازہ کیا جائے کہ بستی کے لوگ انھیں پہچان لیں گے یا نہیں۔ ان میں سے کسی نے کہا کہ اتنا عرصہ۔ دوسرے نے کہا کہ نہیں اس سے کم مدت۔ (قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۱۸/۱۹) بہرحال، انھوں نے کہا کہ یہ بات محض

اندازہ لگانے کے لئے چھیڑی تھی۔ ٹھیک طور پر خدا ہی جانتا ہے کہ ہم کتنی مدت سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ جس مقصد کے لئے ہم اس کا اندازہ کرنا چاہتے تھے (کہ بستی کے لوگ ہمیں پہچان لیں گے یا نہیں) اس کا دوسرا طریق یہ ہے کہ اپنے میں سے ایک آدمی کو یہ سکہ دے کر بستی کی طرف بھیجو کہ وہاں سے اچھا سا کھانا لے آئے۔ لیکن وہ اس احتیاط اور ہوشیاری سے جائے کہ ہمارا راز نہ افشا ہونے پائے۔

(فَابْعَثُوٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ.................. وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ۱۸/۱۹)
اچھا ایک آدمی کو یہ سکہ دے کر شہر میں بھیجو۔ جا کر دیکھے کس کے ہاں اچھا کھانا ملتا ہے۔ اور جہاں کہیں سے ملے تھوڑی بہت غذا لے آئے۔ اور ہاں چپکے سے لے آئے کسی کو ہماری خبر نہ ہونے پائے۔

کیونکہ۔

اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوٓا اِذًا اَبَدًا ۝ (۱۸/۲۰)

اگر لوگوں نے خبر پالی، تو وہ چھوڑنے والے نہیں۔ یا تو سنگسار کریں گے، یا مجبور کریں گے کہ پھر اُن کے مذہب میں واپس چلے جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو پھر کبھی تم فلاح نہ پا سکو گے!

اب یہ واجب العزت تھے اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ وہ غار میں کیوں پناہ گزین ہوئے تھے۔ اس طرح لوگ ان کے حالات سے باخبر ہو گئے (كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ ۱۸/۲۱) اور اُن کے ہم مسلک ہم مشرب لوگوں کو اس سے بہت تقویت ہوئی کہ ان کے داعیانِ انقلاب زندہ ہیں اور اس قدر طاقت بھی فراہم کر چکے ہیں۔ اس سے انھیں یقین ہو گیا کہ خدا نے ان سے جو وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر وہ ثابت قدم رہے تو انھیں آخر الامر کامیابی ہو گی، وہ بالکل سچا تھا (لِيَعْلَمُوٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۱۸/۲۱) اور وہ انقلاب یقیناً آ کر رہے گا جس کے لئے وہ اتنے عرصہ سے منتظر تھے (وَ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۱۸/۲۱)

قرآن نے اس کے بعد کے قصے کی کڑیوں کو بیان نہیں کیا کہ وہ کس طرح اپنے پروگرام میں کامیاب ہوئے۔ اور لوگوں کے دلوں میں ان کی تعظیم و تکریم کس حد تک بڑھ گئی۔ وہ صرف اتنا بتاتا ہے کہ وہ غار ان لوگوں کے لئے ملت کا شعار اور عظمت کا مقام قرار پا گئی۔ اور جب وہ نوجوان، بعد میں فوت ہوئے تو ان کے معتقدین میں اس امر پر اختلاف پیدا ہوا کہ ان کی یادگار کس قسم کی بنائی جائے۔ کسی نے کہا کہ وہاں ایک بہت بڑی عمارت بطور یادگار بنائی چاہیئے (فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۱۸/۲۱)۔ لیکن گروہ غالب کا فیصلہ یہ ہوا کہ ان کی قبروں پر ایک عبادت گاہ بنا دی جائے (لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ۱۸/۲۱)

چنانچہ اس طرح ان انقلاب آفریں مجاہدین کی قبریں بعد میں لوگوں کے لئے سجدہ گاہ بن گئیں۔ اور ان کا غار خانقاہ میں تبدیل ہو گیا۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اب لوگ یہ تو بھول چکے ہیں کہ انھوں نے کس قدر مجاہدانہ کارنامے سرانجام دیئے تھے۔ اب ان کے مزاروں سے منتیں مانی جاتی ہیں۔ ان کے متولی لوگوں کو ان کی کرامات کے قسم قسم کے افسانے سناتے ہیں اور ان کے معتقدین بھی اس قسم کی بے معنی بحثوں میں الجھے رہتے ہیں کہ وہ تین تھے، چوتھا ان کا کتا تھا۔ (سَيَقُولُونَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۱۸/۲۲)۔ دوسرا کہتا ہے نہیں۔ وہ پانچ تھے۔ چھٹا ان کا کتا تھا (وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ ۱۸/۲۲) یہ بھی کسی حتم ویقین کے ساتھ نہیں کہتے۔ یونہی اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں (رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۱۸/۲۲) بعض ان سے بھی آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ سات تھے۔ آٹھواں ان کا کتا تھا۔ (وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۱۸/۲۲) اس کے بعد قرآن، نبی اکرمؐ (اور آپ کی وساطت سے مسلمانوں) سے کہتا ہے کہ یہ لوگ اگر اس قسم کی باتیں لے کر آپ کے پاس آئیں تو ان سے بحث میں نہ الجھو۔ ان سے کہہ دو کہ ان کی تعداد کا علم خدا ہی کو ہے۔ تم میں سے کوئی بھی ٹھیک ٹھیک بات نہیں جانتا۔ تم ان سے بات کرنے میں اسی حد تک رہو جس حد تک قرآن نے بات واضح کر دی ہے۔ اس سے زیادہ نہ اُن سے کچھ کہو۔ نہ اُن سے کچھ پوچھو۔ (قُلْ رَّبِّيْ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۔ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۔ وَلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ۱۸/۲۲)

یہ تھا ان کی تعداد کے متعلق اس کے بعد غار میں رہنے کی مدت کے متعلق ہے۔

وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۝ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا..... (۱۸/۲۵)

اور (کہتے ہیں) وہ غار میں تین سو برس تک رہے اور لوگوں نے نو برس اور بڑھا دیئے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ اس کا علم بھی خدا ہی کو ہے کہ وہ کتنے سال تک غار میں رہے تھے۔

قرآن چونکہ تاریخ کی کتاب نہیں اس لئے وہ اس قسم کی واقعاتی تفاصیل میں نہیں جاتا۔ ان قصص کے بیان کرنے سے، اس کا مقصد کسی اصولی حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے آپ کو وہیں تک محدود رکھتا ہے۔ یہی مقصد گذشتہ آیات سے ہے۔

٭ ٭ ٭

واقعہ اور اس کی تفاصیل ختم ہو گئیں۔ وہ مجاہدین ایسے معرکہ آرا کارنامہ کے بعد وفات پا گئے۔ اور لوگوں نے

ان کی قبروں پر ایک یادگار قائم کر دی جو رفتہ رفتہ خانقاہ بن گئی۔ ان خانقاہوں (Monastries) کے اندر عبادات گذاری کے کیا کیا طریقے تھے؟ ان کی تفاصیل خانقاہیت (Monasticism) کے متعلق لٹریچر[1] کے مطالعہ سے صحیح معلومات مل سکتی ہیں۔ ان لوگوں کی عجیب حالت تھی۔ اس قسم کی عبادت کا

خانقاہوں کی زندگی

منتہیٰ یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسان اس میں اس درجہ مستغرق ہو کہ کھانے پینے تک کا بھی ہوش نہ رہے۔ اس پر جذب و انہماک کا ایسا عالم طاری ہو کہ وہ جس انداز میں محوِ عبادت گذاری ہے، اسی انداز میں ہمینوں پڑا رہے۔ اگر کھڑا ہے تو بیٹھے نہیں، سجدہ میں ہے تو اٹھے نہیں۔ جو جھکا ہے جھکا رہے۔ جو بیٹھا ہے بیٹھا رہے۔ مغرب میں تو اس قسم کی خانقاہیں اور ان خانقاہوں میں ایسی سوت اور ریاضتیں باقی نہیں رہیں۔ لیکن مشرق میں ابھی تک اس کے آثار باقی ہیں۔ ہمالہ کی چوٹیوں یا غاروں میں آج بھی اس قسم کے مندر پائے جاتے ہیں جہاں سادھو۔ سنیاسی اس قسم کی ریاضتوں میں محو رہتے ہیں۔ کوئی ایک ٹانگ کے بل کھڑا ہے۔ کسی نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا رکھا ہے اور وہ ہاتھ بالکل سوکھ چکا ہے۔ کوئی آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے ہے اور آنکھ نہیں جھپکتا۔ کوئی لوہے کی میخوں کے بستر پر لیٹا ہے، کوئی آگ جلائے اوندھا لٹک رہا ہے۔ یہی کچھ عیسائیت کی خانقاہیت میں ہوتا تھا۔

ان غاروں کی تفاصیل

تاریخی اور اثری انکشافات شاہد ہیں کہ ارضِ فلسطین اس قسم کے تہ خانوں اور غاروں سے پٹی پڑی تھی۔ یہ غار عبادت گاہوں کے طور پر بھی کام آتے تھے۔ اور جب ویران ہو جاتے تو رہزنوں اور قزاقوں کی کمین گاہوں اور پناہ گاہوں کا کام دیتے تھے۔ تورات میں ان غاروں کے متعلق اکثر اشارات ملتے ہیں۔ مثلاً قاضیون کی کتاب میں ہے۔

> اور مدیانیوں کا ہاتھ اسرائیل پر قوی ہوا اور مدیانیوں کے سبب بنی اسرائیل نے اپنے لئے پہاڑوں میں کھوہ اور غار اور مضبوط مکان بنائے۔ (قاضیون ۶:۲)

---

[1] اس موضوع پر انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا اور انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایتھکس کے مضامین کے علاوہ

(Spirit and Origin of Christian Monasticism By: J.O. Hannay)

(Benedictine Monasticism By: E.C. Buttler) اور

مطالعہ کے قابل ہیں۔

رابنسن اپنی کتاب (BIBLICAL RESEARCHES IN PALESTINE) میں لکھتا ہے۔

"یہ ملک چاروں طرف سے غاروں سے پٹا پڑا ہے۔ یہ غاریں شاید (حضرت داؤد کے زمانہ میں) کمین گاہوں کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔" (جلد دوم صفحہ ۲۰۲)

جوزیفس اپنی مشہور تاریخ (Antiquities) کی جلد ۱۴ باب ۱۵ میں ان تہ خانوں اور غاروں کے متعلق لکھتا ہے کہ ان میں رہزن اور قزاق پناہ لیا کرتے تھے۔ کوہ کارمل کی غاریں اس زمانے کی مشہور ... تھیں۔ کیٹو اپنے سائیکلو پیڈیا اوف بیبلیکل لٹریچر میں لکھتا ہے۔

کارمل چونے کے پتھر کا پہاڑ ہے اور جیسا کہ ایسی صورت میں اکثر ہوتا ہے اس میں بڑی بڑی غاریں واقع ہیں۔ قریب ایک ہزار سے بھی زیادہ۔ ایک خاص خطہ میں جسے "راہبوں کے غار" کہا جاتا ہے قریب چار ہزار غاریں ایک دوسرے سے ملحق پائی جاتی ہیں۔ ان میں روشندان بھی ہیں اور سونے کی جگہ بھی۔ ان کے دروازے اس قدر تنگ ہیں کہ ایک وقت میں صرف ایک آدمی رینگ کر اندر داخل ہو سکتا ہے۔ پھر ان کے راستے اس قدر پر پیچ و خم دار ہیں کہ چار قدم کے بعد انسان نگاہوں سے پوشیدہ ہو جاتا ہے...... یہ حقیقت ہر شخص کو معلوم ہے کہ کوہ کارمل کی غاریں زمانۂ قدیم میں نبیوں اور دوسرے مذہب پرست لوگوں کی عبادت گاہ تھیں۔

ایک مشہور سیاح (BURCKMARDT) اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے۔

"کوہ کلات ابن معان میں طبعی غاروں کو، ایسے راستوں سے باہم ملا دیا گیا ہے جو پتھر کی چٹانیں تراش تراش کر بنائے گئے ہیں۔ ان کے اندر پانی کے حوض ہیں اور کم و بیش چھ سو نفوس کے رہنے کی گنجائش ہے"

یہی غاریں تھیں جنہوں نے رفتہ رفتہ خانقاہوں کی شکل اختیار کر لی۔ اسینی (Essenes) فرقہ (جس کا اجمالی ذکر پہلے آچکا ہے) مسلک رہبانیت کا سب سے بڑا پیرو تھا۔ مصر میں ان کی اس قسم کی خانقاہیں ان کے زہد و انزوا کی زندہ شہادتیں تھیں۔ مشہور یہودی مؤرخ فیلو (Philo) قریب ۲۰ ء ق۔م میں ان کے متعلق لکھتا ہے۔

"ہر عبادت گاہ میں ایک مقدس حلقہ ہوتا ہے جسے مندر کہا جاتا ہے اور اس کے ساتھ خانقاہ جس میں راہب عالم بالا کے عجائب و غرائب کے کرشمے دکھاتے ہیں۔ وہ اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے حتیٰ کہ کھانے پینے اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی چیزیں بھی نہیں۔ ان کے پاس صرف نبیوں کا مقدس کلام

ہوتا ہے۔ اور اس قسم کی اور چیزیں جن سے ان کے زہد و تقدس میں اضافہ اور تکمیل ہو۔
(Contemplative Life)

قریب ۳۲۵ء میں اسی قسم کی ایک خانقاہ عیسائی راہب پاکوس نے جزیرہ طابنیہ (TABENNA) میں قائم کی۔

اس جزیرہ کی ہر خانقاہ میں یونانی لٹریچر کے ماہرین کی جماعتیں رہا کرتی تھیں۔ آہستہ آہستہ اسکندریہ اسکول کے لوگوں نے بھی وہاں آنا شروع کر دیا۔

(امریکن سائیکلوپیڈیا۔ جلد ۷)

یہ پہلی خانقاہ تھی۔ لیکن اس کے بعد خانقاہوں کی ترویج اس برق رفتاری سے ہوئی کہ تیسری صدی کے اخیر میں ہر جگہ خانقاہیں دکھائی دینے لگیں۔ چنانچہ (Rollin) اپنی کتاب "تاریخ مصر قدیم" (جلد دوم باب ۲) میں لکھتا ہے۔

"زیریں مصر کا سب سے بڑا اعجوبہ اس کا شہر (Oxyrinchus) تھا۔ جس کی حالت یہ تھی کہ شہر کے اندر اور باہر ہر جگہ راہب ہی راہب دکھائی دیتے تھے۔ شہر کی آبادی سے بھی زیادہ راہب۔ عام عمارات اور منادر سب خانقاہوں میں تبدیل ہو چکے تھے اور ان کی تعداد سکونتی مکانات سے بھی زیادہ تھی .... اس شہر میں بیس ہزار کنواری راہبات اور دس ہزار راہب بستے تھے۔"

یہ ہے واقعہ اصحاب کہف کا جس کے بیان سے مقصود یہ ہے کہ حق پرست لوگوں کو کس کس قسم کی تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور بالآخر وہ لوگ کس طرح مرجع انام بن جاتے تھے۔ ان قصص سے ذرا قرآن کریم کی وسعت داماں پر غور کیجئے۔ جہاں جہاں کوئی شگفتہ پھول ملتا ہے وہ کس طرح بلا تفریق چن لیتا ہے۔ کیا کسی اور جگہ بھی آپ کو ایسی کشادہ ظرفی کی مثال ملتی ہے۔

قرآن کریم نے رہبانیت کے متعلق کہا ہے کہ ایک تو یہ مسلک ہی لوگوں کا خود ساختہ تھا۔ اللہ نے اس مسلک کا حکم نہیں دیا تھا اور دوسرے یہ کہ یہ لوگ اپنے خود ساختہ مسلک کی بھی رعایت نہ رکھ سکے اور ان

لہ یہ قریب ۳۲۵ ق۔م۔ کی شہادت ہے۔ یعنی اس زمانے کی شہادت جس میں حضرت مریم خانقاہ میں راہبہ کی زندگی بسر کرنے کے لئے وقف کی گئی تھیں۔ تفصیل پہلے آ چکی ہے۔

خرافات میں پڑ گئے جن کے تذکرہ سے آج روحِ انسانیت شرماتی ہے۔ مسلکِ خانقاہیت کی تشریح
مقام پر (کسی آئندہ جلد) میں آئے گی۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام کی رُو سے انسانی ذات

فلسفۂ رہبانیت

کے اثبات وتکمیل کا طریق یہ ہے کہ انسان اپنے جوشِ عمل اور شدتِ کردار سے
طبیعی کو مسخر کرے اور ان بے پناہ قوتوں کو منشائے ایزدی کے مطابق کام میں
(اس کو قیامِ حکومتِ الٰہیہ کہتے ہیں) اس کے برعکس مسلکِ خانقاہیت (رہبانیت کہ جس کا ماخذ افلاطون کا
"اعیانِ نامشہودہ" ہے) کی رُو سے دنیا کے خارجی حقائق سب سراب (ویدانت کی زبان میں مایا) ہیں۔ ا
انسان کو ان خارجی حقائقِ فطرت کی طرف سے آنکھیں بند کرکے "اندر کی دنیا" میں جذب ہو جانا چاہیے۔
فلسفۂ حیات کا لازمی نتیجہ جمود وسکون ہے جس میں زندگی کا حرکتی عنصر یکسر افسردہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ فل
حیات غیر اسلامی (بدعت) ہے جو زندگی کو حقائق سے گریز اور حرکت وعمل کے بجائے جمود وتعطل سکھاتا ہے
اسلامی تصورِ زندگی کا راز "حرکتِ دوام" میں ہے۔ اب رہی دوسری شق۔ یعنی ان لوگوں نے اپنے خود اختیار
مسلکِ خانقاہیت کی بھی رعایت نہ رکھی۔ سو اس ضمن میں خود مغربی محققین نے خانقاہیت (Monasticism)
اور خانقاہوں (Monastries) کے متعلق اس قدر ریسرچ کی ہے کہ کسی دوسرے کو کچھ لکھنے
ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ خانقاہی فتنے۔ خانقاہیت کی ابتدا ہی سے شروع ہو گئے تھے۔ طابیت
کی سب سے پہلی خانقاہ (جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) کے متعلق امریکن سائیکلوپیڈیا (جلد ہفتم) میں ذکر
ہے۔

> ترکِ دنیا کے اس غلو کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہوت پرستی۔ جنون۔ یاس انگیزی اور خودکشی عام ہونے لگی۔ راہبوں کی جہالت اور مذہبی جنون سے بہت سے خودغرض لوگوں نے فائدہ اٹھا کر (انھیں) اپنا آلہ کار بنا لیا۔"

خانقاہوں کے فتنے

دنیائے عیسائیت میں
(Buck's Theological Dictionary)
ایک مستند صحیفہ تسلیم کی جاتی ہے۔ اس میں (MONKS) کے عنوان کے تحت مصر کی تحریکِ خانقا
کے عروج کی داستان بیان کرنے کے بعد لکھا ہے

> تھوڑے ہی عرصہ میں تمام مشرق میں ان گنہگار انسانوں کی جماعتوں سے بھر گیا۔ جنھوں نے تمام دنیاوی علائق سے قطع تعلق کرکے کرب واذیت اور مصائب ونوائب کی زندگی اختیار کر لی تاکہ اس کے ذریعہ خدا اور عالم ملکوت سے قرب حاصل کیا جا سکے۔۔۔۔ (لیکن کچھ عرصہ کے بعد) ان لوگوں کی شہوت پرستی

ضرب المثل ہو گئی - نیز انھوں نے مختلف مقامات پر لوگوں کو مشتعل کر کے ہنگامے اور شورشیں برپا کرانا شروع کر دیں...... مستند مصنفوں کی شہادات سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ لوگ بالعموم سہل انگار جاہل - آوارہ مزاج اور حدود فراموش عیش پسند واقع ہوئے تھے - جن کی زندگی کا مطمح نگاہ - تن آسانی سہل انگاری اور عیش پرستی تھا -

تارک الدنیا " زاہدوں سے ایک دنیا تنگ آرہی تھی -

پیٹ لپیٹ کر مانگنے والے بھکاری - راہبوں کے لباس میں ہر گلی کوچہ میں آوارہ پھرتے دکھائی دیتے تھے - ہر قسم کی بدمعاشی - فریب دہی ان کا شعار تھا حتیٰ کہ جو لوگ انھیں پناہ دیتے یہ انھیں کبھی بخشتے -

.... جیروم کے اندازہ کے مطابق اس کے زمانہ میں اکیلے مصر میں ...... راہب تھے ....

یہ لوگ مذہبی جوش عقیدت کے نقاب میں بدترین سلب و نہب کی وارداتوں کے مرتکب ہوتے -

(Progress Of Religious Ideas, Vol.3.P. 249)

انقاہوں کی حالت تھی - اُدھر کلیساؤں میں جہاں اسی رہبانیت کی دوسری صورت پادریوں کے لباس میں جلوہ گر تھی - اس سے بھی بدتر حالت تھی - موشیم (Mosheim) مسیحی دنیا کا بہت بڑا مستند مورخ ہے - وہ اپنی مشہور تاریخ میں تیسری صدی کے کلیساؤں کے متعلق لکھتا ہے -

(اکثر کی یہ حالت تھی کہ وہ آرام طلبی اور شہوت پرستی کی زندگی میں ڈوبے ہوئے تھے ...... ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ ان راہبہ عورتوں سے جو عمر بھر مجرد رہنے کی قسم کھائے ہوتیں - ناجائز تعلقات قائم کرتے - ان خوبصورت راہبات کو اپنا شریک بستر بنا لینا ان کے معمولات میں داخل ہو چکا تھا -)

اعمال کی کیفیت تھی - اور عقائد کی یہ حالت کہ موشیم مذکور چوتھی صدی کے مذہب پرستوں کے متعلق لکھتا ہے -

ارض فلسطین اور دوسرے ولیوں کی قبروں کی زیارتوں کے لئے اطراف و اکناف عالم سے، لوگ چلے آتے - یہ سمجھ کر کہ حقیقی نیکی اور یقینی نجات صرف وہیں مل سکتی ہے - توہم پرستی کی لگام کو ذرا ڈھیلا کیجئے اور پھر دیکھئے کہ یہ کس طرح حدود فراموش وسعتوں تک پھیل جاتی ہے - چنانچہ ان میں بیہودہ معتقدات اور لایعنی رسومات کا نت نئے دن اضافہ ہوتا چلا گیا - اس سرزمین کی مٹی کو لوگ تبرکاً لے جاتے - اس کے متعلق عقیدہ یہ تھا کہ یہ خبیث روحوں کے بد اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے اکسیر ہے، چنانچہ اس مٹی کی ہر جگہ بڑی بڑی قیمتوں پر خرید و فروخت ہوتی .... آہستہ آہستہ توہم پرستی عام ہوتی گئی جس سے مذہبی مکاری اور فریب دہی کا

دروازہ کھل گیا۔ اب ان راستوں سے مذہبی دوکاندار آنے شروع ہوگئے۔ جن کا اصول اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لوگوں کی جہالت اور عقیدت سے فائدہ اٹھا کر اپنا الو سیدھا کیا جائے اور اس طرح دولت اکٹھی کرلی جائے۔ انسانی فطرت کی کچھ افتاد ایسی ہے کہ ہر نئی چیز اعجوبہ اور کرامت بن کر نظر آتی ہے۔ اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر کیا یہ جاتا کہ مٹی کے ڈھیروں کو ولیوں کی قبریں بنا بنا کر ان کی پوجا کرائی جاتی۔ ولیوں کی فہرستوں میں آئے دن اضافے ہوتے رہتے اور چوروں اور ڈاکوؤں کو مقدس شہدا بنا کر پیش کیا جاتا۔ کسی مردے کی ہڈیاں ویرانے میں دفن کردی جائیں۔ پھر مشہور کردیا جاتا کہ ہمیں خواب میں دکھائی دیا ہے کہ اس جگہ ایک بہت بڑے بزرگ مدفون ہیں۔ راہبوں کی جماعتیں قریہ قریہ گشت لگاتیں اور یہ لوگ نہایت دیدہ دلیری سے نہ صرف بزرگوں کی طرف منسوب کمفرضی تبرکات ہی بیچتے بلکہ عوام کی نگاہوں کو یہ کہہ کر بھی دھوکا دیتے کہ ہم جنات نکالتے ہیں اور بھوت پریت کو مار بھگاتے ہیں۔ غرضیکہ اسی قسم کی مکاری اور جعلسازی اس قدر عام ہو رہی تھی کہ اس کی تفاصیل کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔

مشہور مؤرخ گبن جس نے روما کی عظیم الشان سلطنت کے انحطاط و سقوط کی عبرت انگیز داستان لکھی ہے۔ اس باب میں لکھتا ہے۔

یہ کامیاب تجربہ کہ ولیوں کے تبرکات سونے اور جواہرات سے بھی زیادہ بیش قیمت ہیں۔ پادریوں کے لئے کلیسا کے خزانوں میں اضافے کرنے کی تحریص کا موجب بنا۔ انھوں نے امکانات وصداقت کو بالائے طاق رکھ کر۔ پرانی ہڈیوں کے لئے عجیب وغریب نام وضع کئے اور پھر ان ناموں کی طرف (محیر العقول) کارنامے منسوب کئے (حضرت مسیح کے) حواریوں اور ان مقدس لوگوں (کے چہروں) پر جنھوں نے نیک اعمال میں ان کی پیروی کی تھی قسم قسم کے مذہبی افسانوں کی سیاہ چادر ڈالی گئی۔ حسب و غیور شہدا کی فہرست میں ہزارہا ایسے فرضی مشاہیر کا اضافہ ہوگیا جن کا وجود ان افسانہ طرازوں کے ذہن سے باہر کہیں نہیں تھا۔ اور اس بدگمانی کے لئے کافی وجوہات موجود ہیں کہ صرف (TOURS) کا کلیسا ہی ایک ایسا نہ تھا جس میں ولیوں کے بجائے جعلسازوں کی ہڈیوں کی پرستش ہوتی تھی (اور جگہ بھی ایسا ہوتا تھا) اس توہم پرستی نے ایک طرف فریب کاری اور خوش اعتقادی کی راہیں کشادہ کردیں اور دوسری طرف دنیائے عیسائیت سے تاریخ اور بصیرت دونوں کے چراغ گل کردیئے۔

ان ولیوں کو کعبۂ مقصود و قبلۂ حاجات۔ اور مصائب و نوائب میں مشکلات کشا تصور کیا جاتا تھا۔

(TOWNSEND) اپنی کتاب (Travels in spian Vol.iii P. 215)

میں لکھتا ہے:

یہ امر لوگوں کے لئے خوشی کا موجب ہے کہ ان لوگوں کے پاس اطباء کی حذاقت کے علاوہ امراض کے دفعیہ کے لئے ایک اور بھی امید کا سرچشمہ ہے۔ وہ سرچشمہ جو کسی مصیبت میں بھی ناکام نہیں رہتا۔ مثلاً (ان کے نزدیک) انتھلی ولی اپنے معتقدین کو آگ سے محفوظ رکھتا ہے۔ اور ایک دوسرا انتھلی انھیں پانی کی مصیبت سے نجات دلاتا ہے۔ باربیرا ولی جنگ اور بجلی کے حوادث میں جائے پناہ ہے۔ بلاس ولی گلے کی بیماریوں کو اچھا کرتا ہے۔ لوسیا ولی آنکھوں کے امراض کو شفا دیتا ہے۔ نکوس ولی ان جوان عورتوں کی امداد کرتا ہے جو شادی کی متمنی ہوں۔ رامتی ولی حمل کے ایام میں ان کی حفاظت کرتا ہے۔ پلونیا ولی دانتوں کو محفوظ رکھتا ہے ڈومنگو ولی بخار اتار دیتا ہے۔ اور روق ولی کی طرف طاعون کی مصیبت میں رجوع کیا جاتا ہے۔ قصہ مختصر کوئی بیماری ہو یا کوئی مصیبت۔ اس کے دفعیہ کے لئے کوئی نہ کوئی ولی موجود ہے جس سے دعا کے ذریعہ اعانت طلب کی جاتی ہے اور وہ اپنے پکارنے والے کی مدد کو پہنچ کر اس کی تکلیف میں دستگیری کرتا ہے۔

یہ اور ہم؟ آپ یہ کچھ پڑھ رہے ہیں اور تیسری چوتھی صدی کے عیسائیوں کی حالت کا نقشہ ذہن میں مرتسم کئے جا رہے ہیں۔ اس لئے آپ کو فرصت کہاں کہ یہ سوچیں کہ خود ہمارے ہاں ایک عرصہ دراز سے کیا ہو رہا ہے؟ لیکن مسلمان کو اس کے سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس نے قرآن میں پڑھا کہ رہبانیت خلاف اسلام ہے تو سمجھ لیا کہ یہ آیت عیسائیوں سے متعلق ہے۔ ان کی خانقاہیت خلاف اسلام تھی لیکن ہماری خانقاہیت عین اسلام بلکہ مغز اسلام ہے! اب انھیں کون سمجھائے کہ لات ومنات، لات ومنات ہی رہتے ہیں خواہ انھیں محراب کعبہ میں ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے۔ اس قسم کی جعل سازیاں اور فریب کاریاں ہی قابل اعتراض نہیں بلکہ قابل اعتراض ہے وہ روح خانقاہیت جو خدا کا تعین فرمودہ نظام حیات نہیں، بلکہ حقائق زندگی سے گریز کرنے والے شکست خوردہ دماغوں کی اختراع ہے جس سے پوری کی پوری قوم افیونیوں کا گروہ بن کے رہ جاتی ہے۔ اور یہ روحِ خانقاہیت ایک ہی ہے۔ یہاں ہو یا وہاں۔ حیرت ہے کہ قرآن کو سامنے رکھنے والے مسلمان کی سمجھ میں بھی یہ بات نہ آئی کہ

کمالِ ترک نہیں آب وگل سے مہجوری
کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی ونوری

حضرات انبیاءِ کرام کا تذکارِ جلیلہ، جس کی ابتداء حضرت نوحؑ سے ہوئی تھی، جو تجلّیٔ نور اور برقِ طور کے بعد، زیرِ نظر کتاب میں حضرت عیسیٰؑ تک وجہِ شادابیٔ قلب و نظر بن چکا ہے۔ اس کے بعد حضورؐ خاتم النبیین کی سیرتِ مقدسہ، اس سلسلہ کی اگلی کڑی، "معراجِ انسانیت" میں آگئی ہے۔ قبل اس کے کہ زیرِ نظر کتاب کو ختم کیا جائے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرات انبیائے کرامؑ کے احوال و کوائف میں جو جو مشترکہ اقدار قرآن میں بیان ہوئی ہیں، اُنھیں بیک وقت سامنے لایا جائے۔ اور اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ ان انبیائے کرام کی دعوت کا ردِ عمل ان کی اُمتوں کی طرف سے کیا ہوا۔ اس طرح یہ حصہ، گویا سابقہ مندرجات پر نگہ بازگشت کا کام دیگا۔ آیندہ دو ابواب اسی طائرانہ تبصرہ پر مشتمل ہیں۔

یہ ہیں رسول!

تلک الرسل

فضلنا بعضہم علی بعض (۲/۲۵۳)

بنگر! کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود!!

تِلْكَ الرُّسُلُ

یہ ہیں حضرات انبیائے کرام علیہم السلام

طائرانِ حظیرۂ قدس کا وہ کاروانِ شوق جو صبحِ ازل، جھلملاتے تاروں کی سکوت افزا شبنمی چھاؤں میں، جانبِ منزل روانہ ہوا تھا، قندیلِ آسمانی کی بصیرت افروز و جہاں تاب روشنی میں، زمزمہ سنج و نغمہ بار، جذب و کیف کی نورانی وادیاں طے کرتا اس مقام تک آپہنچا ہے جہاں سے چراغِ منزل، روشنی کے جگمگاتے مینار کی طرح، دور سے مسکراتا نظر آرہا ہے۔ وہ مقام جہاں اس مقصدِ عظیم کی تکمیل ہوگی جس کے لئے خاک کے ذرّے مختلف ارتقائی ادوار طے کر کے پیکرِ آدم میں متشکل ہوئے اور یہ پیکرِ آب و گل، مقامِ شرف و مجدِ انسانیت کی طرف رواں دواں جادہ پیما ہوا۔ نفوسِ قدسیہ کا یہ قافلۂ رشد و ہدایت ایک جوئے رواں تھی جو دامنِ کہکشاں سے فرازِ کوہ پر جلوہ بار و گہر ریز ہوئی اور سینۂ کہسار کو چیرتی، بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکرا کر بجلیاں پیدا کرتی، سرودِ زندگی کو اپنی لہروں کے آغوش میں پرورش دیتی، داخلِ دشت و صحرا ہوئی۔

درخوابِ ناز بود بہ گہوارۂ سحاب ۔۔۔ واکرد چشمِ شوق بآغوشِ کوہسار

از سنگ ریزہ نغمہ کشاید خرامِ او ۔۔۔ سیمائے او چو آئینہ بے رنگ و بے غبار

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود

در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود[1]

(1 فٹ نوٹ صفحہ ۱۶۳ پر دیکھئے)

یہ مستِ خرامِ جوئبار، دشت و صحرا میں زمینِ صالح کو لالہ زاروں میں تبدیل کرتی اور خس و خاشاک اور ہر کشتِ زبوں حاصل کو اپنی موجوں کی لپیٹ میں بہاتی آگے بڑھتی گئی۔ گاہ اپنی سکوت افزا روانیوں سے سبزۂ نودمیدہ کا منہ چومتی اور جھکی ہوئی شاخوں کو آئینہ دکھاتی اور گاہ، کف بر دہاں طغیانیوں سے بڑے بڑے سرکش و تناور درختوں کو جڑ سے اکھیڑتی۔ این و آں سے بے نیاز۔ ماحول سے مستغنی۔ گرد و پیش سے غیر متاثر۔ اپنی خودی میں مست۔ انسانوں کے خود ساختہ قوانین و ضوابط سے بے رُخی برتتی اور صرف اس قانونِ سرمدی کی اتباع کرتی جس کے تابع زندگی بسر کرنے کے لئے اس کی تخلیق ہوئی تھی۔ جانبِ منزل بڑھتی چلی گئی۔

دریائے پُر خروش ز بند و شکن گذشت	از تنگنائے وادی و کوہ و دمن گذشت
یکساں چو سیل کردہ نشیب و فراز را	از کاخِ شاہ و بارہ و کشت و چمن گذشت
بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بے قرار	در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گذشت

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رودؔ

یہ قافلۂ رشد و ہدایت۔ یہ کاروانِ نور و نکہت۔ ہر ناقۂ بے زمام کو دعوتِ قطار دیتا اور ہر رہرو سفرِ حیات کی تقدیروں کی پردہ کشائی کرتا اس مقام تک آ پہنچا ہے جہاں آثارِ منزل نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ تکمیلِ سفر کی ہنگامہ خیز مسرت اور حصولِ منزل کی مسرت انگیز کیفیت کا اندازہ ہم پاشکستہ کیا لگا سکتے ہیں نہ جن کے قدم آشنائے جادہ نہ آنکھیں شناسائے منزل؛ اس والہانہ کیفیت کا پوچھئے کسی ایسے قلبِ زندہ سے جس پر یہ حقیقت آشکارا ہو چکی ہو کہ۔

حیات، ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

بہرکیف، یہ راحلۂ شوق اس وقت میقات میں پہنچ چکا ہے۔ وہ دیکھئے! ہر فردِ کارواں مصروفِ احرام بندی ہے کہ اب اگلا قدم حریمِ کعبہ میں ہوگا۔ جب تک یہ کارواں، ان تیاریوں میں مصروف ہے، آیئے ہم ان کی قطع کردہ راہوں پہ ایک طائرانہ نگہ بازگشت ڈالیں تاکہ گذری ہوئی منازل کی یاد پھر سے تازہ ہو جائے اور ہم ان شگفتہ و شاداب پھولوں کو دامنِ نگاہ میں لئے ان کے ساتھ آگے بڑھیں کیونکہ اس سے آگے فاران کی مقدس وادی میں پہنچ کر، جہاں کا ہر سنگریزہ جادہ فروشِ صد طور اور ہر ذرہ آئینہ نمائے ہزار سینا ہے، اس کی فرصت نہ مل سکے گی۔ اس لئے کہ وہاں قلب کی ہر حرکت صرفِ نیاز اور نگاہ کی ہر جنبش وقفِ سجود ہوگی۔

لہ مشہور جرمنی مفکر و شاعر گوئٹے نے لفظ محمد کے نام سے ایک بڑی پیاری نظم لکھی تھی جس کا ترجمہ علامہ اقبال نے پیامِ مشرق میں شائع کیا تھا یہ اسی نظم کے بند ہیں۔

اسلام کیا ہے؟ کائنات کی ہر شے ایک مقررہ قانون کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اس روشِ تسلیم و رضا کا نام اسلام (جھک جانا) اور جس قانون کی اطاعت ہو رہی ہے اس کا نام دین (نظامِ اطاعت یا مسلکِ زندگی) ہے۔ انسان بھی کائنات ہی کی ایک شئے ہے۔ اس لئے اس کے لئے بھی کسی آئین و نظام کے سامنے جھکنا ضروری ہے۔ جو نظامِ اطاعت اس کے لئے متعین کیا گیا ہے اس کا نام الدین ہے اور جس انداز سے اس نظام کی اطاعت ہوگی اس کا نام الاسلام۔ انسان کے لئے اس الدین کے علاوہ نہ کوئی اور دین (نظامِ اطاعت اور مسلکِ حیات) ہے نہ الاسلام کے علاوہ کوئی اور اسلام (اندازِ اطاعت اور طریقِ زندگی) یعنی نظام بھی ایک اور اس نظام کی اطاعت کا طریق بھی ایک۔

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ وَلَہٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْھًا وَّ اِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ ○ (۳/۸۲)

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں۔ اللہ کا دین چھوڑ کر دوسری راہ ڈھونڈھ نکالیں؟ حالانکہ آسمان و زمین میں جو کوئی بھی موجود ہے، خوشی سے ہو یا ناخوشی سے سب اسی کے حکم کے فرماں بردار ہیں۔ اور ہر ایک کی گردش کا رُخ اسی محور کی طرف ہے۔

اس نظامِ اطاعت کے علاوہ کوئی اور نظام قابلِ قبول نہیں۔

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ ۚ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ○ (۳/۸۵)

جو کوئی الاسلام کے سوا (جو ایک مکمل نظامِ اطاعت اور مسلکِ حیات ہے) کسی دوسرے دین کا خواہشمند ہوگا، تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا، اور وہ آخر الامر خاسر و نامراد رہے گا۔

اس لئے کہ

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۳/۱۹)

بلاشبہ الدین (نظامِ اطاعت) اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے!

انسان اور دیگر اشیاء میں فرق دیگر اشیائے کائنات جس قانون کے ماتحت زندگی بسر کرنے کے لئے تخلیق ہوئی ہیں ان پر اُن کے ذاتی میلانات و رجحانات یا خارجی مؤثرات اثر انداز نہیں ہوتے بر عکس اس کے انسان داخلی اور خارجی دونوں دنیاؤں سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ اس لئے اس سے الدین کے مطابق زندگی بسر کرانے کے لئے، اس نظامِ زندگی کو بائیں

اس کے سامنے لانے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی یاد دہانی اور تاکید کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ نظامِ اطاعت (یا ضابطۂ قوانین) جو اس طرح بار بار اس کے سامنے لایا جائے ایسے مقام سے ملنا چاہیئے جو خارجی امیال و عواطف سے اثر پذیر نہ ہو۔ یہ مقام سوائے ذاتِ باری تعالیٰ کے اور کون ہو سکتا ہے؟ پھر یہ بھی دیکھئے کہ اشیائے کائنات میں سے کسی نے اپنے لئے خود قوانینِ حیات مرتب نہیں کئے۔ ہر ایک کو خالقِ فطرت کی طرف سے ضابطۂ زندگی عطا ہوا ہے۔ اسی طرح انسان بھی اپنی زندگی کے لئے آپ قانون نہیں وضع کر سکتا۔ یہ اصول و اساسات اسے خالقِ فطرت ہی کی طرف سے ملنے چاہئیں۔ اس لئے وہ خالقِ فطرت بذریعہ وحی اس قانون کو انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ اور جن مقدس حضراتؑ کے واسطہ سے یہ قانون انسانوں تک پہنچتا ہے، انھیں انبیاءؑ یا رسول (پیغامبر) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ جب انسان نے عمرانی زندگی کی ابتدا کی اور حیاتِ اجتماعیہ کے مقتضیات ورد (عمل) نے ابھرنا شروع کیا تو اس کے ساتھ ہی یہ سلسلۂ پیغام رسانی بھی شروع ہو گیا۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ o (۷:۳۵)

(اور فرمانِ الٰہی ہوا تھا) "اے اولادِ آدم! جب کبھی ایسا ہو کہ میرے پیغمبر تم میں پیدا ہوں، اور میرا قانون تمہارے سامنے پیش کریں، تو جو کوئی ان قوانین کی نگہداشت کرے گا اور (اس طرح اپنے اندر ارتقائے انسانیت کی) صلاحیت پیدا کرے گا، اس کے لئے کسی طرح کا اندیشہ نہ ہوگا، نہ کسی طرح کی غمگینی"۔

حضرات انبیائے کرام کا منصب یہی نہیں ہوتا کہ وہ ان پیغاماتِ خداوندی کو لوگوں تک پہنچا دیں۔ ان کا فریضہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ ان قوانین کے مطابق معاشرہ کی تشکیل کریں۔ یعنی ایک ایسا نظام قائم کریں جس میں تمام امور کے فیصلے قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوں۔ یہ نظام اس جماعت کے ہاتھوں وجود پذیر ہوتا ہے جو بطیبِ خاطر (دل کی پوری رضامندی سے) قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان لاتے ہیں۔ اس میں کسی قسم کا جور و اکراہ نہیں ہوتا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب ان فیصلوں نے قانون کی حیثیت لینی ہو تو ان کے نفاذ کے لئے قوت کی بھی ضرورت ہوگی۔ اس لئے کہ معاشرہ میں ایسے لوگ بھی تو ہوں گے جو ان فیصلوں کو پسند نہیں کریں گے جن سے ان کے مفاد پر زد پڑتی ہو۔ نیز ایسی قوتیں بھی ہوں گی جو اس نظام کی مخالفت کریں گی۔ ان تمام مقاصد کے لئے ضروری ہے کہ اس نظام کے پاس قوت بھی ہو۔ لہٰذا حضرات انبیاء کرام محض مبلغ اور واعظ نہیں ہوتے تھے۔ ایک فعّال نظام کے مرکز اور ایک مملکت کے صدرِ اعلیٰ بھی ہوتے تھے۔ سورۂ حدید میں

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (۵۷/۲۵)

بلاشبہ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب (قانون) اور میزانِ عدل نازل کی تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قائم رہ سکیں اور ہم نے لوہے کو نازل کیا جس میں بڑی قوت ہے اور لوگوں کے واسطے بڑی بڑی منفعتیں ہیں۔ اور (یہ سب کچھ اس لئے بھی کیا گیا) تاکہ خدا (اور مرکزِ حکومتِ الٰہیہ) کو اچھی طرح معلوم ہوجائے کہ کون خدا اور اس کے رسولوں کی بن دیکھے امداد کرتا ہے (اور کون نہیں کرتا) بلاشبہ خدا بڑی قوت اور غلبہ والا ہے (اُسے تمھاری مدد کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تمھاری امداد خود تمھاری ہی بہبود کے لئے ہے!)

حکومتِ الٰہیہ جس نظام کے ماتحت کوئی قانون عملاً نافذ ہو اسے نظامِ حکومت کہتے ہیں۔ اور جس حکومت کے ماتحت قوانینِ الٰہیہ کی تنفیذ ہو اسے حکومتِ الٰہیہ۔ لہٰذا حضرات انبیأ کرامؑ کا مقصدِ زندگی قیام و بقائے حکومتِ الٰہیہ تھا تاکہ دنیا سے انسانی تغلب و استیلا (فساد) کو مٹا کر عدل و انصاف کی بساط بچھائیں۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۗ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲/۲۵۱)

چنانچہ (ایسا ہی ہوا) اُنھوں نے حکمِ الٰہی سے اپنے دشمنوں کو ہزیمت دی، اور داؤد کے ہاتھ سے جالوت مارا گیا۔ پھر اللہ نے داؤد کو پادشاہی اور حکمت سے سرفراز کیا، اور (حکمرانی و دانشوری کی

لـه دنیا میں قوت کا مظاہرہ ہمیشہ فولاد (Steel) سے ہوتا رہا ہے خواہ وہ ازمنۂ قدیمہ کی تیغ و سنان اور زرہ و خود ہو اور خواہ دورِ حاضرہ کے ٹینک اور ہوائی جہاز۔ قوت کے ان مظاہر کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن فولاد کی حقیقت اپنی جگہ پر مستقلاً قائم و دائم ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے قوت کے مفہوم کے لئے فولاد ہی کا جامع لفظ استعمال کیا ہے۔ کیونکہ اس کے اندر قوت کے مختلف شئون و صُور محصور ہیں۔

باتوں میں سے) جو کچھ سکھلانا تھا، سکھلا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ ایسا نہ کرتا کہ انسانوں کے ایک گروہ کے ذریعہ دوسرے گروہ کو راستے سے ہٹاتا رہے تو دنیا خراب ہو جاتی (اور امن و عدالت کا نام و نشان باقی نہ رہتا) لیکن اللہ دنیا کے لئے فضل و رحمت رکھنے والا ہے۔

سب کی تعلیم ایک تھی

ظاہر ہے کہ جب ان تمام حضرات انبیاء کرام کا مقصد زندگی ایک تھا، مبدار علم (خبر نبوت) ایک تھا، وہ قانون جس کی ترویج و تنفیذ کے لئے ان کی بعثت ہوئی تھی ایک تھا، تو ان میں باہمی اختلاف کیسے ہو سکتا ہے؟ ان میں کبھی اختلاف نہ تھا۔ اُن کا پیغام ایک تھا، اُن کی تعلیم ایک تھی، اُن کی منزل واحد تھی ان کا منتہائے نگاہ ایک تھا۔ اس لئے کہ الدین انسانوں کے لئے ایک ہے اور یہ حضرات اسی الدین کی اشاعت و تنفیذ کے لئے آتے تھے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ؀ (۴۲/۱۳)

(اور دیکھو) اللہ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اُس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جسے ہم نے (اے پیغمبر اسلام) تمہارے پاس وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم، موسیٰ، اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ اس الدین کو (جو سب کے لئے واحد ہے) قائم رکھنا اور اس میں فرقہ فرقہ نہ بن جانا!

مشرکین کو یہ بات جس کی طرف تم انہیں دعوت دے رہے ہو بڑی ہی گراں گزری۔ (کیا یہ گرانی تم پر حسد کی وجہ سے ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس میں تمہارا کیا قصور؟) اللہ جسے چاہتا ہے اپنے لئے برگزیدہ کر لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اُسے اپنی راہ دکھا دیتا ہے!

نہ صرف کسی ایک زمانہ کے انسانوں کے لئے الدین ایک تھا بلکہ ہر زمانہ میں ایک تھا۔ اس لئے کہ مستقل اقدار ہمیشہ یکساں رہتی ہیں۔ طبعی دنیا میں دیکھئے۔ سنکھیا جس طرح حضرت نوحؑ کے زمانہ کے

انسانوں کے لئے قاتل تھا اسی طرح آج بھی ہلک ہے جس طرح افرنگ کے پریزاد انسان کے لئے مہلک ہے اسی طرح افریقہ کے حبشی کے لئے بھی زہر ہے۔ پانی جس طرح سامی النسل انسانوں کے لئے مدِ حیات ہے اسی طرح ایرین اقوام کے لئے بھی معاون زندگی ہے۔ جس طرح انسان کی طبیعی زندگی کے خواص و اثرات کی یہ کیفیت ہے اسی طرح اس کی عمرانی۔ معاشرتی۔ عائلی۔ سیاسی۔ غرضیکہ حیاتِ اجتماعیہ کے ہر گوشے کی یہی حالت ہے۔ جو چیز آج سے دس ہزار برس پیشتر اس کے شجرِ حیات کی کسی شاخ کے لئے وجہ شگفتگی و شادابی تھی وہی آج بھی باعثِ نزہت و لطافت ہے۔ جو ایران میں موجب افسردگی و پژمردگی تھی وہ یونان میں بھی باعثِ ہلاکت و بربادی تھی۔ اس لئے کہ انسانی تقاضے اختلاف زمان و مکان سے مختلف نہیں ہو جاتے اور ۲ اور ۲ آج سے پانچ ہزار سال پیشتر بھی اسی طرح چار تھے جس طرح آج۔ اور افلاطون کی عقل اور فیثاغورث کے قواعد کی رُو سے بھی ان کا نتیجہ وہی چار تھا جو ایک دہقانی گنوار کے ٹھیکریوں سے گن لینے کا۔ لہٰذا ان حضرات انبیاء کرام کی تعلیم کے اصول و اساس ہمیشہ ایک تھے اور انھیں ایک ہونا بھی چاہیئے تھا۔ یہ اصول کیا تھے؟ پھیلانے سے تو ان کے لئے کتابوں کی کتابیں درکار ہوں۔ لیکن سمٹانے سے فقط ایک نقطۂ توحید (یعنی یہ کہ خدا کے نازل فرمودہ قوانین کے علاوہ کسی اور ضابطۂ قوانین کے تابع زندگی بسر کرنا کسی کے لئے جائز نہیں)۔

نقطۂ توحید بالفاظِ دیگر، محکومیت (عبادت) صرف اللہ کی جائز ہے، اس کے سوا کسی اور کی محکومیت (عبودیت) اختیار کرنا شرک ہے۔

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ۝ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ (۳۹ / ۶۴-۶۶)

(اے پیغمبرِ اسلام!) تم کہو کہ کیا تم مجھے اس کا حکم دیتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کروں؟ حالانکہ تمہاری طرف اور اُن لوگوں کی طرف جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں یہ وحی کر دی گئی ہے کہ اگر تم نے خدا کی محکومیت میں کسی اور کو شریک کر لیا تو تمہارے اعمال بیکار ہو جائیں گے۔ تم ان لوگوں میں ہو جاؤ گے جو خسارہ اور نقصان اٹھاتے ہیں۔ تم ہمیشہ اللہ کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو اور شکر گزار بندوں میں سے بن جاؤ!

یہ تھی مرکزی تعلیم۔ یہ تھا بنیادی پیغام۔ لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ان حضرات ؑ کا کام فقط تبلیغ و رسالت (یعنی پیغام رسانی) نہ تھا۔ بلکہ عملاً اس نظام کو قائم کرنا تھا جس کی رُو سے عبدیت فقط

مرکزی حکومت کی اطاعت

قوانینِ الٰہیّہ کی رہ جائے۔ اس نظام کے قیام کے لئے مرکزِ حکومت کی اطاعت نہایت ضروری تھی۔ اس لئے اس اصول کی نشر و اطاعت کے ساتھ یہ بھی ارشاد تھا کہ

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ○ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ○ (۴۳/۶۴)

پس قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اور میری (یعنی مرکزِ حکومت کی) اطاعت کرو، بلاشبہ اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ لہٰذا اُسی کی عبودیت (اطاعت و محکومیت) اختیار کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔!

یعنی قوانینِ الٰہیّہ کی اطاعت انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ یہ تو دیئے ہی اس لئے جاتے ہیں کہ تعیینِ حدود و قیود سے انسان کی حیاتِ اجتماعیہ میں نظم و ضبط قائم رکھ سکیں جس کا نتیجہ عدل و اصلاح ہو۔ یعنی ہر فرد کو وہ سب کچھ مل جائے جس کا وہ مستحق ہے اور ایسی فضا پیدا کر دی جائے جس میں اس کے جوہر انسانیت پوری طرح نشو و نما پاکر، اپنے اندر ایسی صلاحیت پیدا کر لیں جس سے یہ پیکرِ آب و گِل اس دنیاوی زندگی سے اگلی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے اور یوں حال و مستقبل کی تمام سرفرازیاں اور کامرانیاں اس کے قدم چومیں۔ لیکن ایک مرتبہ اس حقیقت کو پھر اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ رسولوں کی یہ اطاعت ان کی ذات کی اطاعت نہ تھی۔ بلکہ حتماً و اصلاً اس ضابطۂ قوانین کی اطاعت تھی جو انھیں منجانب اللہ عطا ہوتا تھا۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ○ (۳/۷۹)

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اُسے (انسان کی ہدایت کے لئے) کتاب اور حکومت اور نبوت عطا فرمائے، اور پھر اس کا شیوہ یہ ہو کہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ (یعنی خدا کے احکام کی جگہ میرے حکموں کی اطاعت کرو) بلکہ وہ یہی کہے گا کہ تمھیں چاہیئے کہ ربانی انسان بنو۔ اس کتاب کے ذریعے جس کی تم تعلیم دیتے رہتے ہو، اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو۔

وہ خدا پر ایمان لانے کی منادی کرتے اور اسی کی اطاعت سکھلاتے تھے۔

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ (۳-۱۹۳)

خدایا! ہم نے ایک منادی کرنے والے کی منادی سنی، جو ایمان کی طرف بلا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ: لوگو! اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ، تو ہم نے اس کی پکار سن لی اور ایمان لے آئے۔ پس خدایا! ہماری حفاظت فرما۔ ہماری برائیاں مٹا دے، اور (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کر کہ ہماری موت نیک کرداروں کے ساتھ ہو!

خدا کے عبد اور ان کی خود سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اللہ کے محکوم اور غلام تھے۔

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ٥ (۳۸-۴۵)

اور (اے پیغمبر اسلام!) کتاب میں ہمارے (فرمانبردار) بندوں میں سے ابراہیم، اسحق اور یعقوب کا ذکر کرو جو قوت و سطوت اور دانش و بینش کے مالک تھے۔!

غلام اور اس کے محتاج۔

فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ٥ (۲۸-۲۴)

دختران شعیب کے لئے (بکریوں کو) پانی پلا کر موسیٰ سائے کی طرف واپس آگیا اور (خدا سے) مناجات کرنے لگا۔ "خدایا! جو کچھ بھی تو میری طرف بھلائی اتار دے میں اس کا محتاج ہوں۔!"

حتیٰ کہ وہ اپنی ذات کے لئے بھی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے تھے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۗ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ٥ (۷-۱۸۸)

(اے پیغمبر!) تم کہہ دو "میرا حال تو یہ ہے کہ خود اپنی جان کا نفع نقصان بھی اپنے قبضہ میں نہیں رکھتا۔ بجز اس کے جو مشیت خداوندی کے مطابق ہو۔ اگر مجھے غیب کا علم ہوتا

تو ضرور ایسا کرتا کہ بہت سی منفعت بٹور لیتا۔ اور (زندگی میں) کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا۔ میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ماننے والوں کے لئے خبردار کرنے والا اور بشارت دینے والا ہوں!"

لہٰذا ان سب کی تعلیم کی اساس و بنیاد یہی تھی کہ تمام دنیا کے خود ساختہ قوانین و ضوابط سے منہ موڑ کر صرف ایک اللہ کی محکومیت اختیار کی جائے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ○ (۲۱/۲۵)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جس پر ہم نے اس بات کی وحی نہ بھیجی ہو کہ "کوئی معبود (حاکم و مطاع) نہیں مگر میری ذات۔ پس چاہیئے کہ میری ہی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو!

ہر ایک آکر یہی کہتا تھا کہ

قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (۷/۵۹)

اے میری قوم کے لوگو! اللہ ہی کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود (حاکم اور مطاع) نہیں ہے"

شریعت یعنی جزئیات

اساس و بنیاد سب کی تعلیم کی ایک تھی۔ البتہ اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے اعتبار سے تفاصیل و جزئیات میں فرق ہونا لازمی تھا۔ آج سے پانچ ہزار سال پیشتر دنیا کی حالت یہ تھی کہ ایک بستی کے رہنے والوں کے داعیات و مطالبات کا دوسری بستی والوں پر اثر نہیں پڑتا تھا۔ لیکن آج یہ کیفیت ہے کہ ساری دنیا گویا ایک بستی میں سمٹ کر آگئی ہے۔ اور زمان و مکان کے بُعد عہد پارینہ کی داستانیں بن چکی ہیں۔ اس لئے جن بین الاقوامی قوانین و ضوابط کی آج ضرورت ہے اس زمانہ میں ان کا خیال بھی نہیں آسکتا تھا۔ اس لئے ان تمام انبیاء کرامؑ کی تعلیم کی اصل و بنیاد جہاں ایک تھی تفاصیل و جزئیات کے اعتبار سے ان میں ارتقائی امتیاز ضروری تھا۔ بایں ہمہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ ہونے دیجئے کہ ان تفاصیل کے اختلاف سے اصل حقیقت پر کچھ اثر نہیں پڑتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے طرق و انداز کے اختلاف کے باوجود، ان تفاصیل کو اکثر و بیشتر مشترک ناموں سے یاد کیا ہے۔ مثلاً

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ قف وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ

حُسْنًا وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ (۲ ؍ ۸۳ نیز ۴ ؍ ۳۶ : ۶ ؍ ۱۵۲)

اور پھر (وہ وقت) یاد کرو۔ جب ہم نے بنی اسرائیل سے (اتباع شریعت کا) عہد لیا تھا (وہ عہد کیا تھا؟ کیا اسرائیلیت کے گھمنڈ اور یہودی گروہ بندی نجات پانے کا عہد تھا؟ نہیں، ایمان وعمل کا یہ عہد تھا کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبودیت (محکومیت واطاعت) اختیار نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا، عزیزوں قریبیوں کے ساتھ نیکی سے پیش آنا، یتیموں مسکینوں کی خبرگیری کرنا، تمام انسانوں سے اچھے طریق پر ملنا، نظام صلوٰۃ قائم کرنا، زکوٰۃ (یعنی نوع انسانی کی نشوونما کا انتظام کرنا) (ایمان وعمل کی یہی بنیادی سچائیاں ہیں جن کا تم سے عہد لیا گیا تھا) لیکن تم اس عہد پر قائم نہیں رہے، اور ایک قلیل تعداد کے سوا سب نے روگردانی کی، اور حقیقت یہ ہے کہ (ہدایت کی طرف سے) کچھ تمہارے رُخ ہی پھرے ہوئے ہیں!

تفریق بین الرسل؟

چونکہ یہ تمام حضرات انبیاء کرامؑ ایک ہی سلسلۃ الذہب کی مختلف کڑیاں۔ ایک ہی آسمان کے درخشندہ ستارے اور ایک ہی شجر مقدس کی مختلف شاخیں تھیں۔ اس لئے ان کی رسالت و نبوت کے بارے میں ایک دوسرے میں قطعاً کوئی فرق نہ تھا۔ نہ فرق کیا جاسکتا ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۫ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۫ (۲ ؍ ۲۸۵)

اللہ کا رسول اس (کلام) پر ایمان رکھتا ہے جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر نازل ہوا ہے۔ اور جو لوگ (دعوت حق پر) ایمان لائے ہیں، وہ بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سب اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابوں پر، اُس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ (ان کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں) ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی کو دوسروں سے جُدا نہیں کرتے (کہ کسے مانیں، دوسروں کو نہ مانیں، یا سب کو مانیں مگر کسی ایک سے انکار کردیں۔ ہم خدا کے تمام رسولوں کو یکساں رسول مانتے ہیں)

اس لئے کسی ایک رسول پر ایمان لانے والے کے لئے ضروری ہے کہ ان سب پر بلا تفریق و تمیز ایمان لائے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○ (۴-۱۵۲)

اور جو لوگ اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان لائے، اور اُن میں سے کسی ایک کو بھی دوسروں سے جُدا نہیں کیا (یعنی کسی ایک سے بھی انکار نہیں کیا) تو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں کہ (سچے مومن ہیں) اور عنقریب ہم انھیں ان کا اجر عطا فرمائیں گے، اور اللہ حفاظت کرنے والا۔ رحمت رکھنے والا ہے!

فضیلت البتہ ان حضرات کے دائرہ اثر و نفوذ اور خطائر تعلیم و تبلیغ میں بہت فرق تھا۔ ایک رسول صرف ایک بستی کے لوگوں کی تنذیر و تبشیر کے لئے آتا لیکن دوسرا ایک عظیم الشان قوم کی اصلاح و ہدایت کے لئے ایک کا مقابلہ اپنے قریہ کے چند شریر نفوس سے ہوتا اور دوسرا فراعنۂ وقت اور نماییدہ عصر کی طاغوتی قوتوں سے نبرد آزما ہوتا۔ اس اعتبار سے اُن کے مدارج و مناصب الگ الگ تھے اور ایک کو دوسرے پر فضیلت۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ○ (۲-۲۵۳)

یہ ہمارے پیغمبر ہیں، جن میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے (یعنی اگرچہ پیغمبری کے لحاظ سے سب کا درجہ یکساں ہے، لیکن اپنی اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے مختلف درجے رکھتے ہیں) ان میں سے کچھ تو ایسے تھے جن سے اللہ نے کلام کیا۔ بعض ایسے تھے جن کے درجے (ان کے وقتوں اور حالتوں کے مطابق) دوسری باتوں میں بلند کئے گئے، اور (تم سے پہلے) مریم کے بیٹے عیسیٰ کو (ہدایت کی) روشن دلیلیں عطا فرمائیں، اور روح القدس (یعنی وحی) کی تائید سے سرفراز کیا۔ اگر اللہ چاہتا تو (اس کی قدرت سے یہ بات باہر نہ تھی کہ) جو لوگ ان پیغمبروں کے بعد پیدا ہوئے، وہ ہدایت کی روشن دلیلیں پالینے کے بعد پھر اختلاف و

نزاع میں نہ پڑتے اور) آپس میں نہ لڑتے لیکن اس نے انسان کو مجبور پیدا نہیں کیا۔ صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پیغمبروں کے بعد لوگ باہم گر مخالف ہو گئے (اور راہِ ہدایت پر متحد نہ رہے) کچھ لوگوں نے ایمان کی راہ اختیار کی۔ کچھ لوگوں نے کفر کا شیوہ پسند کیا۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ آپس میں نہ لڑتے۔ (یعنی اُن سے اختیار و ارادہ کی قوت سلب کر لیتا) لیکن اُس کا پروگرام یہی تھا کہ ایسا نہ کیا جاتا۔ وہ سب کچھ اپنے پروگرام کے مطابق کرتا ہے۔

بایں ہمہ اختلافِ مدارج و مراتب، یہ تمام حضرات ایک ہی برادری کے افراد تھے،

وَ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝ (۲۳/۵۲)

اور دیکھو یہ تمہاری امت دراصل ایک ہی اُمت ہے اور تم سب کا پروردگار میں ہی ہوں۔ پس (میرے قوانین کی) نگہداشت کرو۔

بشریتِ رسل اوپر لکھا جا چکا ہے کہ ان حضرات انبیاء کرامؑ کا مقصدِ بعثت یہ تھا کہ وہ لوگوں تک ان قوانین کو پہنچاتے جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے وہ شرفِ انسانیت کی تکمیل کر سکتے تھے۔ اور صرف پہنچاتے ہی نہیں بلکہ عملاً اس نظام کو قائم کرتے جس کے ماتحت وہ قوانین نافذ العمل ہوتے۔ اس مقصد (یعنی مقصدِ ثانیہ) کے لئے ضروری تھا کہ حضرات انبیاء کرامؑ انسان ہوتے۔ اس لئے کہ انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے نظم و ضبط کے لئے انسان ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے فرمایا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ (۱۷/۹۵)

کہو کہ اگر زمین پر فرشتے چلتے پھرتے سکونت پذیر ہوتے تو ہم آسمان سے کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے (لیکن چونکہ زمین میں انسان آباد ہیں اس لئے ان کے لئے انسانوں میں سے ہی رسول بنایا جا سکتا ہے۔)

لہٰذا تمام رسول انسان تھے۔ اور انسانوں میں سے بھی صرف مرد۔ کیونکہ نظامِ حکومت کا قیام و استحکام مردانہ ہمت و جسارت کا مقتضی ہوتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى (۱۲/۱۰۹ نیز ۱۶/۴۳ و ۲۱/۷)

(اور اے پیغمبر!) ہم نے تم سے پہلے کسی رسول کو نہیں بھیجا ہے۔ مگر اسی طرح کہ وہ باشندگان شہر میں ہی سے ایک مرد تھا (اور) ہم نے اُس پر وحی اتاری تھی (ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آسمان سے فرشتے اُترے ہوں)

یہ حضرات دوسرے انسانوں کی طرح کھاتے پیتے اور بیوی بچوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ط

.... (۱۳ نیز ۲۵)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تجھ سے پہلے بھی (بے شمار) پیغمبر قوموں میں پیدا کئے، اور (وہ تیری ہی طرح انسان تھے) ہم نے انھیں بیویاں بھی دی تھیں اور اولاد بھی اور کسی پیغمبر کے لئے یہ بات نہ ہوئی کہ وہ (خود) کوئی نشانی لا دکھاتا۔

سورۂ انبیاء میں ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ط اَفَائِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ٥

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے کسی آدمی کو ہمیشگی نہیں دی (اور نہ تیرے لئے ہمیشہ زندہ رہنا ہے) پھر اگر تجھے مرنا ہے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہنے والے ہیں؟

لہذا ان میں الوہیت کا کوئی شائبہ یا مافوق البشر ہونے کا کوئی نشان نہ تھا۔ توہم پرست، کم فہم لوگ اس بات پر معترض بھی ہوتے کہ رسول دوسرے انسانوں سے الگ تھلگ کچھ اور کیوں نہیں ہیں؟

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ط وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ج مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ٥ (۲۳/۲۴ نیز ۵۴/۲۴ ; ۶۴/۶)

اس کی قوم کے جن سرداروں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی، وہ یہ سن کر (لوگوں سے) کہنے لگے یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ تمھارے ہی جیسا ایک آدمی ہے؟ مگر چاہتا ہے کہ تم پر اپنی بڑائی جتائے۔ اگر اللہ کو کوئی ایسی ہی بات منظور ہوتی تو وہ کیا فرشتے نہ اتار دیتا (وہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی کو اپنا پیامبر کیوں بنانے لگا؟) ہم نے اپنے اگلے بزرگوں سے تو کوئی ایسی بات کبھی سنی نہیں۔

لیکن وہ اس حقیقت کو نہ سمجھتے کہ انھیں صحیح راستہ وہی دکھا سکتا ہے جو خود ان میں سے ہو۔ البتہ اُسے مبدأ فیض کی طرف سے یہ راستہ واضح اور بیّن طور پر (بذریعہ وحی) دکھا دیا گیا ہو۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ج فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ٥ (۱۸/۱۱۰)

(تو) کہہ دے "میں تو اس کے سوا کچھ نہیں ہوں کہ تمھارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں۔ البتہ مجھے

مجھ پر وحی کی ہے کہ تمہارا معبود (یعنی حاکم و مطاع) وہی ایک ہے، اس کے سوا کوئی نہیں۔ پس جو کوئی اپنے پروردگار سے ملنے کی آرزو رکھتا ہے چاہیئے کہ اچھے کام انجام دے اور اپنے پروردگار کی عبودیت (اطاعت و محکومیت) میں کسی دوسری ہستی کو شریک نہ کرے۔"

رسول کی فضیلت یہی ہوتی ہے کہ جو علم اس کے پاس ہوتا ہے وہ کسی دوسرے کے پاس نہیں ہوتا۔

يٰۤاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا ۝ (۱۹/۴۳)

"اے میرے باپ! میں سچ کہتا ہوں، علم کی ایک روشنی مجھے مل گئی ہے، جو تجھے نہیں ملی۔ پس میرے پیچھے چل، میں تجھے سیدھی راہ دکھاؤں گا۔"

اور یہ علم (وحی) کسب و ہنر سے نہیں مل سکتا، اللہ کے چشمۂ فیض سے وہبی طور پر ملتا تھا۔

اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ۝ (۲۲/۷۵)

اللہ نے فرشتوں میں سے بعض کو (انبیاء کی طرف) پیام رسانی کے لئے برگزیدہ کر لیا۔ اسی طرح بعض انسانوں کو بھی (دوسرے انسانوں کی طرف پیغام پہنچانے کے لئے منتخب کر لیا) بلاشبہ اللہ ہی ہے سننے والا اور دیکھنے والا۔

اس موہبت کبریٰ میں نسلی امتیاز کو بھی کچھ دخل نہیں ہوتا۔

وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ۝ (۲/۱۲۴)

اور پھر غور کرو، (وہ واقعہ) جب ابراہیم کے لئے اس کے پروردگار نے نمود ذات کے مواقع بہم پہنچائے تھے۔ اور وہ ان میں پورا اترا تھا۔ جب ایسا ہوا، تو خدا نے فرمایا اے ابراہیم! میں تجھے انسانوں کے لئے امام بنانے والا ہوں۔ ابراہیم نے عرض کیا، جو لوگ میری نسل میں سے ہوں گے ان کی نسبت کیا حکم ہے؟ ارشاد ہوا، جو ظلم و معصیت کی راہ اختیار کریں، تو ان کا میرے عہد میں کوئی حصہ نہیں!

رسول کو اس شرف عظیم کے لئے قانون مشیت کے ماتحت خاص طور پر تیار کیا جاتا اور اس طرح یہ اصطفاء و انتخاب عمل میں آتا۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ
اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝ (۱۶/۲)

وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، اس غرض سے چن لیتا ہے کہ اپنے حکم سے فرشتہ الروح کے ساتھ اُس پر بھیجے (یعنی وحی کے ساتھ بھیجے) اور اُسے حکم دے کہ لوگوں کو اس حقیقت سے خبردار کر دو۔ "میرے سوا کوئی معبود (حاکم و مطاع) نہیں ہے۔ پس میرے ہی توانین کی نگہداشت کرو۔

ایک مرتبہ اس حقیقت کو پھر سمجھ لیجئے کہ رسول اپنی بشریت کے اعتبار سے دوسرے انسانوں جیسے ہوتے تھے۔ لیکن اپنی خصوصیت رسالت کے لحاظ سے دوسرے انسانوں سے بالکل الگ تھلگ۔ اس اعتبار سے حضرات انبیاء کرامؑ گویا اپنی ایک مخصوص نوع رکھتے ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے اب مغرب کے مفکرین بھی تسلیم کرتے ہیں (KENNETH WALKER) اپنی کتاب (Meaning And Purpose) میں لکھتا ہے۔

> یہ روحانی راہنما دوسرے انسانوں سے اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ اُنھیں انسانوں کی ایک جداگانہ نوع کہنا چاہیئے۔ یہ اور صرف یہی وہ لوگ ہیں جو انسانی تجربہ کے اس مقام پر پہنچے ہوتے ہیں جو برگسان اور اوسپنسکی کے خیال کے مطابق انسانیت کا آخری مقام ہے۔ وہ صفات جو انسان کو حیوان سے متمیز کرتے ہیں۔ یعنی شعور اور روحانی اقدار کا علم، ان میں اپنی تکمیل کو پہنچا ہوتا ہے۔ یہ لوگ درحقیقت حیات کی ایک نئی سطح پر جلوہ افروز ہوتے ہیں اور روحانی اعتبار سے دوسرے انسانوں سے اسی طرح مختلف ہوتے ہیں جس طرح تتلیاں اُن پتنگوں سے مختلف ہوتی ہیں جن کی ارتقاء یافتہ شکل وہ خود ہیں۔ برگسان کا خیال ہے کہ ہم حیات کے ارتقاء کو اسی صورت میں سمجھ سکتے ہیں جب ہم اسے اس نقطۂ نظر سے دیکھیں کہ یہ کسی ایسی منزل کی تلاش میں ہے جو اس کی دسترس سے باہر ہے، وہ منزل جس تک روحانیت والے انسان ہی پہنچ سکتے ہیں۔ اگر اس بلندی تک جس تک یہ مخصوص انسان پہنچ چکا ہے تمام انسان یا انسانوں کی اکثریت بھی پہنچ سکتی تو فطرت نوعِ انسانی تک ہی رک نہ جاتی۔ اس لئے کہ یہ انسان دوسرے انسانوں سے یقیناً آگے ہوتے ہیں۔ (P. 96)

اسی خصوصیت عظمیٰ کے ماتحت نبی کا قلب منورِ مہبطِ وحی قرار پاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ حکومت الٰہیہ کا اوّلین مرکز بنتا ہے۔ اس لئے قوانین الٰہیہ کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے جہاں اس کی رسالت کی تصدیق ضروری ہوتی ہے وہاں اس کی اطاعت بھی لازمی ہوتی ہے، کہ اطاعت کے بغیر نظام قائم ہی نہیں رہ سکتا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ...... (۴/۶۴)

اور (اے پیغمبر ان لوگوں کو جو تمہاری اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو انہی کے ساتھ ہوئی ہو) ہم نے جس کسی کو بھی منصب رسالت دے کر دنیا میں کھڑا کیا، تو اسی لئے کیا، کہ ہمارے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

اس عظیم الشان مقصد کو لے کر رسول آتا تھا۔ جب وہ آتا تو اس کے دائرۂ تبلیغ کی حالت یہ ہوتی کہ ہر شعبۂ زندگی میں خدائی قوانین کی جگہ انسانوں کے خودساختہ رسوم و آئین عمل پیرا ہوتے۔ اسی کا نام فساد ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ (۳۰/۴۱)

جو کچھ لوگوں نے اپنے ہاتھوں کیا دھرا اُس کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد پھیل رہا ہے (اور قانون مکافات اس کا مقتضی ہوتا ہے کہ) ان لوگوں کو کچھ تو اُن کے کئے کا مزا چکھا دے۔ شاید (اس طرح) یہ لوگ باز آجائیں!

تبشیر و تنذیر اس کا کام یہ ہوتا کہ وہ انسانوں کی اس خودساختہ دنیا کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے اس کی بنیادوں تک کو اکھیڑ دے اور اس کی جگہ بالکل نئی بنیادوں پر ایک جہانِ نو تعمیر کرے جس میں ہر شے قوانین خداوندی کے مطابق اپنی اپنی جگہ سرگرم عمل ہو۔ اس کے لئے وہ انھیں غیر خدائی آئین و ضوابط کی ہلاکت سامانیوں سے آگاہ کرتا (تنذیر) اور آسمانی نظامِ زندگی کے درخشندہ نتائج کی بشارت دیتا۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ ۚ فَمَنْ آمَنَ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝ (۶/۴۸-۴۹ نیز ۱۸/۵۶)

اور (ہمارا قانون تو یہ ہے کہ) ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے مگر اس لئے کہ (ایمان و عمل کی برکتوں کی) خوش خبری سنائیں اور انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرائیں۔ پھر جو کوئی یقین لایا، اور اُس نے اپنے اندر صلاحیت مطلوبہ پیدا کرلی۔ تو اُس کے لئے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہوگا، نہ کسی طرح کی غمگینی مگر جن لوگوں نے ہماری آیتیں جھٹلائیں، تو فاسق ہونے کی وجہ سے ضروری ہے کہ ہمارے عذاب کی لپیٹ میں آجائیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس دعوتِ انقلاب کی ہر طرف سے مخالفت ہوگی۔ جو لوگ دوسروں کے حقوق غصب کئے بیٹھے ہوں وہ بھلا کب چاہتے ہیں کہ شکار کا جانور ان کے دانتوں سے نکل جائے۔ غیر خدائی نظام میں اربابِ قوت وحکومت اور ارکینِ مذہب دونوں اپنی اپنی خدائی کی مسندوں پر متمکن ہوتے ہیں۔ رسول کی دعوت کا مفہوم یہی ہوتا ہے کہ خدا کے بندوں کو ان مستبد قوتوں کے پنجۂ قہاریت سے چھڑا کر آزادی کی فضائے بسیط میں اذنِ بال کشائی دے۔ اس لئے ان کی طرف سے مخالفت ہوتی ہے۔ اور سخت ترین مخالفت۔

مخالفت

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّ نَصِيْرًا ۝ (۲۵/۳۱)

اور (دیکھو، ہمارا یہی دستور ہے کہ) اسی طرح مجرم لوگوں میں سے ہم نے ہر نبی کے دشمن پیدا کردیئے ہیں۔ اور تیرا پروردگار ہی رہنما اور مددگار ہونے کی حیثیت سے کافی ہے (ان لوگوں کی مخالفتیں دعوتِ حق کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گی۔)

ان مجرمین کو دوسری جگہ مترفین کہا گیا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَا ۙ اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ (۳۴/۳۴)

اور (دیکھو، ہم نے کسی بستی میں (انکار و بدعملی کے نتائج سے) کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر ہمیشہ اس کے خوش حال لوگوں نے یہی کہا کہ جن تعلیمات کے ساتھ تمھیں بھیجا گیا ہے ہم انھیں ماننے والے نہیں!

مترفین کے معنے ہیں سہل انگاری اور عیش پسندی کی زندگی بسر کرنے والے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جائیں (خواہ وہ جاگیرداری کی شکل میں ہو یا فتوحاتِ خانقاہی کی صورت میں) انھیں جد وجہد کی زندگی موت کی مصیبت دکھائی دے گی۔ اس لئے ان سب کی طرف سے اس دعوت کی مخالفت ہوگی۔ سرمایہ دار، تعلقہ دار، اربابِ حکومت و اقتدار، مسانید فتاویٰ و ارشاد کے اجارہ دار، تمام متحدہ و متفقہ طور پر اس آواز کو دبانے کے لئے محاذ قائم کرلیں گے۔ باقی رہے عوام۔ سو ان کے جسم، قیصریت کی زنجیروں میں جکڑے اور ان کے دل برہمنیت کے پھندوں میں پھنسے ہوتے ہیں۔ یہ ہوتی ہے وہ فضا جس میں ایک داعیٔ انقلاب دنیا کو حق پرستی کی طرف بلاتا ہے۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ رسول کا مقصد کس قدر عظیم اور اس کی مہم کیسی صبر آزما اور زہرہ گداز ہوتی ہے۔ ہجومِ مخالفت میں

ایک بہت بڑا ہمت شکن مقام استہزاء کا ہوتا ہے۔ آپ نہایت متانت و سنجیدگی سے ایک بات کہتے ہیں متوقع ہیں کہ دوسرا بھی متانت و سنجیدگی سے اس پر غور کرے گا۔ اپنے شکوک و شبہات کو پیش کرے گا۔ آپ ان کا تسکین بخش جواب دیں گے۔ اسے دعوتِ غور و فکر دیں گے۔ اس کی بصیرت کو اپیل کریں گے۔ اس راہ میں آپ کو

استہزاء

کتنی ہی مشکلات پیش آئیں اور کتنا ہی زیادہ وقت کیوں نہ صرف ہو آپ ہمت نہیں ہاریں گے۔ لیکن اگر آپ کی متانت و سنجیدگی کے جواب میں آپ کا مذاق اڑا دیا جائے۔ غور و فکر کے بجائے تمسخر و استہزاء سے پیش آیا جائے۔ آپ کی دعوتِ بصیرت افروز کا استقبال ایک حقارت آمیز ہنسی اور نفرت انگیز قہقہہ سے کیا جائے تو اس ہمت شکن اور صبر آزما مرحلہ سے گزرنے کے لئے کوہ تمثال استقلال اور فلک پیما حوصلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ رسولوں کو سب سے پہلے اسی وادیٔ جگر دوز سے گذرنا پڑتا ہے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝ (۱۳/۳۲)

اور (اے پیغمبر) تجھ سے پہلے بھی ایسا ہی ہو چکا ہے کہ پیغمبروں کی ہنسی اڑائی گئی۔ اور ہم نے (اپنے مقررہ قانون کے مطابق) پہلے انہیں ڈھیل دی، پھر گرفتار کر لیا۔ تو دیکھو، ہمارا ٹھہرایا ہوا بدلہ کیسا تھا اور کس طرح ظہور میں آیا؟

ہر ایک کی ہنسی اڑائی گئی۔

وَمَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ (۱۵/۱۱؛ ۴۳/۷)

لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی گروہ میں کوئی پیغمبر آیا اور لوگوں نے اس کی ہنسی نہ اڑائی ہو (یہ پہلے سے ہوتا آیا ہے، اور اب بھی ہو رہا ہے)

سورۂ انبیاء میں ہے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ (۲۱/۴۱)

اور (اے پیغمبر!) یہ واقعہ ہے کہ تجھ سے پہلے بھی پیغمبروں کی ہنسی اڑائی جا چکی ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہی نکلا کہ وہ جس بات کی ہنسی اڑاتے تھے (ظہورِ نتائج کی) وہی بات ان پر چھا گئی۔

کبھی انہیں ساحر کہا جاتا۔ کبھی مجنون قرار دیا جاتا۔

كَذَٰلِكَ مَا أَتَى الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ۝ (۵۱/۵۲)

(اور دیکھو) اسی طرح ان سے پہلے بھی کوئی رسول نہیں آیا مگر (اُن کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا کہ)
لوگوں نے کہا ("یہ تو، کوئی) ساحر ہے یا مجنون ہے"!

"ساحر" کے معنی جادوگر ہی نہیں۔ جھوٹا اور فریب کار بھی ہیں۔ اس سے آگے بڑھتے تو ان کی عملاً تکذیب کی جاتی۔

وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ عَادٌ وَّ ثَمُوْدُ ○ (۴۲/۲۲ نیز ۳۵/۴، ۲۵)

اور (اے پیغمبر!) اگر یہ (منکر) تجھے جھٹلائیں، تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) ان سے پہلے کتنی ہی قومیں اپنے وقتوں کے رسولوں کو جھٹلا چکی ہیں۔ قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود

سورۂ سبا میں ہے۔

وَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ ۣ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ○ (۴۵/۳۴)

اور (دیکھو) ان سے پہلی قوموں نے بھی (ہمارے رسولوں کو جھٹلایا تھا) اور یہ لوگ تو اب تک اُس (طاقت وقوت) کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں کر سکے جو ہم نے اُن (پچھلی) قوموں کو دیا تھا۔ چنانچہ (یاد کرو) انھوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا تو میری ناپسندیدگی کیسی رہی! (کہ آج صفحۂ ہستی پر اُن قوموں کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہا۔

اسلاف پرستی

دوسری طرف ارباب مذہب (علماء و مشائخ) کو لیجئے۔ وہ اس دعوت کی تکذیب وتردید کے لئے اس سے زیادہ کسی دلیل کی ضرورت ہی نہ سمجھتے کہ یہ تعلیم اُس روش کے خلاف ہے جو اُن کے آباء واجداد سے اُن تک متوارث چلی آئی ہے۔ یعنی اسلاف پرستی ہمیشہ حقیقت پرستی پر غالب آتی اور بزرگوں کی اندھی تقلید ہر سچائی کی مخالفت پر آمادہ پیکار کر دیتی۔

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓي اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓي اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ○ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓي اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓي اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ○ (۴۳/۲۲-۲۳)

(اُنھوں نے سچائی کو قبول نہیں کیا) بلکہ کہنے لگے" ہم نے اپنے آبا واجداد کو ایک طریقہ پر چلتے پایا ہے اور ہم لوگ اُن کے نقوش قدم پر (چل کر) ہی ہدایت یاب ہو سکتے ہیں"۔ اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے کسی آبادی میں کوئی (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والا

نہیں بھیجا مگر وہیں کے) اُن کے عیش پسند اور تن آسان لوگوں نے یہی کہا "ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک طریقہ پر چلتے پایا ہے اور ہم لوگ اُن کے نقشِ قدم کی پیروی کرتے رہیں گے"۔

غور کیجیے۔ یہاں اسلاف پرستی اور کورانہ تقلید کی روش پر چلنے والوں کو بھی مُتْرَفِیْن کہا گیا ہے۔ اس لئے غور و فکر کے بعد کسی راہِ عمل کو اختیار کرنے کے لئے بڑی محنت اور ذہنی جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس تقلید کی لکڑی کے سہارے کسی متوارث روش پر آنکھیں بند کر کے چلے جانا نہایت آسان ہے۔ اس لئے آپ نے دیکھا ہو گا کہ جو لوگ اسلاف پرستی کی راہیں اختیار کئے ہوں اُن کے قوائے عملیہ مفلوج اور ذہن کی فکری صلاحیتیں معطل ہو جاتی ہیں۔ وہ تن آسانی اور سہل انگاری کی زندگی کے عادی بن جاتے ہیں اور مجاہدانہ روش اُنھیں مصیبت نظر آتی ہے (خواہ یہ جدوجہد جسمانی ہو یا ذہنی) اُسی طرح جیسے ایک خاندانی امیر کو (جس نے دولت کو خود نہ کمایا ہو بلا استعداد و اہلیت ورثہ میں پا لیا ہو) محنت و مشقت کی سپاہیانہ زندگی چھلاوا بن کر ڈراتی ہے۔ قرآن کریم نے جہاں پہلی آیات میں) اس قسم کے سہل انگاروں اور عیش پسندوں کو مترفین کہا ہے وہاں (مؤخرالذکر آیات میں) اسلاف پرستی کی روش میں ذہنی سہل انگاری کی زندگی بسر کرنے والوں کو بھی مترفین قرار دیا ہے۔ ویسے بھی۔ مذہبی راہ نما خود کوئی کام نہیں کرتے۔ وہ دوسروں کی کمائی پر جیتے ہیں۔ اور اس انداز سے کہ لوگ اُنھیں نذرانے بھی دیتے ہیں اور ہاتھ پاؤں بھی چومتے ہیں۔ لیکن قرآن نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ اس روشِ زندگی کا انجام ہلاکت اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۲۵/۴۳)

چنانچہ ہم نے اُنھیں اُن کی غلط روش کی سزا دی۔ تو (اے پیغمبر!) دیکھو ان جھٹلانے والوں کا انجام کیسا رہا؟

مترفین مترفین کے تذکرے پر ایک بار پھر غور کیجیے۔ یہ وہ تن آسانی کی زندگی بسر کرنے والے ہیں جو دوسروں کی محنت کی کمائی سے اپنی عیش پرستی کے سامان فراہم کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے انھیں دو جماعتوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک مجرمین، جو اپنی کثرتِ مال و اولاد (قوت و حشمت) پر نازاں ہوتے ہیں اور دوسرے ارباب مذہب (علماء و مشائخ) جو اسلاف پرستی کے مقدس نقاب میں حق کی مخالفت کرتے ہیں۔ تاریخ عالم پر غور کیجیے۔ دعوتِ انقلاب کی مخالفت ہمیشہ انہی دو گوشوں سے اُبھرتی نظر آئے گی۔ ایک گوشۂ قیصریت اور دوسرا شعبۂ برہمنیت۔ اس لئے کہ یہ دونوں گوشے دوسروں کی گاڑھے پسینہ کی کمائی پر تن آسانی اور سہل انگاری کی زندگی بسر کرنے کے خوگر ہوتے ہیں۔ ذرا اندازہ لگائیے کہ ایک شخص دس ہزار ایکڑ قطعۂ اراضی کا مالک ہے جو اسے بلا محنت و مشقت ورثہ میں مل گئی ہے۔ ہزاروں کاشتکار صبح

تمام۔ کپکپاتے جاڑے اور چلچلاتی دھوپ میں لہو پانی ایک کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کے حصہ میں سوکھے ٹکڑے بھی نہیں آتے اور یہ تن آسان (مترف) حریر و اطلس کے نرم و نازک لباسوں میں ملفوف۔ افرنگی صوفوں اور ایرانی قالینوں پر بیٹھنے والا بلا محنت و مشقت ان غریبوں کا خون چوس لیتا ہے۔ یہ قیصریت کی ایک چھوٹی سی جھلک ہے۔ دوسری طرف برہمنیت کو دیکھئے تو ان کا غلبہ و استیلاء قیصریت سے بھی بڑھ کر محکم اور استوار ہوتا ہے۔ قیصریت کی حکومت جسموں پر ہوتی ہے اور اسے قائم رکھنے کے لئے بہت سی تدابیر کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن برہمنیت کی حکومت دلوں پر ہوتی ہے اور اس کے لئے سوائے اس کے کہ عوام کو اندھی عقیدت اور اوہام پرستی کی جہالت میں رکھا جائے اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قیصریت کو پھر بھی یہ فکر دامنگیر رہتی ہے کہ محکوم کہیں اپنی زنجیریں توڑ کر بھاگ نہ جائے۔ لیکن برہمنیت کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اگر کسی اسیر حلقۂ عقیدت کی زنجیر کو ٹوٹے بھی دیکھئے تو وہ آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں اور لرزتے ہوئے دل سے گڑگڑاتا ہوا آگے بڑھتا ہے، اس ٹوٹی ہوئی زنجیر کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو مژگانِ عقیدت سے چنتا اور زنجیر کو کسی نہ کسی طرح جوڑ کر نہایت عجز و الحاح سے پھر اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے۔ سوچئے کہ اس گوشۂ برہمنیت (یعنی بہت خانقاہیت و ملائیت) سے حضرات انبیاء کرامؑ کے پیغامِ انقلاب کی مخالفت کیوں نہ ہوگی؛ اس لئے کہ دعوت انقلاب میں تمام مترفین (دوسروں کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کرنے والوں کی موت پوشیدہ ہوتی ہے۔ لہٰذا قیصریت اور خانقاہیت دونوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوتی ہے اور سخت ترین مخالفت۔ اور بسا اوقات یہ دونوں مل کر اس دعوت کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر لیتے ہیں۔ قیصریت کے پاس مادی قوت موجود ہوتی ہے لیکن برہمنیت کے پاس اس سے بھی کہیں زیادہ موثر حربے ہوتے ہیں۔ وہ عوام کو یہ کہہ کر مشتعل کرتے ہیں کہ دیکھو، یہ شخص کہتا ہے کہ وہ طریقہ جس پر تمہارے آباء و اجداد۔ تمہارے بڑے بزرگ۔ مقدس اسلاف چلتے آئے ہیں وہ طریقہ غلط ہے، میرا طریقہ صحیح ہے! یہ ایسا حربہ ہے کہ اس میں نہ کسی مادی قوت کی ضرورت پڑتی ہے نہ دلیل و برہان کی۔ انھوں نے عوام کے دلوں پر اسلاف پرستی کی عقیدت اس درجہ گہرے طریق پر نقش کر رکھی ہوتی ہے کہ ان کے جذبات فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی پوری قوتوں کے ساتھ اس دعوت کی مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ چونکہ قیصریت، برہمنیت کی اس قوت سے واقف ہوتی ہے، اس لئے وہ اس کے ساتھ گہرا گٹھ جوڑ رکھتی ہے۔ کھشتری (راجہ) برہمن کی رکھشا (حفاظت) کرتا ہے اور برہمن اسے ایشور کا اوتار قرار دے کر اسے اشیرباد دیتا ہے۔ پادری، بادشاہ کو "ایمان کا محافظ" (Defender of The Faith) قرار دے کر اس کے الوہیاتی حقوق (Divine Rights) کا مبلغ بنتا ہے اور بادشاہ، کلیسا کے لئے جاگیریں وقف کرتا ہے۔

مُلّا، سلاطین کو ظلّ اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) قرار دے کر، محراب و منبر پر اس کے حق میں دعائیں کرتا ہے۔ اور سلطان ان کے روزینے مقرر کرتا ہے۔ یہ سلسلہ شروع سے اسی طرح چلا آتا ہے۔ قیصریت، داعیٔ انقلاب کے مقابلہ میں خود آگے نہیں بڑھتی۔ برہمنیت کو پیش پیش رکھتی ہے۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ صاحبِ ضربِ کلیمؑ کے مقابلہ میں فرعون خود نہیں آیا۔ اس نے ہامان کے جیوش و عساکر کو آگے کیا تھا۔

اس سے آپ نے یہ بھی اندازہ لگا لیا ہو گا کہ حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت سے مقصود فقط چند اخلاقی ضوابط کا پیش کرنا یا پوجا پاٹ (پرستش) کی چند رسومات کا رائج کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس پورے نظام کو الٹ دینا ہوتا ہے جس کی رُو سے مجرمین کے ایسے ایسے گروہ انسانی حقوق کو غصب کئے ہوتے ہیں۔ وہ نوعِ انسانی کے غصب شدہ حقوق کو ان غاصبوں کے دستِ تغلب سے چھین کر اس مقام میں بطورِ امانت رکھ دیتے ہیں جہاں ان کی تقسیم صحیح عدل و انصاف کے خطوط پر ہوتی ہے۔ ورنہ آپ سمجھتے ہیں کہ اگر حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت سے مقصود فقط اتنا ہو کہ لوگو۔ جھوٹ نہ بولو۔ زنا مت کرو۔ ایک گوشہ میں بیٹھ کر یوں اللہ اللہ کر لیا کرو۔ تو دنیا میں کون ہے جو اس تعلیم کی یوں مخالفت کرے گا؟ اس میں شبہ نہیں کہ وہ اخلاق کے ضوابط اور تعظیم و نیایشِ معبودِ حقیقی کے سچے مناسک و مراسم (بھی) سکھاتے ہیں۔ لیکن اس تمام تعلیم سے مقصد حکومتِ الٰہیہ کے نظام کو مستحکم کرنا ہوتا ہے۔ چونکہ حضرات انبیائے کرامؑ کو اس قسم کے سرکش مجرمین کے تغلب و تسلط کو توڑ کر اس کی جگہ نظامِ خداوندی کو قائم کرنا ہوتا ہے اس لئے اس عظیم الشان مقصد کے لئے انھیں بڑی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ﴿۴۵/۳۸﴾

اور (اے پیغمبر! کتاب میں) ہمارے (مخلص) بندوں ابراہیمؑ، اسحاقؑ، اور یعقوبؑ کا ذکر کرو جو صاحبِ قوت اور مالکِ بصیرت تھے۔

قوتوں کے مالک

اس میں کسے کلام ہے کہ جہاں تک سیرت و کردار کی قوتوں کا تعلق ہے حضرات انبیاء کرامؑ شرفِ انسانیت کے معراجِ کمال پر ہوتے ہیں۔ لیکن وہ انقلاب جو ان کے ہاتھوں سے معرضِ وجود میں آنے والا ہوتا ہے اس کے لئے خارجی (مادی) قوتوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کیرکٹر کی قوت بہت بڑی قوت ہے۔ اور پھر "کیرکٹر" بھی محض مغربی اصطلاح میں نہیں بلکہ وہ سیرت جو تقویٰ سے مستحکم ہوتی ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مادی قوتیں بھی لاینفک ہیں۔ اگر یہ انقلاب محض سیرت کی قوتوں سے پیدا ہو سکتا تو حضرات انبیاء کرامؑ اور ان کے رفقاء کی مقدس جماعتوں کو اولی الایدی (منا

دست و بازو) ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں ان حضرات کا مسلک ایک عجیب و غریب امتزاج سامنے لاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر منتہائے نگاہ محض (تزکیۂ نفس) کی رُو سے انفرادی نجات سمجھا جائے تو یہ رہبانیت ہے اگر مادی قوتوں کو قوانینِ خداوندی سے الگ کر دیا جائے تو یہ چنگیزیت۔ اور اگر ان دونوں کو یکجا کر دیا جائے تو یہ اسلام ہے۔ اس لئے حضرات انبیاء کرامؑ کی تعلیم کی رُو سے تقویٰ اور مادی قوتوں دونوں کا ساتھ ساتھ چلنا نہایت ضروری ہے۔ ایسی مادی قوتیں جن کے متعلق فرمایا۔

مادی قوتیں

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (۸/۶۰)

اور (مسلمانو!) جہاں تک تمہارے بس میں ہے، قوت پیدا کرکے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ کے لئے اپنا ساز و سامان مہیا کئے رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ کے (کلمۂ حق کے) اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے۔ نیز ان لوگوں کے سوا اوروں پر بھی جن کی تمھیں خبر نہیں۔ اللہ انھیں جانتا ہے۔ اور (یاد رکھو) اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کی تیاری میں) تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے، وہ تمھیں پورا پورا مل جائے گا۔ ایسا نہ ہو گا کہ تمھاری حق تلفی ہو۔

بَرّ و بحر (خشکی اور تری۔ حکومت اور مذہب) کی ان فساد انگیزیوں میں خدا کا رسول اپنی دعوتِ انقلاب لے کر اٹھتا اور مخالفتوں کے اس ہجوم اور مزاحمتوں کی اس یورش میں اپنی پکار کو برابر جاری رکھتا اس لئے کہ استقامت و استقلال۔ اور ہمت اور حوصلہ۔ ان حضراتؑ کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَ لَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ بَلٰغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (۴۶/۳۵)

(تو اے پیغمبر اسلام! تم بھی (ان لوگوں کی مخالفت کے علی الرغم) اسی طرح ثابت قدم رہو جیسے (تم سے پہلے بہت سے) اولوالعزم پیغمبر ثابت قدم رہے ہیں۔ ان کے لئے (مکافاتِ عمل میں) جلدی نہ کرو، جس دن وہ عذاب انھیں نظر آئے گا جس کی اُن کو دھمکیاں دی گئی ہیں تو ان کا

اس طرح نام و نشان مٹا دیا جائے گا، گویا وہ (دنیا میں) دن کے ایک گھنٹہ سے زیادہ ٹھہرے ہی نہیں۔ (یاد رکھو، یہ ایک اظہارِ حقیقت ہے دھمکی نہیں ہے) چنانچہ صرف نافرمان قومیں ہی ہیں جو ہلاک کر دی جایا کرتی ہیں۔

نصرتِ خداوندی پاؤں میں استقامت اور نگاہیں قوانینِ خداوندی کے نتائج کی طرف۔ جسے خدا کی نصرت کہتے ہیں۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝ (۲/۲۱۴)

پھر کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ (محض ایمان کا زبانی دعویٰ کر کے) تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے (اور مومن ہونے کے لئے سعی و عمل کے میدان میں کامیاب ہونا ضروری نہیں؟) حالانکہ ابھی تو تمہیں ان تصادمات کا سامنا ہی نہیں کرنا پڑا جو تم سے پہلے لوگوں کو پیش آ چکے ہیں۔ ہر طرح کی سختیاں اور محنتیں انہیں پیش آئیں، شدتوں اور ہولناکیوں سے اُن کے دل دہل گئے۔ یہاں تک کہ اللہ کے رسول اور جو لوگ ایمان لائے تھے پکار اٹھے "نصرتِ الٰہی! تیرا وقت کب آئے گا؟" (اور اپنے وقت پر خدا کی نصرت یہ کہتی ہوئی نمودار ہو گئی) "ہاں، گھبراؤ نہیں، خدا کی نصرت تم سے دور نہیں!"

قوم کی طرف سے مخالفت اور مزاحمت کی انتہا ہو جاتی ہے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۠ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۢ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ ۣ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝ (۴۰/۵)

(اور اے پیغمبرِ اسلام!) ان لوگوں سے پہلے قوم نوح اور قوم نوح کے بعد دوسری جماعتیں (اپنے اپنے رسولوں کو) جھٹلا چکی ہیں۔ ان میں سے ہر جماعت نے اپنے رسول کے متعلق یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اُسے ہلاک کر ڈالے اور کذب و افترا کے ساتھ انہوں نے مقابلہ کیا تاکہ اس طرح وہ حق کو شکست دے سکیں لیکن بالآخر میں نے (یعنی میرے قانونِ مجازات نے) انہیں پکڑ لیا تو دیکھو، میرا عذاب کیسا (دردناک اور تباہ کن) ثابت ہوا۔

لیکن اُن کے پائے استقلال میں ذرا لغزش نہ آتی۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰى اَتٰهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ لَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (۶:۳۴)

اور (دیکھو) یہ واقعہ ہے کہ تم سے پہلے بھی خدا کے رسول جھٹلائے گئے۔ سو انھوں نے لوگوں کے جھٹلانے اور اذیت دینے پر استقامت کا ثبوت دیا۔ یہاں تک کہ (بالآخر) ہماری مدد آ پہونچی، اور (یاد رکھو، یہ اللہ کا مقررہ قانون ہے) کوئی نہیں جو اس کی ٹھہرائی ہوئی باتوں کو بدل دینے والا ہو۔ اور رسولوں کے حالات میں سے بعض کے حالات تو تم تک پہنچ ہی چکے ہیں۔

مصالحت کی کوشش

جب مخالفت سے کام نہ چلتا تو کوشش کی جاتی کہ رسول اپنے اصولوں میں کچھ کمی کر دیں اور ان کی غلط روش کی کچھ رعایت رکھ دیں۔ کچھ وہ جھکیں۔ کچھ یہ بڑھیں۔ اور یوں بین بین ان سے صلح کر لی جائے۔ لیکن حق تو کہتے ہی اسے ہیں جو اپنی جگہ پر اٹل ہو۔ اس لئے اس کی باطل سے مفاہمت کیسی؟ کیا آپ نے کبھی روشنی اور اندھیرے میں مفاہمت کا سنا ہے؟ حق اور باطل کی آمیزش ناممکن ہے۔ یعنی یہ اصول ہی غلط ہے کہ اگر ۵۱ فی صدی حق اور ۴۹ فی صدی باطل ہو تو اس کا نام حق ہو گا۔ ۵۱ تو ایک طرف اگر ۹۹ فی صدی حق اور ایک فی صدی باطل ہو تو بھی وہ حق نہیں کہلا سکتا۔ حق کا دعویٰ ہے کہ ۲ اور ۲ چار ہوتے ہیں۔ باطل کہتا ہے کہ ۲ اور ۲ تین ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے ان میں مفاہمت کی صورت نکالی جائے تو یہی کہہ سکیں گے کہ کچھ حق نیچے اُترے کچھ باطل آگے بڑھے اور فیصلہ اس پر ہو کہ ۲ اور ۲ ساڑھے تین ہوتے ہیں۔ کہئے اس کا نام حق ہوا یا باطل کا باطل رہا؟ اس لئے حق اور باطل میں جب بھی مفاہمت ہو گی وہ باطل کی فتح اور حق کی شکست ہو گی۔ اس لئے کہ حق اُسی وقت تک حق ہے جب تک اپنے مقام پر اٹل اور محکم قائم ہے۔ اُس نے اپنی جگہ چھوڑی اور باطل قرار پا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ حق میں کبھی لچک نہیں[1] ہوتی۔ وہ مداہنت جانتا ہی نہیں۔ اگر اس نے کبھی ایسا کر لیا تو اس کا تغیر

---

[1] علامہ اقبال کے الفاظ میں۔

"اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں۔ بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر وہ دستور العمل جو غیر اسلام ہو نامعقول اور مردود ہے۔"

(مولانا حسین احمد کے نظریۂ وطنیت کے جواب میں بیان)

فساد ہی فساد ہوگا۔ زمین۔ چاند سورج اور دیگر اجرام سماوی کی ایک خاص انداز سے کے مطابق گردش اور حرکت حق ہے۔ اگر وہ باطل سے مفاہمت کر کے اپنی گردش اور رفتار میں تھوڑی سی تبدیلی بھی پیدا کرلیں تو جو نتیجہ برآمد ہوگا اسے فساد کے علاوہ اور کیا کہیں گے؟ اور جب خارجی کائنات میں حق و باطل کی مفاہمت و مداہنت کا نتیجہ یہ نکلے گا تو کیا انسانوں کی دنیا میں اس کا نتیجہ کچھ اور نکل سکے گا؟ یہ ناممکن ہے۔ اسی لئے فرمایا۔

وَ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ؕ (۲۳/۷۱)

اور اگر ایسا ہوتا کہ حق ان کی خواہشوں کی پیروی کرتا، تو یقیناً آسان و زمین اور وہ سب جو ان میں ہے یک قلم درہم و برہم ہو جاتا۔ ہم نے اُن کے لئے اُن کی نصیحت کی بات مہیا کر دی، تو یہ اپنی نصیحت کی بات سے اعراض برت رہے ہیں۔

لہٰذا رسول، باطل کی طاغوتی قوتوں کے ساتھ خواہ وہ تاج شاہی ہو یا مسند خانقاہی، کبھی مفاہمت نہیں کر سکتا اس کا اعلان یہ ہوتا ہے۔

اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؗ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗۤ (۶۰/۴)

(یاد رکھو) ہم تم سے اور تمہارے اُن آقاؤں اور حاکموں سے جن کی تم خدا کے علاوہ اطاعت و پیروی کرتے ہو (قطعاً) بری الذمہ ہیں۔ ہم تمہارے مسلک کا انکار کرتے ہیں اور ہمارے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ہمیشہ کے لئے واضح اور آشکارا ہو چکا ہے تا آنکہ تم لوگ اپنی (اس کجروی سے باز آکر) خدائے یگانہ و یکتا پر ایمان لے آؤ!

اس لئے کہ رسول کی دعوت یہ ہوتی ہے کہ تمام انسانی قوانین سے منہ موڑ کر فقط ایک اللہ کے آئین کی محکومیت اختیار کی جائے۔ اگر وہ اس پر راضی ہو جائے کہ کچھ معاملات میں خدا کا قانون اور کچھ میں انسانوں کا قانون نافذ العمل ہو تو یہ شرک ہے[1] یعنی خدا کی حکومت میں دوسروں کو شریک کرنا۔

---

[1] وَ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا (۱۸/۲۶) اللہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔
اور مومن کا شیوہ یہ ہے کہ وَ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا (۱۸/۱۱۰) وہ اپنے رب کی محکومیت میں کسی کو شریک نہیں کرے۔

وَ اِنَّ الشَّیٰطِیۡنَ لَیُوۡحُوۡنَ اِلٰۤی اَوۡلِیٰٓئِہِمۡ لِیُجَادِلُوۡکُمۡ وَ اِنۡ اَطَعۡتُمُوۡہُمۡ اِنَّکُمۡ لَمُشۡرِکُوۡنَ ؕ (۱۲۱/۶)

اور دیکھو شیطان تو اپنے مددگاروں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے رہتے ہیں تاکہ تم سے کج بحثی کریں۔ اگر تم نے ان کا کہا مان لیا، تو پھر سمجھ رکھو تم بھی شرک کرنے والوں میں ہو۔

اور اس کا نتیجہ جہنم۔

ذٰلِکَ مِمَّاۤ اَوۡحٰۤی اِلَیۡکَ رَبُّکَ مِنَ الۡحِکۡمَۃِ ؕ وَ لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ فَتُلۡقٰی فِیۡ جَہَنَّمَ مَلُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ﴿۳۹/۱۷﴾

(اے پیغمبر!) یہ ان حکمت کی باتوں میں سے ہیں جو تیرے پروردگار کی جانب سے تجھ پر وحی کی گئی ہیں، اور (تمام باتوں کی اصل یہ ہے کہ) اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا آقا اور حاکم نہ ٹھہراؤ کہ بالآخر دوزخ میں ڈالے جاؤ، ملامت کے مستوجب اور ٹھکرائے ہوئے!

سورۂ شعراء میں ہے

فَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ فَتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُعَذَّبِیۡنَ ﴿۲۱۳/۲۶﴾

چنانچہ (اے پیغمبر!) اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا آقا اور حاکم نہ پکارو، کہ اس طرح تم عذاب دیئے ہوئے لوگوں میں سے ہو جاؤ گے!

لہذا رسول ان سرکش قوتوں سے کسی قسم کی مفاہمت نہ کرتا وہ مصیبتوں کے ہجوم اور مخالفتوں کے سیلاب میں اپنی دعوت کو برابر جاری رکھتا۔ بے غل وغش اور بے کم وکاست۔

وَ مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنۡ یَّغُلَّ ؕ وَ مَنۡ یَّغۡلُلۡ یَاۡتِ بِمَا غَلَّ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶۱/۳﴾

اور (دیکھو) خدا کے نبی سے یہ بات کبھی نہیں ہو سکتی کہ وہ (ادائے فرض نبوت میں) کسی طرح کی خیانت کرے (کیونکہ جو نبی ہوگا وہ خائن نہیں ہو سکتا) اور جو کوئی خیانت کرتا ہے، تو جو کچھ اس نے خیانت کی ہے (اُسے دنیا میں لوگوں کی نظروں سے کتنا ہی چھپائے لیکن) قیامت کے دن نہیں چھپا سکے گا، اس کے ساتھ آئے گی۔ پھر ہر جان کو اس کی کمائی کے مطابق پورا پورا بدلہ ملنا ہے۔ یہ نہ ہوگا کہ کسی کے ساتھ بھی ناانصافی کی جائے۔

معاوضہ نہیں مانگتا اور اس پر کسی سے معاوضہ یا "حق الخدمت" کا خواہاں نہیں ہوتا۔

قُلۡ مَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ اِلَّا مَنۡ شَآءَ

اَنۡ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیۡلًا ۝ (۲۵/۵۷)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہدو کہ میں اپنی اس خدمت پر اس کے سوائے اور کوئی اجر نہیں مانگتا کہ (تم میں سے) جو چاہے وہ اپنے پروردگار تک پہنچنے کے لئے راستہ بنالے۔

قوم اس کی دعوت کا انکار کرتی ہے۔ انکار ہی نہیں بلکہ سخت ترین مخالفت کرتی ہے تو اس پر اس کا دل کڑھتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ میری بات کا انکار کیوں کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اس کی نگہ حقیقت بیں ان کے اس انکار و جحود کے ہلاکت انگیز نتائج کو دیکھ رہی ہوتی ہے۔ اسی طرح جیسے ایک طبیب مشفق کسی ضدی مریض کی ضد پر اس کے دوائی پینے سے انکار اور پرہیز توڑنے پر اصرار سے افسردہ خاطر ہو جاتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ مریض اُس کا حکم کیوں نہیں مانتا بلکہ اس لئے کہ وہ اس ضد اور انکار میں اس کی

غمخواری

موت کو پنہاں دیکھتا ہے۔ رسول ان کے غم میں اپنی جان گھلا لیتا ہے اور چاہتا ہے کسی نہ کسی طرح اُنھیں آنے والے طوفانِ بلا سے بچالے۔

فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفۡسَکَ عَلٰۤی اٰثَارِہِمۡ اِنۡ لَّمۡ یُؤۡمِنُوۡا بِہٰذَا الۡحَدِیۡثِ اَسَفًا ۝ (۱۸/۶)

(اے پیغمبر!) تیری حالت تو ایسی ہو رہی ہے کہ جب لوگ یہ (واضح) بات بھی نہ مانیں۔ تو عجب نہیں ان (کی ہدایت) کے پیچھے مارے افسوس کے تو اپنی جان کو ہلاکت میں ڈال لے

لیکن ہدایت ایسی چیز نہیں جسے کسی کو گھول کر زبردستی پلا دیا جائے۔ اس کے لئے قلب سلیم کی ضرورت ہوتی ہے اسے وہی اختیار کرتا ہے جو اپنے دل کو تمام تعصبات سے پاک اور صاف کر کے، اُس پیغام پر سکون و سکوت سے غور و فکر کرے۔ اور جب اس طرح اس پر اس کی صداقت واضح ہو جائے تو اسے دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ تسلیم کر لے۔ رسول کا فریضہ راستہ دکھا دینا ہوتا ہے۔ کسی کو راستے پر لگا دینا نہیں ہوتا۔ اس لئے رسول سے کہدیا جاتا ہے کہ

لَیۡسَ عَلَیۡکَ ہُدٰىہُمۡ (۲/۲۷۲)

اُنھیں ہدایت پر لے آنا تمھارے ذمہ نہیں۔

تمھارے ذمہ فقط احکامات کا پہنچانا ہے

فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ (۳/۲۰)

تمہارے ذمہ جو کچھ ہے، وہ پیام حق پہنچا دینا ہے۔

رسول اپنا پیغام پہنچاتے چلا جاتا اور جس جس زمین میں بالیدگی کی صلاحیت ہوتی، وہ لالہ زار بنتی

معیارِ تفریق چلی جاتی۔ یوں چند دنوں میں زمین شور اور زرخیز کے خطے ایک دوسرے سے الگ الگ دکھائی دینے لگ جاتے۔ بس یہ ہے وہ معیارِ تفریق جس کی بنا پر وہ انسانوں کو دو جماعتوں میں تقسیم کر دیتا۔ ایک وہ جو اپنے آپ کو خدائی نظامِ حکومت کے تابع لے آئیں (مؤمن) اور دوسرے وہ جو اس سے انکار کر دیں (کافر)۔ ان کے علاوہ آئینِ خداوندی میں انسانوں کی کوئی تیسری جماعت نہیں۔ کوئی قوم نہیں۔ اس تفریق پر جغرافیائی حدود و قیود۔ نسلی تعلقات۔ رنگ اور زبان کے اختلافات کبھی اثر انداز نہیں ہوتے۔ یہی تفریق، باپ کو بیٹے سے۔ بھائی کو بھائی سے۔ خاوند کو بیوی سے۔ دوست کو دوست سے یوں الگ کر کے رکھ دیتی ہے جیسے ریت کے ڈھیر سے لوہے کے ذرات مقناطیسی پتھر سے الگ ہو جاتے ہیں۔ ہر وہ ذرہ جو مقناطیس کا اثر قبول کرلے، ایک قوم کا فرد ہے۔ اور جو یہ اثر قبول نہ کرے، دوسری قوم سے متعلق۔ پہلے رسول تنہا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کے ساتھ قلبی ہم آہنگی رکھنے والے ذرات جمع ہو کر ایک جماعت بن جاتے ہیں۔ قرآن اس جماعت کو حزب اللہ کہتا ہے اور فریقِ مقابل کو حزب الشیطان۔

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ (۵۸/۱۹)

شیطان اُن پر چھا گیا ہے۔ چنانچہ اُس نے خدا کی یاد سے اُنھیں غافل کر دیا۔ یہی لوگ شیطان کی جماعت (کے لوگ) ہیں۔ یاد رکھو، شیطان کی جماعت (کے لوگ) ہی خسارہ میں رہنے والے لوگ ہیں!

اور دوسری جماعت

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۵۸/۲۲)

(اے پیغمبر!) تم ان لوگوں کو جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اس حال میں

نہ پاؤگے کہ وہ ان لوگوں کو دوست رکھتے ہوں جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہوں
خواہ یہ لوگ اُن کے ماں باپ ہوں۔ بیٹے ہوں۔ بھائی ہوں۔ یا اہلِ خاندان۔ (درحقیقت)
یہی ہیں وہ لوگ جن کے دلوں میں خدا نے ایمان لکھ دیا ہے۔ اور اپنی طرف سے خدا نے وحی کے
ذریعے ان کی مدد فرمائی ہے۔ اور جنھیں وہ ایسے باغات میں داخل کر دے گا جن کے نیچے نہریں
بہ رہی ہوں گی۔ یہ لوگ اُن باغات میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ خدا اُن سے راضی ہو گیا اور وہ
لوگ خدا سے راضی ہو گئے۔ یہ ہیں خدا کی جماعت (کے لوگ) یاد رکھو، بے شک خدا کی جماعت
والے ہی فلاح پانے والے لوگ ہیں،

ان دونوں جماعتوں کا سلسلۂ تصادم و تزاحم بڑھتا جاتا۔ حق اور باطل کی کشمکش زیادہ ہوتی
جاتی۔ مریض کی ضد اور اصرار شدت اختیار کرتے جاتے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مرض کے جراثیم بھی پھیلتے
جاتے، کبھی کبھی مریض کی تکلیف اتنی بڑھ جاتی کہ خیال پڑتا .... کہ وہ طبیب کی طرف رجوع کرے گا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّبِيٍّ إِلَّا أَخَذْنَا أَهْلَهَا بِالْبَأْسَاءِ
وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُونَ ٥ (۷/۹۴)

اور ہم نے جب کبھی کسی بستی میں کوئی نبی بھیجا، تو ہمیشہ ایسا کیا کہ (ان کے اعمال کے نتیجہ میں)
اس کے باشندوں کو سختیوں اور نقصانوں میں مبتلا کر دیا تاکہ (سرکشی سے باز آئیں اور)
عاجزی و نیازمندی کریں۔

لیکن تھوڑے سے عرصے کے بعد وہ پھر اسی بد پرہیزی اور انکار و سرکشی پر اُتر آتا حتیٰ کہ مرض کا زہر اس کے
رگ و پے میں سرایت کر جاتا اور اسے ہلاکت چاروں طرف سے یوں گھیر لیتی کہ اسے محسوس بھی نہ ہوتا کہ وہ
کب موت کے آغوش میں پہنچ گیا۔

ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتَّىٰ عَفَوا وَّقَالُوا قَدْ
مَسَّ آبَاءَنَا الضَّرَّاءُ وَالسَّرَّاءُ فَأَخَذْنَاهُم بَغْتَةً وَهُمْ
لَا يَشْعُرُونَ ٥ (۷/۹۵)

پھر ہم نے مصیبت راحت سے بدل دی۔ پھر جب ایسا ہوا کہ وہ (خوش حالیوں میں) خوب
بڑھ گئے اور (پاداشِ عمل سے بے پرواہ ہو کر) کہنے لگے۔ ہمارے بزرگوں پر سختی کے دن
بھی گذرے، راحت کے بھی۔ (یعنی دنیا میں اچھی بُری حالتیں ہمیشہ آتی ہی رہتی ہیں۔ جزائے عمل

کوئی چیز نہیں، تو اچانک ہمارے عذاب کی پکڑ میں آگئے اور وہ بالکل بے خبر تھے۔

اس کا نام عذاب ہے۔ اور یہ سب کچھ ایک خاص قاعدہ اور قانون کے ماتحت واقع ہوتا ہے جسے قانون مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا ۙ ِ اسْتِكْبَارًا فِى الْاَرْضِ وَ مَكْرَ السَّيِّئِ ؕ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ؕ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا

(۳۵ / ۴۲-۴۳)

اور دیکھو، انھوں نے خدا کے نام کی بڑی بڑی قسمیں کھائی تھیں کہ اگر اُن کے پاس (انکار و بدعملی کے نتائج سے) کوئی ڈرانے والا آیا تو وہ کسی اور قوم کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہدایت یافتہ ثابت ہوں گے۔ لیکن (یہ باتیں ہی باتیں تھیں) جب (انکار اور بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والا اُن کے پاس آگیا تو اُن کی وحشت و نفرت بڑھتی چلی گئی (یہ سب کچھ) خدا کی زمین میں غرور اور تکبر اور فساد انگیز تدابیر کی وجہ سے تھا (یاد رکھو) ایسی تدابیر کے نتائج خود ایسی تدابیر کرنے والوں ہی پر پڑتے ہیں (اے پیغمبر! تم ان سے پوچھو) کیا یہ لوگ گذشتہ قوموں کے طریقہ کے علاوہ (اپنے لئے کوئی نیا طریقہ) دیکھ رہے ہیں؟ (نہیں اور ہرگز نہیں، اے پیغمبر!) تم اللہ کے طریقہ میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں پاسکو گے اور نہ ہی تم کبھی اللہ کے طریقہ میں کوئی تغیر پاسکو گے۔

رسول کے آنے سے حجت پوری ہو جاتی تا کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہمارے ہاں طبیب ہی نہ تھا، ہم علاج کس سے کراتے؟

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ (۴ / ۱۶۵)

یہ تمام رسول (خدا پرستی و نیک عملی کے نتائج) کی خوش خبری دینے والے اور (انکار حق کے نتائج سے) ڈرانے والے تھے (اور اس لئے بھیجے گئے تھے) کہ ان کے آنے (اور نیک و بد بتلانے) کے بعد لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے جو وہ خدا کے حضور پیش کر سکیں (یعنی یہ عذر کر سکیں کہ راہِ حق کی طرف کسی نے دعوت نہیں دی تھی) اور خدا (اپنے تمام کاموں میں سب پر غالب اور حکمت رکھنے والا ہے۔

اور یہ ہے بھی نہایت ضروری۔ جب انسان کو ایسی فضا میں چھوڑ اگیا جہاں ہر قسم کے مؤثرات اس پر اثر انداز ہو کر اُسے غلط راہوں پر لگانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں تو اُسے ان رستوں کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کرنا بھی ضروری تھا۔ اس تنبیہہ اور تنذیر کے بعد اگر کوئی دیدہ و دانستہ ان ہلاکت کے عمیق گڑھوں میں گرنا چاہے تو اسے کون بچا سکتا ہے؟ اسی لئے فرمایا۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ (۶/۱۳۱)

(اے پیغمبر!) یہ (پیغمبروں کا بھیجا اور دعوتِ حق کا اعلان) اس لئے ہوا کہ تمہارے پروردگار کا یہ شیوہ نہیں کہ وہ ظلم (نا انصافی) سے بستیوں کو ہلاک کر دے، درآنحالیکہ وہاں کے رہنے والے (راہِ حق سے) بے خبر ہوں!

رسول کا فریضہ یہ تھا کہ وہ زندگی کے ہر دوراہے پر جلی حروف میں راہ نما کھمبے (sign posts) نصب کر دے۔ اس کے بعد جس کا جی چاہے سرفرازیوں اور کامرانیوں کی جنت کا راستہ اختیار کر لے اور جس کا جی چاہے ذلت و رسوائی کے جہنم کی طرف چل دے۔

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ○ (۱۷/۱۵)

جو سیدھے رستے چلا، تو اپنے ہی لئے چلا، اور جو بھٹک گیا تو بھٹکنے کا خمیازہ بھی وہی اٹھائے گا۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا (ہر جان کو خود اپنے ہی اعمال کا بوجھ اٹھانا ہے) اور ہم کبھی ایسا نہیں کرتے کہ (کسی قوم کو) عذاب دیں، مگر اسی وقت، جبکہ اس میں ایک رسول پیدا کر دیتے ہیں (اور پھر بھی لوگ سرکشی و فساد سے باز نہیں آتے، تاکہ جہنم کی ہلاکت سامانیوں میں گھرنے کے بعد یہ گلہ نہ رہے کہ ہمیں راستہ بتانے والا ہی کوئی نہ تھا۔

دوسری جگہ ہے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ○ قَالُوْا اَوَ لَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ قَالُوْا بَلٰى ؕ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَ مَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ○ (۴۰/۴۹-۵۰)

اور (دیکھو، ذرا تصور میں لاؤ کہ) اُن لوگوں نے جو جہنم میں (مبتلائے عذاب تھے) جہنم کے محافظین سے درخواست کی: "اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ عذاب میں کسی دن تو ہم پر تخفیف کر دے۔" اس پر اُنھوں نے پوچھا، "کیوں؟ کیا تمھارے پاس رسول واضح نشانیوں کے ساتھ نہیں آتے رہے تھے؟" وہ بولے: "ہاں، آتے کیوں نہیں رہے!" تو اُنھوں نے (خزنۂ جہنم نے) جواب دیا، "بس تو اب تم دعائیں مانگتے رہو۔ انکار کرنے والوں کی دعا محض بے سود ہی ہوتی ہے۔"

یہ ہے مقصدِ بعثتِ انبیاء کرامؑ۔ جو لوگ ان کے پیغام کے مطابق اور اُن کے نظام کے تابع زندگی بسر کرتے ہیں۔ دنیا بھر کی خوش بختیاں اُن کے قدم چومتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے جوہرِ انسانیت میں ایسی جِلا اور بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس زندگی سے اگلی زندگی میں بھی سرفراز و شادکام رہتے ہیں۔ اس کے برعکس جو ان کی تکذیب کرتے ہیں اُن کے فقط افسانے باقی رہ جاتے ہیں۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ

(۲۳/۴۴)

پھر ہم نے لگاتار، یکے بعد دیگرے، اپنے رسول بھیجے۔ لیکن جب کبھی کسی قوم میں اس کا رسول ظاہر ہوا۔ معاً وہ جھٹلانے پر آمادہ ہو گئی۔ پس ہم بھی انکو ایک کے بعد ایک کرکے ہلاک کرتے گئے تا آنکہ اُن کی ہستیاں (روایت کا) افسانہ بن گئیں کیونکہ اُن کے لئے محرومی و نامرادی ہے جو آیات حق پر یقین نہیں کرتے!

عذاب واضح رہے کہ اس عذاب کی صورت یوں نہیں ہوتی تھی کہ اللہ کا رسول آتا۔ یہ لوگ اُسے جھٹلاتے اس پر (معاذ اللہ) خدا کو غصہ آجاتا اور اُن پر عذاب مسلط کر دیتا۔ یہ تصور ہی باطل ہے۔ بات بالکل سیدھی سیدھی اور قانونِ فطرت کے مطابق ہے۔ رسول کہتا کہ یہ سنکھیا ہے جو شخص اسے کھائے گا ہلاک ہو جائے گا۔ ایک شخص اُس کی بات کو صحیح مانتا (ایمان) اور اس زہر سے اجتناب برتتا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کی ہلاکت سے محفوظ رہتا۔ دوسرا کہتا کہ یہ جھوٹ کہتا ہے (تکذیب) اس کی بات مت مانو (کفر) یہ سنکھیا نہیں شکر کی ڈلی ہے۔ اور یہ کہہ کر اُسے نگل جاتا۔ انجام ظاہر ہے۔ اسی انجام کا نام ہے عذاب۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اسے قرآن نے سورۂ یٰسین کی چند آیات میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔

فرمایا:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ o اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ o (۳۶ — ۱۳ — ۱۴)

اور (اے پیغمبر!) تم اُن (کو سمجھانے) کے لئے ایک بستی والوں کی مثال بیان کرو جب اُن کے پاس خدا کے رسول آئے، (اولاً) جب ہم نے ان کی طرف دو رسولوں کو بھیجا تو اُنھوں نے ان دونوں کو جھٹلادیا پھر ہم نے ایک تیسرے پیغمبر سے اُن دونوں کو تقویت دی۔ چنانچہ (اب) اُن (تینوں) نے (یک زبان ہوکر) کہا "بلاشبہ ہمیں تمھاری ہی طرف بھیجا گیا ہے" (کہ ہم تمھیں حق و صداقت کی طرف دعوت دیں) لیکن بستی والوں نے اس کی بھی تکذیب کی۔

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ o (۳۶ — ۱۵)

بستی والوں نے کہا "تم اس کے سوا کیا ہو کہ ہماری ہی طرح کے ایک انسان ہو، خدا نے کچھ اتارا وتارا نہیں، اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے کہ تم (خدا کے خلاف جھوٹ) بول رہے ہو!

حالانکہ رسول اُن سے مسلسل کہتے رہے کہ ہم اللہ کے فرستادہ ہیں، ہماری سنو۔

قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ o وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ o (۳۶ — ۱۶ — ۱۷)

اُنھوں نے (پھر) کہا کہ ہمارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ بلاشبہ اور یقیناً ہمیں تمھاری ہی طرف بھیجا گیا ہے۔ (اب ماننا نہ ماننا تمھارا کام ہے) ہمارے ذمہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ واضح طریقہ پر خدا کے احکام تم تک پہنچادیں۔

لیکن ان کی سرکشی و عدوان اور بڑھتا گیا۔

قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ o قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ o (۳۶ — ۱۸ — ۱۹)

بستی والے کہنے لگے، "ہم تم سے بُرا شگون لے رہے ہیں، اگر تم (اپنی اس حرکت سے) باز نہ آؤ گے تو ہم ضرور تمھیں سنگسار کردیں گے اور (اس طرح) تمھیں ہماری طرف سے دردناک

عذاب پہنچ جائے گا۔" رسولوں نے کہا، " تمھاری بدشگونی تو تمھارے ساتھ ہے - کیا اگر تمھیں کوئی نصیحت کی جائے (تو تم یوں انسانیت کی حدود سے بھی باہر نکل جاؤگے - اگر ایسا ہے تو) تم بڑے ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو!"

سعید روحوں نے ان حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت کو قبول کیا اور اپنی قوم کو سمجھانے کی کوشش کی۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ۝ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ۝ (۳۶/۲۰-۲۵)

اور (دیکھو) شہر کے آخری کنارے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا - کہنے لگا " اے میری قوم کے لوگو! ان رسولوں کی پیروی کرو، اُن کی پیروی کرو جو تم سے (اپنی راہنمائی کا) کوئی بدلہ نہیں مانگتے اور وہ خود راہ یاب ہیں (رہاں ہاں) مجھے کیا ہوا کہ میں اُس خدا کی محکومیت اختیار نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کی طرف تم سب لوٹائے جاؤگے - کیا میں اس کے علاوہ کچھ اور آقا اور حاکم گھڑلوں کہ اگر خدا مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو نہ مجھے اُن (حاکموں اور آقاؤں) کی سفارش ہی کچھ کام دے سکے اور نہ ہی وہ (خدا کے عذاب) سے بچا سکیں ؟ (اگر میں ایسا کرنے لگوں، تو) پھر تو میں بڑی کھلی گمراہی میں پڑ گیا، (نہیں - اے خدا کے فرستادہ پیغمبرو!) میں تمھارے پروردگار پر ایمان لے آیا - چنانچہ میرا یہ استرارِ سن رکھو!

لیکن انھوں نے اس پکارنے والے کی پکار پر لبیک کہنے کے بجائے اسے قتل کر ڈالا - اس کا تو کچھ بگڑا نہیں اس لئے کہ اُسے اِس مقام سے بلند ترین مقام مل گیا۔

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بِمَا غَفَرَلِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝ (۳۶/۲۶-۲۷)

کہا گیا " جا، تو تو جنت میں داخل ہو جا" وہ بولا " اے کاش میری قوم جانتی کہ میرے پروردگار نے میری حفاظت کردی اور مجھے (اپنے نزدیک) معزز لوگوں میں سے کر دیا ہے"

لیکن اس قوم کے اعمال کے ظہورِ نتائج کا وقت آگیا - اس کے لئے آسمان سے فرشتے نہیں اُترے -

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ۝ (۳۶/۲۸)

اور (یاد رکھو) ہم نے اس کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی (فرشتوں کی) فوج نہیں اتاری اور نہ ہی ہم اتارنے والے تھے۔

ایک آواز اور بس خاتمہ۔

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ۝ (۳۶/۲۹)

ایک چیخ (کی آواز) کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ سب یک بارگی بےحس و حرکت پڑے تھے۔

کیسا حسرتناک ہے یہ انجام

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (۳۶/۳۰)

ہائے رے افسوس ان بندوں پر، ان کے پاس کوئی رسول بھی نہیں آتا تھا مگر یہ لوگ اس کا مذاق ہی اڑاتے تھے۔

انجام اُن لوگوں کا جنھوں نے اپنے سے پہلے گزرنے والی اقوام کے انجام و عواقب کی داستانوں (تاریخی شواہد) سے بھی فائدہ نہ اٹھایا۔

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ۝ (۳۶/۳۱-۳۲)

کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی نسلیں (محض اسی وجہ سے) تباہ کر دی ہیں کہ وہ اُن (رسولوں) کی طرف پلٹتے نہیں تھے، اور بلاشبہ وہ سب کے سب ہمارے حضور میں جمع کیے جائیں گے!

اس آخری آیت پر غور فرمائیے۔ یعنی اس دنیا میں ایسا عبرت انگیز انجام اور اس کے بعد اگلی منزل کی کامرانی سے محرومی؛ یہاں بھی اصول و قانون کے مطابق، وہاں بھی آئین و دستور کے موافق۔

بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ

وُجُوهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ۚ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِينَ ○ (۳۹/۵)

کیوں نہیں؟ تیرے پاس میری آیتیں آچکی ہیں، پس تو انھیں جھٹلا چکا، غرور کا اظہار کر چکا اور نہ ماننے والوں میں سے بن چکا ہے۔ اور اے پیغمبر! قیامت کے روز تم ان لوگوں کو دیکھو گے جو خدا پر جھوٹ بولتے تھے کہ اُن کے چہرے سیاہ ہو گئے ہوں گے۔ کیا جہنم میں مغرور لوگوں کا ٹھکانا نہیں ہے؟ (ہے اور ضرور ہے)

اس وقت یہ بھی پکار اٹھیں گے کہ فی الواقعہ خدا کے رسول سچے تھے۔ جب سنکھیا کا اثر نمایاں ہوگا تو خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ طبیب نے سچ کہا تھا۔

يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوهُ مِن قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ (۷/۵۳)

جس دن اس کا انجام وقوع میں آئے گا، اس دن وہ لوگ کہ اُسے پہلے سے بھولے بیٹھے تھے (نامرادی وحسرت کے ساتھ) بول اٹھیں گے "بلاشبہ ہمارے پروردگار کے پیغمبر ہمارے پاس سچائی کا پیام لے کر آئے تھے! (مگر افسوس کہ ہم نے انھیں جھٹلایا")

یہ ہے مفہوم رسول کی تکذیب سے اور یہ ہے مقصود عذاب خداوندی سے۔ محکمۂ آب وہوا (Meteoro Logical Department) کی طرف سے یہ انتظام ہوتا ہے کہ جونہی انھیں معلوم ہو کہ دُور، سینکڑوں میل پر، طوفان کے آثار ہیں اور پانی کی رفتار بتا رہی ہے کہ سیلاب اتنے وقت میں فلاں فلاں مقام تک آپہونچے گا تو وہ اُن مقامات پر متعین شدہ اہلکاروں کو بذریعہ تار اس کی اطلاع دیدیتے ہیں۔ وہ اہلکار ارد گرد کے گاؤں والوں کو متنبہ کر دیتے ہیں کہ فوراً اپنے بال بچوں کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ اب جو لوگ ان کی بات کی تصدیق کر کے ان پر عمل پیرا ہوں گے وہ طوفان سے بچ جائیں گے۔ لیکن جو ان کی تکذیب کریں گے اور کہیں گے کہ یہ یونہی کہتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ وہ نذرِ سیلاب ہو جائیں گے۔ یہ ہے (تمثیلاً) تکذیبِ رسل اگر وہ لوگ رسولوں کی تنذیر (warning) پر کان دھر کر اپنی غلط روش کو بدل دیں، تو ہلاکت سے بچ جائیں۔ اور اگر رسول کی اس تنذیر کی ہنسی اڑائیں اور اپنی اُسی روش پر قائم رہیں تو ہلاکت آمیز عذاب میں گرفتار ہو جائیں۔

اس طرح یہ سلسلۂ رشد وہدایت قائم رہا۔ جب دنیا ہنوز اپنے عہد طفولیت میں تھی تو سلسلۂ

رسل و رسائل اور نامہ و پیام کا یہ انتظام نہ تھا کہ کمرے کے ایک گوشے میں بیٹھنے والے کی آواز بیک وقت دنیا کے ہر کنارے تک جا پہنچے۔ اُس وقت تو ایک بستی کی بات کا دوسری بستی تک پہنچنا مشکل تھا۔ اس لئے قریہ قریہ۔ بستی بستی۔ قبیلہ قبیلہ کی طرف الگ الگ رسول آئے۔[۱]

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ (۱۰ پ ۱۱ / ۴۷)

اور (یاد رکھو) ہر امت کے لئے ایک رسول تھا (جو اُن میں پیدا ہو کر انھیں دینِ حق کی طرف بلاتا تھا) پھر جب کسی اُمت میں اس کا رسول ظاہر ہو گیا، تو (ہمارا قانون یہ ہے کہ) اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے، اور ایسا نہیں ہوتا کہ ناانصافی ہو۔

ہر قریہ میں رسول

وَمَا أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا مُنذِرُونَ ۝ (۲۶)

اور ہم نے کسی آبادی کو ہلاک و برباد نہیں کیا۔ مگر یہ کہ اس کے لئے (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والے تھے!

اور جب دنیا ذرا اور آگے بڑھ آئی تو علاقہ کے صدر مقام میں رسول آتے رہے جہاں سے اُن کی آواز اپنے اپنے دائرہ تبلیغ میں پہنچتی رہی۔

---

[۱] صرف اس لئے ہی نہیں کہ اس زمانہ میں سلسلۂ رسل و رسائل ایسا عالمگیر نہ تھا، بلکہ اس لئے بھی کہ ابھی انسانی ہئیتِ اجتماعیہ نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ وہ بین الاقوامی روابط سے ایک عالمگیر برادری کے افراد بن سکیں۔ اُس وقت اس امر کی ضرورت تھی کہ اُن کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی الگ الگ تربیت کر کے ان میں وحدتِ خلق و وحدتِ خالق کا صحیح تصور پیدا کیا جائے اور اس طرح ان کی انسانیت میں وسعت پیدا ہوتی جائے۔

[۲] ہر رسول کے پیغام کی زبان وہی ہوتی تھی جو اس کی قوم کی زبان تھی۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۖ فَيُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (۱۴)

اور ہم نے کوئی پیغمبر دنیا میں نہیں بھیجا، مگر اس طرح، کہ اپنی قوم ہی کی زبان میں پیامِ حق پہنچانے والا تھا، تاکہ لوگوں پر مطلب واضح کر دے، پس اللہ جس پر چاہتا ہے (کامیابی کی) راہ گم کر دیتا ہے جس پر چاہتا ہے کھول دیتا ہے۔ وہ غالب ہے حکمت والا!

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ (۲۸/۵۹)

اور (اے پیغمبر اسلام!) تمہارا پروردگار آبادیوں کو اُس وقت تک ہلاک و برباد کرنے والا نہیں جب تک اُن آبادیوں کے صدر مقام میں اپنا کوئی رسول نہ بھیج دے جو اُن کے سامنے ہماری آیتیں پڑھ کر سنا دیں۔ اور ہم آبادیوں کو بجز اس صورت کے ہلاک کرنے والے نہیں ہیں کہ اُن آبادیوں والے (خود) ہی ظالم ہوں (اور اس طرح اس سزا کے مستحق ہو جائیں۔)

یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ تاآنکہ وہ وقت آگیا جس کے بعد انسانیت کو ایک نئے دور میں داخل ہو جانا تھا۔ یعنی اس سے پہلے ذہنِ انسانی عالمِ طفولیت میں تھا۔ اب اُسے صاحبِ شعور بن جانا تھا۔ چنانچہ اس وقت اس نبی آخر الزمان کی باری آئی جسے تمام نوعِ انسانی کے لئے رسول بن کر آنا تھا اور جس کے ساتھ نبوت کا سلسلہ بھی ختم ہو جانا تھا۔ (تفصیل اس اجمال کی "معراج انسانیت" میں ملے گی)

رسول کے بعد

ایک رسول آتا اور اپنے مقصدِ رسالت کی تکمیل کے بعد چلا جاتا۔ جب جاتا تو اپنا پیغام یعنی وہ ضابطۂ قوانین جس کے ماتحت انسانوں کو اپنی زندگی بسر کرنی تھی اپنے متبعین کے سپرد کر جاتا۔ کچھ عرصہ تک وہ اس نظام کے مطابق زندگی بسر کرتے لیکن آہستہ آہستہ مختلف امیال و عواطف اور متنوع اسباب و علل کے ماتحت وہ اس نظام سے کنارہ کشی کرتے جاتے۔ اربابِ قوت و اقتدار رفتہ رفتہ پھر اسی انسانی حکومت کو لوگوں پر مسلط کر دیتے جسے حکومتِ الٰہیہ میں بدلا گیا تھا۔ ارکینِ مذہب چپکے ہی چپکے اس ضابطۂ قوانین (کتاب اللہ) میں تبدیلیاں کرتے رہتے جس کے وہ وارث بنائے گئے تھے۔ اور رفتہ رفتہ ایسا وقت آجاتا کہ کتاب انسانی تحریف و الحاق کا مجموعہ بن کر رہ جاتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ مجموعۂ قوانین ارضی و سماوی حوادث کی نذر ہو جاتا اور دنیا میں اس کا اصلی وجود کہیں باقی نہ رہتا۔ اور دین کی جگہ وہ رسومات و روایات لے لیتیں جو انسانی دماغوں نے وضع کر کے دین کا جزو بنا رکھی تھیں اور جو دلچسپ اور نظر فریب ہونے کے اعتبار سے عوام کے دل کی گہرائیوں میں اُتر چکی تھیں۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ

رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ○ (۶/۱۱۲)

اور (اے پیغمبر!) اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے (جب اس کی دعوت کا ظہور ہوا) انسانی اور جنّاتی (یعنی حضری اور بدوی آبادیوں کے سرکش سرغنوں کو دشمن ٹھہرا دیا جو ایک دوسرے کو خوشنما باتیں سکھاتے، تاکہ لوگوں کو فریب دیں۔ اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو (یقیناً ایسا کر سکتا تھا کہ) وہ دشمنی نہ کرتے (مگر اس نے انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے) پس (ان کی مخالفت سے دل گرفتہ نہ ہو، اور) انھیں ان کی افترا پردازیوں میں چھوڑ دو۔

جب حالت یہ ہو جاتی کہ نہ وہ قوم آئین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتی اور نہ ان میں وہ ضابطۂ قوانین ہی اپنی اصلی شکل میں باقی رہتا تو پھر ایک اور رسول آ جاتا جو انھیں پھر سے آئین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی دعوت دیتا اور سابقہ (محرف شدہ) مجموعۂ قوانین سے (وحی الٰہی کی روشنی میں) انسانی تحریفات و تلبیسات کو الگ کر کے اس کی اصلی صورت میں پیش کرتا۔

نیا رسول

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنّٰى أَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْ أُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ (۲۲/۵۲)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے جتنے رسول اور جتنے نبی بھیجے، سب کے ساتھ یہ معاملہ ضرور پیش آیا کہ شیطان نے ان کی تلاوت کردہ (وحی) میں آمیزش کر دی۔ اس کے بعد اللہ نے (ایک دوسرا رسول بھیج کر) شیطان کی آمیزش کو مٹا ڈالا اور اپنی آیات کو اور زیادہ مضبوط کر دیا۔ وہ سب کچھ جاننے والا، (اپنے سارے کاموں میں) حکمت والا ہے۔

اس کی پھر اسی طرح مخالفت ہوتی جس طرح رسول ماسبق کی ہوتی تھی۔ مسخ شدہ دین اور محرف کتاب پر جم کر بیٹھنے والے اس "نئے" مسلک کے خلاف شدید ترین محاذ قائم کر لیتے اور اس کے لئے دلیل صرف یہ لاتے کہ یہ مسلک اُس مسلک کے خلاف ہے جو ان میں ان کے اسلاف سے متوارث چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ مندرجہ صدر آیت سے آگے ہے۔

لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَإِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ۙ (۲۲/۵۳)

(یہ تحریف اس لئے ہوتی تھی)، کہ شیطان کی طرف سے یہ آمیزش ان لوگوں کی آزمائش کا ذریعہ

ہو جائے جن کے دل روگی ہیں، اور (سچائی کی طرف سے) سخت پڑ گئے ہیں۔ اور بلاشبہ یہ ظلم کرنے والے بڑی ہی گہری مخالفت میں پڑے ہیں۔!

لیکن جن کی نگاہوں میں بصیرت اور روح میں سعادت ہوتی، وہ اس حقیقت پر ایمان لے آتے۔

وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوبُهُمْ وَإِنَّ اللَّهَ لَهَادِ الَّذِينَ آمَنُوا إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ○ (۲۲/۵۴)

اور اس لئے کہ جن لوگوں نے علم پایا ہے، وہ جان لیں کہ یہ معاملہ (نبی تعلیم) فی الحقیقت تیرے پروردگار ہی کی طرف سے ہے۔ اس طرح اس پر ایمان لے آئیں، اور ان کے دلوں میں عجز و نیاز پیدا ہو جائے۔ یقیناً اللہ ایمان والوں کو (سعادت و کامرانی کی) سیدھی راہ چلانے والا ہے۔

جزئیات میں ارتقا تحریف کے علاوہ، اس سلسلۂ تجدید کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ چونکہ دنیا اپنے ابتدائی ادوار سے طے کرتی ہوئی من حیث الکل اوپر کو ابھرتی چلی آرہی تھی اس لئے اگر انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے ان بڑھتے ہوئے تقاضوں کے پیشِ نظر، سابقہ تعلیم کی بعض جزئیات کو بدلنا مقصود ہوتا تو انہیں منسوخ کر کے، اس نئے رسول کی وساطت سے، دوسری جزئیات و تفاصیل دیدی جاتیں[1]۔

مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا ۗ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○ (۲/۱۰۶)

(یاد رکھو، وحی و تنزیل کے بارہ میں ہمارا مقررہ قانون یہ ہے کہ) ہم اپنے احکام میں سے جو کچھ منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش ہو جانے دیتے ہیں، تو اس کی جگہ اس سے بہتر یا (کم از کم) اس جیسا

---

[1] یہ ضروری نہیں کہ سابقہ تفاصیل و جزئیات (شریعت کے احکام) کو بہ تمام و کمال بدل دیا جاتا۔ کسی ایک حکم کے بدلنے سے بھی سابقہ شریعت، جدید شریعت بن جاتی ہے۔ اس لئے کہ جن احکام کو خدا نے خود نافذ فرمایا ہو وہ خدا ہی کے حکم سے بدلے جا سکتے ہیں اور خدا کا یہ حکم انبیاء کرامؑ کی وساطت سے انسانوں تک پہنچتا تھا۔ لہٰذا اگر کوئی رسول، کسی سابقہ تعلیم کے ایک حکم کو بھی بدلتا ہے تو وہ ایک نئی شریعت لاتا ہے۔ اور اگر پچھلا ضابطۂ قوانین اپنی اصلی شکل میں موجود ہو اور اس میں کسی قسم کا رد و بدل بھی مقصود نہ ہو تو پھر کسی رسول (ربانی) کے آنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

حکم نازل کر دیتے ہیں (پس اگر اب ایک نئی شریعت ظہور میں آئی ہے، تو یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر لوگوں کو حیرانی ہو) کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ کی قدرت سے کوئی بات باہر نہیں۔؟

لیکن یہ نیا رسول، خواہ اسی ضابطۂ قوانین کی تجدید کرتا جو اس سے پیشتر نازل ہوا تھا یا اس میں کچھ ردوبدل ہو جاتا، ہر حال اب ایمان و اطاعت اسی کی واجب ہوتی۔ ان پر بھی جو اپنے آپ کو سابقہ رسول کی طرف منسوب کرتے تھے اور دوسروں پر بھی۔ اس لئے کہ

(i) یہ رسول بھی اسی خدا کی طرف سے آیا تھا جس خدا نے سابقہ رسول بھیجا تھا۔ اگر سابقہ رسول کی طرف نسبت اور اس کی مزعومہ اطاعت ہی کافی ہوتی تو اس نئے رسول کی بعثت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اطاعت تو درحقیقت خدا کی ہے۔ جب خدا کا یہ حکم ہے کہ میری اطاعت اس ضابطہ کی رو سے ہوگی جو اس رسول کی وساطت سے بھیجا گیا ہے تو خدا کی اطاعت کرنے والوں کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ نئے رسول سے انکار درحقیقت اس جذبہ پر مبنی ہوتا ہے کہ یہ رسول اپنے دعوئے رسالت میں (معاذاللہ) جھوٹا ہے یا (خاکم بدہن) اس خدا کا بھیجا ہوا نہیں جس خدا نے سابقہ رسول کو بھیجا تھا۔ اور یہی وہ تکذیب ہے جس کا مآل (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) ہلاکت ہے۔

(ii) ہر نیا ضابطہ، گذشتہ ضابطۂ قوانین کا نیا ایڈیشن ہوتا جس کا ہر حرف اور لفظ یقینی طور پر منجانب اللہ ہوتا۔ اس لئے یقین کو چھوڑ کر ظن کی اتباع حق پرستی نہیں، باطل پرستی ہے۔

إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (۱۱۶)

وہ پیروی نہیں کرتے مگر محض گمان کی، اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ شک و گمان میں قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔

(iii) تبدیل و تجدید کا یہ سلسلہ خود مشیت خداوندی کے ماتحت واقع ہوتا تھا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کسی ضابطۂ قوانین کو اللہ تعالیٰ دستبرد انسانی اور حوادث ارضی و سماوی سے محفوظ و مصئون رکھنا چاہے اور کوئی قوت اس میں ردوبدل پیدا کر دے! کس میں یہ قوت ہے کہ ایسا کر سکے؟[1] اس لئے اگر ایک ضابطۂ قوانین اپنی اصلی شکل میں دنیا میں نہیں رہا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ ابدالآباد تک نافذ العمل رہنے کے لئے دیا ہی نہیں گیا تھا۔ اس لئے دوسرا ضابطہ آتا ہی اس وقت تھا جب پہلے کا نافذ العمل رکھا جانا مقصود نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا ایک جدید رسول کی

---

[1] قرآن کو ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا اس لئے اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے لیا اور آج تک کسی میں اتنی جرأت نہیں ہو سکی کہ اس کے ایک حرف کو بھی اپنی جگہ سے بدل دے۔ قرآن کس طرح قیامت تک کے لئے ضابطۂ زندگی ہے؟ اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

آمد پر کسی سابقہ رسول اور اس کی کتاب سے تمسک، اس نظامِ رشد و ہدایت کی مخالفت ہے جو اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ نے تجویز فرمایا ہے۔

(۱۷) اس نئے رسول کی وحی میں سابقہ رسول کی وحی کا وہ تمام حصہ موجود ہوتا جسے علیٰ حالہ رکھا جانا اللہ کو مقصود تھا۔ سابقہ وحی کا جو حصہ منسوخ کیا جاتا اس کی جگہ اس سے بہتر احکام و ضوابط دیئے جاتے۔ اور اس (سابقہ وحی) میں سے جو حصہ دستبردِ زمانہ کے ہاتھوں سے ضائع ہو چکا ہوتا اُسے اس نئی وحی میں دوبارہ دیدیا جاتا۔ لہٰذا وحیِ خداوندی کا یہ نیا ایڈیشن، سابقہ ایڈیشن کے مقابلہ میں ہر نوع (upto Date) ہوتا۔ اور یہ سب کچھ خدا کی طرف سے کیا جاتا۔

(۷) اور پھر یہ کہ۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ ایک رسول، صرف قانون کی کتاب دینے کے لئے ہی نہیں آتا بلکہ اس کے ساتھ ہی اُسے عملی طور پر متشکل کرنے کے لئے بھی آتا ہے۔ اور اس کی عملی تشکیل کی صورت فقط ایک ہے کہ سب سے پہلے مرکزِ حکومتِ الٰہیہ کی اطاعت کی جائے۔ اسی لئے فرمایا کہ

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔۔۔(۴/۶۴)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے جس کسی کو بھی منصبِ رسالت دے کر دنیا میں کھڑا کیا، تو اسی لئے کیا کہ ہمارے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

لہٰذا اس رسول کے متعین فرمودہ نظامِ زندگی کی موجودگی میں اپنے نظامِ کہن پر قائم رہنا حکومتِ الٰہیہ کے متوازی ایک دوسری حکومت (Parallel Govt.) قائم کرنا ہے جو صریحاً شرک ہے۔

کیا تمام مذاہب سچے ہیں؟

ان تصریحات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہے کہ ایک نئے رسول کی بعثت پر کسی سابقہ رسول کی طرف نسبت یا رہبرِ عمرِ خویش، اس کی شریعت کی اتباع میزانِ خداوندی میں کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی اس لئے کہ یہ روش تدبیرِ خداوندی کی کھلی ہوئی تکذیب ہے جس کے ماتحت اُس نے یکے بعد دیگرے رسول بھیجے۔ یہ روش اس امر کا اعلان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فعل (معاذ اللہ) بے سود اور لاحاصل تھا۔ لہٰذا آج یہ کہنا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ کھلی ہوئی گمراہی، قرآن کے عظیم الشان اصول کی بیّن تکذیب اور سلسلۂ رشد و ہدایت کی تدبیرِ خداوندی کے بے سود و لاحاصل ہونے کا واضح اعلان ہے۔ ہر مذہب میں اپنے اپنے وقت میں عالمگیر سچائیاں موجود تھیں۔ لیکن جب ان سچائیوں کا ضابطہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہ رہا اور مشیتِ ایزدی کو منظور ہوا کہ اس کی جگہ دوسرا ضابطہ قوانین بھیج دے تو اب سچائیاں جدید ضابطہ میں محصور ہو کر آ گئیں۔ یعنی یہ دوسرا ضابطہ آیا ہی اس وقت جب مشیت کو یہ منظور ہوا کہ دوسرا ضابطہ پہلے کی

جگہ لیلے۔ ورنہ اگر پہلا ضابطہ ہمیشہ کے لئے کافی سمجھا جاتا تو اللہ تعالیٰ کے لئے اسے ہمیشہ تک محفوظ رکھنے میں کونسی دقت تھی؟[1]

دنیا کے مذاہب میں عام طور پر دو ہی قسم کے نظریئے پائے جاتے ہیں۔

(۱) یا تو ہر مذہب کے پیرو یہ سمجھتے ہیں کہ سچائیاں صرف انہی کو ملی تھیں۔ کسی دوسرے مذہب کو سچائیاں ملی ہی نہ تھیں۔ یعنی ان کے بانی مذہب کے علاوہ کوئی اور مدعی رسالت و نبوت (معاذ اللہ) سچا نہ تھا۔

اور

(۲) یا بر ہمو سماجی قسم کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عالمگیر سچائیاں ہر مذہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ اس لئے اگر ہر مذہب کے پیرو اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر کاربند ہو جائیں تو منشائے خداوندی پورا ہو جائیگا۔

لیکن قرآن کو ماننے والا ان میں سے کسی نظریہ کی بھی تائید نہیں کر سکتا۔ اس کے نزدیک پہلا نظریہ اس لئے غلط ہے کہ اس کا ایمان ہے کہ تمام حضرات انبیاء کرامؑ اپنے اپنے وقت میں خدا کی طرف سے سچی تعلیم لائے تھے اس لئے وہ سچے تھے۔ ان کی تعلیم سچی تھی اور ان کے پیرو سچے تھے۔

اور دوسرے نظریہ کی اس لئے تائید نہیں کی جا سکتی کہ دوسرا رسول بھیجا ہی اس وقت جاتا تھا جب پہلے رسول کی تعلیم اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہتی تھی اور مشیت ایزدی کو منظور ہوتا تھا کہ پہلے ضابطہ کی تجدید اور اس میں مناسب حک و اضافہ کر کے ایک نیا ایڈیشن بھیجا جائے۔ اس لئے دوسرے رسول (یا ضابطہ) کی آمد پر اس پر ایمان اور اس کے پیغام کی اطاعت ضروری ہو جاتی تھی۔ چونکہ ان سب سے آخر میں محمد رسول اللہ مبعوث ہوئے اس لئے ہر ایک کے لئے آپ پر ایمان لانا اور آپ کے آوردہ ضابطۂ قوانین کی اطاعت کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ اور چونکہ مشیت کی اسکیم کے مطابق اس آخری ضابطۂ قوانین کو ہمیشہ کے لئے نصاب زندگی رہنا تھا، اسے اس انداز سے محفوظ و مصوّن رکھا گیا کہ اس کا ایک نقطہ بھی ادھر ادھر نہیں ہو سکا نہ ہو سکے گا۔ اس اجمال کی تفصیل کا

---

[1] ہم نے یہ لکھا ہے کہ ایک جدید ضابطۂ قوانین اس وقت آتا جب پہلا ضابطہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہ رہتا۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ دوسرا ضابطہ اس لئے آتا کہ پہلا ضابطہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں رہا تھا۔ بلکہ یہ کہ چونکہ پہلا ضابطہ ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رہنے کے لئے بھیجا ہی نہیں گیا تھا اس لئے دوسرا ضابطہ بھیجا جانا ضروری تھا۔ یہ تمام وقتی ضوابط تھے جن کی جزئیات و تفاصیل میں انسانی داعیات و مقتضیات کے ساتھ ساتھ ارتقائی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ آخری ضابطۂ قوانین انسان کے تمام مقتضیات کو سامنے رکھ کر عطا کیا گیا اس لئے اس کے بعد کسی اور تجدید کی ضرورت نہیں رہی اس میں وہ سب کچھ بھی ہے جو پہلے ضوابط میں تھا اور ان کے علاوہ وہ سب کچھ بھی جس کی تکمیل شرف انسانیت کے لئے ضرورت ہے۔

یہ موقعہ نہیں۔ یہ تفاصیل اپنے مقام پر آئیں گی۔ سردست انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ماحصل یہ کہ ہر رسول اپنے اپنے وقت میں خدائی ضابطۂ قوانین اپنے ساتھ لاتا تھا۔ (اسے الدین کہتے ہیں) اور اس کی عملی تشکیل سے بتا دیتا تھا کہ اس نظام کی اطاعت سے حکومت الٰہیہ کا قیام کس طرح ہوگا۔ (اسے الاسلام کہئے) لہٰذا دین خداوندی شروع سے ایک ہی تھا۔ لیکن رسول کے بعد اس کے پیرو اس میں اختلافات پیدا کر دیتے تھے اس لئے دوسرے رسول کے ذریعے (مناسب تغیرات کے ساتھ) اسی ضابطۂ حیات کی تجدید کرا دی جاتی تھی۔ اسی حقیقت کبریٰ کو قرآن کریم نے ان درخشندہ الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ○ (۳/۱۹)

بلاشبہ "الدین" (یعنی اصل دین) اللہ کے نزدیک "الاسلام" ہی ہے (اس ایک دین کے سوا اور کوئی دین نہیں) اور یہ جو اہل کتاب نے باہمدگر اختلاف کیا (اور گروہ بندیاں کرکے، الگ الگ دین بنالئے) تو یہ اس لئے نہیں ہوا کہ اس دین کے سوا انہیں کسی دوسرے دین کی راہ دکھلائی گئی تھی یا دین کی راہ مختلف ہوسکتی ہے، بلکہ (اس لئے کہ علم (وحی) کے حصول کے بعد وہ اس پر قائم نہیں رہے) اور آپس کی ضد اور عناد سے الگ الگ ہوگئے۔ اور یاد رکھو جو کوئی اللہ کی آیتوں سے انکار کرتا ہے (اور ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دیتا ہے) تو اللہ (کا قانون جزا) بھی حساب لینے میں سست رفتار نہیں!

دوسرے مقام پر ہے

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ ۖ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ۚ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ ۚ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ ○ وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (۴۲/۱۳-۱۴)

(دیکھو خدا نے) تمہارے لئے الدین سے وہ سب کچھ واضح کر دیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا۔ اور جو کچھ ہم نے (اے پیغمبر اسلام!) تمہاری طرف وحی بھیجی ہے اور (اسی کے ساتھ ہی)

وہ سب کچھ بھی جس کی ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا۔ (جس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ الدین کو قائم رکھو اور اس کے بارہ میں فرقہ فرقہ نہ بن جاؤ۔ یہ بات جس کی طرف تم لوگوں کو بلاتے ہو مشرکین کو بڑی گراں گذر رہی ہے (کہ خدا نے ہمیں چھوڑ کر اس کام کے لئے محمد کا انتخاب کیوں کیا) اللہ جسے چاہتا ہے اپنی طرف برگزیدہ کر لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع ہوتا ہے اسی کو ہدایت دیتا ہے۔ اور (دیکھو) یہ لوگ فرقوں فرقوں میں تقسیم نہیں ہوئے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس (خدا کی طرف سے) علم (کا نور) آچکا تھا اور وہ بھی کیوں؟ محض آپس کی عداوت کی وجہ سے!

ان حقائق کو سامنے رکھنے کے بعد قرآن کریم کی اس مرکزی تعلیم کا مفہوم بآسانی سمجھ میں آسکے گا۔ فرمایا۔

أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ○ (۳/۸۳)

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں، اللہ کا دین چھوڑ کر کوئی دوسری راہ ڈھونڈھ نکالیں؟ حالانکہ آسمان و زمین میں جو کوئی بھی موجود ہے، خوشی سے ہو یا ناخوشی سے، مگر سب اُسی کے حکم کے فرمانبردار ہیں اور بالآخر سب اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں!

یہاں ایک اصول بیان فرمادیا۔ اس کے بعد ارشاد ہے۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ أُنْزِلَ عَلٰٓى إِبْرٰهِيْمَ وَ إِسْمٰعِيْلَ وَ إِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْأَسْبَاطِ وَ مَآ أُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ (۳/۸۴)

(اے پیغمبر!) تم کہدو (ہماری راہ تو یہ ہے کہ) ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں، اور جو کچھ ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب، اور یعقوب کی اولاد پر نازل ہوا ہے، اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ نیز جو کچھ موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور (خدا کے تمام نبیوں کو خدا کی طرف سے ملا ہے، اس سب پر بھی ہمارا ایمان ہے۔ ہم ان رسولوں میں سے کسی ایک کو دوسروں سے جدا نہیں کرتے (کہ کسی کو مانیں کسی کو نہ مانیں) ہم خدا کے فرمانبردار ہیں۔ (اس کی سچائی جہاں کہیں بھی اور جس کی زبانی بھی آئی ہو، سچائی تھی) اور ہم اللہ کی اطاعت کرنے والے ہیں!

یہ ہے وہ سلسلہ رشد و ہدایت جو نوع انسانی کی راہ نمائی کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے قائم ہوا۔ اس لئے ہر اس شخص کے لئے جو اس آئین کے مطابق زندگی بسر کرنے کا اقرار کرتا ہے، اس حقیقت کا اعتراف بھی

ضروری ہے کہ تمام انبیاء کرامؑ کا سرچشمہ تعلیم ایک ہی تھا اور وہ سب اپنے دعوائے رسالت و نبوت میں سچے تھے ان کی تعلیم بھی سچی تھی لیکن وہی تعلیم جو ان پر نازل ہوئی تھی۔ نہ وہ جو دوسرے رسول کے آنے کے وقت رسول سابق کے نام لیواؤں کے پاس تھی۔ اسی لئے مَآ اُنۡزِلَ عَلٰۤی اِبۡرٰهِيۡمَ جو کچھ ابراہیم پر نازل کیا گیا تھا) اور وَمَآ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی وَ عِيۡسٰی (جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا تھا) پر ایمان ضروری ہے نہ کہ اس تعلیم پر جو ان حضرات کی طرف بعد میں منسوب کر دی گئی۔ اگر اس بعد کی مسخ شدہ تعلیم پر (ایمان ضروری (یا کافی) ہوتا تو کسی جدید رسول کے آنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ ہے الدین اور یہ ہے الاسلام۔ لہٰذا

وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ‌ۚ وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ۝ (۳/۸۵)

اور (دیکھو) جو کوئی اسلام کے سوا (جو خدا کی طرف سے نصاب زندگی کا آخری ایڈیشن اور مکمل نصاب زندگی ہے) کسی دوسرے دین کا خواہشمند ہوگا، تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور آخرت کے دن اس کی جگہ ان لوگوں میں ہوگی جو تباہ و نامراد ہوں گے۔!

یہ ہے وہ سلسلۂ رسالت جو اس زمانہ سے شروع ہوا جب انسانی شعور نے اپنی آنکھ کھولی اور جادۂ منزل بہ منزل آگے بڑھتا ہوا حضرت عیسیٰؑ تک آ پہنچا۔

ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا تَتۡرَا (۲۳/۴۴)

پس ہم نے لگاتار یکے بعد دیگرے، اپنے رسول بھیجے۔

آنیوالے کی تصدیق

یہ سلسلہ یوں تھا کہ ہر جانے والا رسول اپنے متبعین کو تاکید کر جاتا کہ اس کے بعد جو رسول آئے اس کی اتباع کرنا۔ کیونکہ (ہر چند تمہیں اس کی تعلیم اس مسخ شدہ تعلیم سے جو اس وقت تمہارے پاس ہوگی مختلف نظر آئے گی لیکن) وہ درحقیقت میری ہی تعلیم کی تصدیق کرے گا اور اسی سلسلۃ الذہب کی اگلی کڑی ہوگا۔

وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيۡتُكُمۡ مِّنۡ كِتٰبٍ وَّحِكۡمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَـنۡصُرُنَّهٗ‌ ؕ قَالَ ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰى ذٰ لِكُمۡ اِصۡرِىۡ‌ ؕ قَالُوۡۤا اَقۡرَرۡنَا‌ ؕ قَالَ فَاشۡهَدُوۡا وَاَنَا مَعَكُمۡ مِّنَ الشّٰهِدِيۡنَ ۝ (۳/۸۱)

اور دیکھو۔ جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے نبیوں کے بارے میں عہد لیا تھا کہ ہم نے تمہیں کتاب اور حکمت

عطا فرمائی ہے۔ پھر اگر ایسا ہو کہ کوئی (دوسرا) رسول اُس تعلیم کو سچا کرکے دکھلانے کے لئے آئے جو تمھارے پاس ہے تو ضروری ہے کہ تم اُسے مانو اور اس کی تائید کرو (کیونکہ اصل دین ایک ہی ہے اور جتنے بھی خدا کے رسول ہیں، سب اُسی کی دعوت دینے والے تھے) ارشادِ الٰہی ہوا تھا کہ "کیا تم اس بات کا اقرار کرتے ہو اور اس کا ذمہ لیتے ہو؟" انھوں نے عرض کیا تھا "بیشک، ہم اقرار کرتے ہیں" اس پر اللہ نے فرمایا تھا "ہاں، اس پر گواہ رہو، اور دیکھو تمھارے ساتھ خود میں بھی اس پر گواہ ہوں!"

سورۂ انعام میں اس داستان ذریں کو ایک ہی مقام پر یوں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے جیسے آسمان آنکھ کے تل میں۔ فرمایا

وَ تِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنٰهَا إِبْرٰهِيمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۚ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ٥ (۶/۸۳)

اور (دیکھو) یہ ہماری حجت ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم پر دی تھی۔ ہم جس کے مرتبے بلند کرنا چاہتے ہیں (اُسے علم و بصیرت دے کر) بلند کر دیتے ہیں، اور یقیناً تمھارا پروردگار حکمت والا، علم رکھنے والا ہے!

اس کے بعد

وَ وَهَبْنَا لَهٗٓ إِسْحٰقَ وَ يَعْقُوبَ ۚ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَ نُوحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ أَيُّوبَ وَ يُوسُفَ

---

[1] اس رسول سے مراد (جس کی تصدیق و تائید کا حکم دیا گیا ہے) رسول آخر الزماں ہی ہو سکتا ہے اور اس کے شواہد و آثار کتب سابقہ کے ان بچے کھچے کھنڈرات سے مل سکتے ہیں۔ جنھیں آج اہل کتاب انبیائے سابقہ کی طرف منسوب کرتے ہیں (تفصیل معراج انسانیت میں ملے گی) سورۂ احزاب میں حضرات انبیائے کرام کے ایک اور میثاق کا بھی ذکر ہے۔ لیکن وہ میثاق ان کی تبلیغ رسالت کے متعلق ہے

وَ إِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوحٍ وَّ إِبْرٰهِيمَ وَ مُوسٰى وَ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ أَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيثَاقًا غَلِيظًا ۙ لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِينَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَ أَعَدَّ لِلْكٰفِرِينَ عَذَابًا أَلِيمًا ٥ (۳۳/۸)

اور (اے پیغمبرِ اسلام! یاد کرو) جب ہم نے تمام انبیاء سے ان کا ایک عہد لیا تھا اور تم سے بھی اور نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی اور ہم نے ان سے سخت عہد لیا تھا کہ اُن کی سچائی کے متعلق وہ سچے لوگوں سے دریافت کرے گا اور انکار کرنے والوں کے لئے اُس نے (جہنم میں) دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

وَ مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝ وَ زَكَرِیَّا وَ یَحْیٰی وَ عِیْسٰی وَ اِلْیَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ الْیَسَعَ وَ یُوْنُسَ وَ لُوْطًا ؕ وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۶ / ۸۴-۸۶)

اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور (اسحاق کا بیٹا) یعقوب دیا۔ ہم نے ان سب کو راہ راست دکھائی اور ابراہیم سے پہلے نوح کو دکھا چکے ہیں۔

اور ابراہیم کی نسل میں سے داؤد، سلیمان ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون کو بھی (ہم نے) راہ دکھائی۔ ہم اسی طرح نیک کرداروں کو ان کی نیک کرداری کا بدلہ دیتے ہیں۔

اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، اور الیاس کو، کہ یہ سب صالح انسانوں میں سے تھے۔ اور نیز اسماعیل، الیسع یونس، اور لوط کو، کہ ان سب کو ہم نے دنیا والوں پر برتری دی تھی۔

پھر تفصیل سے ہٹ کر اجمال آگیا۔

وَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ وَ اِخْوَانِهِمْ ۚ وَ اجْتَبَیْنٰهُمْ وَ هَدَیْنٰهُمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ (۶ / ۸۷)

اوران کے آباؤ اجداد، اوران کی نسل، اوران کے بھائی بندوں میں سے بھی کتنوں ہی کو ہم نے اسی راہ چلایا۔ ان سب کو ہم نے برگزیدہ کیا تھا، اور (فلاح وسعادت کی) سیدھی راہ اُن پر کھول دی تھی۔

یہ تمام حضرات اللہ کی طرف سے ہدایت لے کر آئے تھے۔

ذٰلِكَ هُدَی اللّٰهِ یَهْدِیْ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ لَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ (۶ / ۸۸)

یہ اللہ کی ہدایت ہے۔ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے، اس کی روشنی دکھا دے۔ اور اگر یہ لوگ (توحید کی راہ کو چھوڑ کر) شرک کرتے، تو (یقین کرو، کبھی فلاح وسعادت کی راہ نہ پاتے، اور) ان کا سارا کیا دھرا ضائع ہو جاتا!

انھیں کتاب اور حکومت عطا ہوئی تھی۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ یَّكْفُرْ بِهَا هٰۤؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّیْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِیْنَ ۝ (۶ / ۸۹)

(اے پیغمبر!) یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ہم نے کتاب، اور حکومت اور نبوت (کی نعمت) عطا فرمائی۔ پھر اگر یہ (مشرکین عرب) اس نعمت سے انکار کرتے ہیں (تو انکار کریں۔ ان کے انکار سے کچھ

بگڑنے والا نہیں۔ ہم نے اس کی نگہداشت (حفاظت) ایک ایسے گروہ کے حوالے کر دی ہے جو (ان لوگوں کی طرح) سچائی سے انکار کرنے والا نہیں (بلکہ اس کا شناسا اور قدر شناس ہے)

یہی وہ ضابطۂ ہدایت ہے جس کی اقتدار آج بھی ضروری ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۖ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ ۗ قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ ۝ (۶/۹۰)

(اے پیغمبر!) یہ وہ لوگ ہیں، جنھیں خدا نے راہ حق دکھادی۔ پس انہی کی راہ کی تم بھی پیروی کرو۔ تم کہدو "میں اس (رہنمائی) پر تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا۔ یہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمام دنیا کے لئے (ایک فراموش کردہ حقیقت کی) یاددہانی ہے (اور جب صورت یہ ہے۔ تو تم مجھے کتنی ہی تکلیف و اذیت دو، میں ادائے فرض سے باز آنے والا نہیں)

اب یہ ضابطہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اس کے باہر صفحۂ ہستی پر اور کہیں نہیں پہلی کتابوں کی اصلی تعلیم بھی اسی کے اندر محفوظ ہے۔

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ ۖ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۚ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۖ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۚ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝ (۵/۴۸)

اور (اے پیغمبر! اسی طرح) ہم نے تمہاری طرف سچائی کے ساتھ کتاب بھیجی، وہ ان کتابوں کی تعلیم کو سچ کر دکھانے والی ہے، جو پہلے آ چکی ہیں اور ان سب کو اپنے اندر لئے ہوئے (مہیمن) ہے، سو چاہیے کہ خدا کی نازل کی ہوئی کتاب کے مطابق ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو، اور جو سچائی تمہارے پاس آچکی ہے، اسے چھوڑ کر لوگوں کی خواہش اور رایوں کی پیروی نہ کرو۔

تم میں سے ہر ایک گروہ کے لئے ہم نے ایک "شرع" اور "منہاج" ٹھہرا دی (یعنی مذہبی زندگی کا دستور العمل اور طور طریقہ ٹھہرا دیا) اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا (یعنی ایک ہی طرح کی استعداد و حالت پر پیدا کرتا اور تم میں اختیار و ارادہ کی صلاحیت نہ ہوتی) لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ اور اس لئے نہیں کیا، تاکہ جو کچھ (تمہاری حالت اور ضرورت کے مطابق

وقتاً فوقتاً تمھیں دیا گیا ہے۔ اس کے ذریعے تمھاری صلاحیتوں کی پرکھ ہوتی رہے۔ (اور تمھارے لئے طلب و ترقی کی راہیں پیدا ہوں) پس نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ نکلنے کی کوشش کرو۔ بالآخر تم سب کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ پھر وہ تمھیں بتلائے گا کہ جن باتوں میں باہمد گر اختلاف کرتے تھے ان کی حقیقت کیا ہے۔

یہیں اس شجر طوبیٰ کے برگ و بار جس کی جڑیں پاتال ہیں محکم و مضبوط۔ اور شاخیں عرش کے کنگروں کو چھو رہی ہیں۔ نوع انسانی کے وہ شفیق و غم گسار جنہوں نے ساری دنیا کی مصیبتیں اور مشکلیں اپنے سر پر لیں تاکہ دنیا بھر کے مصیبت زدوں کی مصیبتیں ٹل جائیں۔ انھوں نے اپنے نالۂ نیم شبی اور آہ سحر گاہی سے کائنات کی روح کو تھرا دیا۔ تاکہ جاہل اور ظالم انسان ہلاکتوں اور بربادیوں کے جہنم سے بچ جائے۔ انھوں نے اپنی مضطرانہ دعاؤں اور بے تابانہ التجاؤں سے رحمت الٰہی کے سحاب کرم کو کھینچ کھینچ کر بلایا کہ انسانیت کا حاصل مزرع، جور و استبداد کی باد سموم سے جھلس کر نہ رہ جائے۔ انھوں نے سر مژگاں جھک جانے والے ستاروں اور مقدس رخساروں پر ڈھلک آنے والی آب اروں سے انسانی بدبختیوں کے ظلمتناک دھبوں کو دھو ملانے کی کوشش کی لیکن جب سرکش اور متمرد انسانوں نے اپنی روش تغلب و استیلار کو کسی طرح نہ چھوڑنا چاہا تو وہ جلال آسمانی کی آتشیں شمشیر لے کر آگے بڑھے اور ہر طاغوتی قوت پر برق خاطف بن کر گرے اور یوں ان کمزور و ناتوان انسانوں کو، جنھیں زمانہ اس جرم کی پاداش میں ہدف جور و ستم بنا رہا تھا کہ وہ خدا کے سامنے کیوں جھکتے ہیں، خاک کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ دنیا میں انسانی قوانین کی جگہ خدائی نظام زندگی نے لے لی جس کے سایۂ عاطفت میں انسانیت بڑھتی۔ پھولتی پھلتی اس مقام کی طرف رواں دواں جادہ پیما ہوئی جو اس کا منتہیٰ و مقصود تھا۔ خدا کی رحمت ہو ان برگزیدہ انسانوں پر جنھوں نے دنیا کو بتا دیا کہ زمین پر اللہ کی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؛

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۚ
وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۚ وَالْحَمْدُ
لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۳۷/۱۸۰-۱۸۲)

(اے پیغمبر اسلام!) تیرا پروردگار، پروردگار عزت بہت بلند ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر جو لوگ بیان کرتے ہیں۔ اور (اس کے) رسولوں پر سلامتی ہو۔ اور ہر قسم کی تعریفیں خدا،

پروردگارِ جہانیاں ہی کو سزاوار ہیں۔

حضور خاتم النبیینؐ کے بعد (کوئی رسول اور نبیؐ نہیں آسکتا) یہ سلسلۂ حکومتِ خداوندی کس طرح آگے چلے گا اور کس طرح قرآن کریم تمام نوعِ انسانی کے لئے عملی نظامِ زندگی بنے گا؟ اس کی تفصیل معراجِ انسانیت میں ملے گی۔

---

[1] "ابلیس و آدم" - عنوان رسالت میں بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے رسول اور نبی میں کوئی فرق نہیں اور تشریعی اور غیر تشریعی کی تفریق بھی ذہنِ انسانی کی خود ساختہ ہے۔ ہر رسول یا نبی خدا کا پیغام لے کر آتا ہے اور وہی پیغام اس کی کتاب شریعت ہوتا ہے۔

اور یہ ہیں امم گذشتہ

تِلْكَ اُمَّةٌ

قَدْ خَلَتْ (۲-۴)

باز خوانم قصۂ پارینہ را
تازہ سازم داغہائے سینہ را

تِلۡكَ أُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ

(اور یہ ہیں اقوام سابقہ)

نور و نکہت کے اس کاروانِ رشد و ہدایت کی جمال آفرینیوں اور جلال انگیزیوں میں ہم اس درجہ محو رہے کہ ان وادیوں اور شاخساروں کی تفصیلات کو اچھی طرح دامنِ نگاہ میں نہ سمیٹ سکے جن سے یہ قافلہ گزرا ہے۔ آیئے ایک طائرانہ نگاہ ان پر بھی ڈالتے چلیں، اس لئے کہ حضرات انبیاء کرامؑ کے سلسلۂ تعلیم و تبلیغ کے ساتھ جب تک ان اقوام و ملل کے احوال و ظروف سامنے نہ آجائیں جن کی طرف وہ حضرات مبعوث ہوئے تھے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا جس کے لئے قرآن کریم نے اس سلسلہ کو اس شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ اقوام سابقہ کی تفاصیل جوئے نور، برق طور اور زیر نظر کتاب کے سابقہ اوراق میں آچکی ہیں۔ آئندہ سطور میں فقط ان اُصول و اساسات کی یاد تازہ کرائی جائے گی جن کے ماتحت وہ واقعات ظہور پذیر ہوئے تھے۔

انسان کا سب سے بڑا شرف علم ہے اور حصولِ علم کے اہم گوشے مشاہدات و تجربات۔ مشاہدات انسان کی اپنی نگاہ تک محدود ہوتے ہیں اور تجربات اس کی اپنی عملی زندگی میں محصور۔ لیکن (جب ایک فرد یا ایک نسل کے تجارب و مشاہدات کو اگلی نسلوں تک منتقل کر دیا جائے تو اسے تاریخ کہتے ہیں) تاریخ دنیائے انسانیت کا اہم ترین شعبہ ہے۔ انسان کی تمام ترقیوں کا راز اسی میں مضمر ہے۔ زمانہ اپنی ارتقائی منازل اسی کے سہارے طے کرتا ہے۔ انسان کی علمی سطح اسی کے بل بوتے پر بلند ہوتی ہے۔ تہذیب و تمدن کی جس قدر متاعِ گراں اور علم و سائنس کی جس قدر تابناک روشنی آپ کو آج یا جب اور جہاں کہیں، نظر آئے وہ تاریخ ہی کی رہینِ منت ہوگی۔

علمِ تاریخ تاریخ کیا ہے؟ قرنہا قرن کی انسانی جد و جہد کا ماحصل! ہزارہا سال کی مسلسل و متواتر تگ و دو کا نچوڑ! اقوام و ملل کی سینکڑوں پشتوں اور نسلوں کا اندوختہ! ایک دریائے

علم و ہنر جو اپنے منبع کے قریب ایک جوئے کم آب سے زیادہ نہ تھا لیکن جوں جوں آگے بڑھتا گیا ساحل ناآشنا ہوتا چلا گیا۔ آج آپ بلا تامل و کاوش سنکھیا کی ڈلی کو دور پھینک دیتے ہیں اور شکر کی ڈلی کو منہ میں ڈال لیتے ہیں لیکن آپ کو کیا معلوم کہ سنکھیا اور شکر میں تمیز کرنے کے لئے زمانے کو کتنی قربانیاں کرنی پڑی ہوں گی۔ آج آپ کا موٹر بلا تکان ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے فراٹے بھرتا اڑے چلا جاتا ہے لیکن آپ کیا جانیں کہ پہیہ کی ایجاد سے لے کر موٹر کی ساخت تک ذہن انسانی کو کن کن سنگلاخ وادیوں اور ناہموار پتھریلی شاہراہوں سے گذرنا پڑا ہوگا۔

لیکن یہ سب ترقی کس طرح ہو رہی ہے؟ اس عروج و ارتقاع کا راز کیا ہے؟ انسان اپنے تاریخی سرمایہ (یعنی آبا و اجداد کے تجربات و مشاہدات) سے کس طرح اتنا بیش بہا فائدہ اٹھا رہا ہے؟ اس کا جواب ایک اور فقط ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ فطرت کے قوانین اٹل ہیں۔ آج سے دس ہزار سال پیشتر انسان نے دیکھا کہ سم الفار انسانی زندگی کے لئے ہلاک ہے۔ ہم آج بھی اس کی ہلاکت آفرینی پر بلا تردد و تامل یقینی حکم لگا دیتے ہیں۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ ہمیں معلوم ہے کہ مرور زمانہ سے سم الفار کی تاثیر نہیں بدل سکتی۔ اگر یہ دس ہزار سال پیشتر زہر تھا تو آج بھی زہر ہی ہے اگر افریقہ میں زہر تھا تو امریکہ میں بھی زہر ہے۔ اس لئے کہ فطرت کے قوانین اٹل ہیں۔ یہ تمام سلسلۂ کائنات صرف اسی ایک محور پر گھوم رہا ہے کہ فطرت کے قوانین اٹل ہیں۔

پھر یہ کہ فطرت کے قوانین کا دائرۂ عمل فقط طبیعی دنیا (Physical World) تک ہی محدود نہیں۔ انسانی حیات اجتماعیہ میں بھی قوانین اسی طرح اٹل ہیں۔ اگر صحیح قوانین کے خلاف زندگی بسر کرنا جوہر انسانیت کی بالیدگی کے لئے دس ہزار سال پیشتر مہلک تھا تو آج بھی اسی طرح ہلک ہے۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اگر طبیعی دنیا میں تاریخ یعنی انسانی مشاہدات و تجارب کا آگے منتقل ہوتے جانا، انسانی عروج و ارتقاء کا نقطۂ ماسکہ ہے تو دنیائے عمرانیت و اجتماعیت میں بھی تاریخ اسی طرح محور و مرکز ہے۔

تاریخ اور قرآن

قرآن کریم قدم قدم پر تاریخی مطالعہ پر زور دیتا ہے۔ وہ اپنے اٹل اور محکم دعاوی کی تائید میں تاریخی نظائر و شواہد پیش کرتا ہے اور ہر صاحب بصیرت کو دعوت غور و فکر دیتا ہے کہ جب فلاں قسم کی روش زندگی نے فلاں فلاں وقت میں فلاں قسم کا نتیجہ پیدا کیا تھا تو کیا وہی روش زندگی آج بھی اسی قسم کا نتیجہ پیدا نہ کرے گی؟ یہ ہے مقصد قرآن کریم میں امم سابقہ اور اقوام گذشتہ کے احوال و ظروف بیان کرنے کا (حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کو ایک سائنس کی حیثیت سے سب سے پہلے قرآن کریم ہی نے پیش کیا۔ ورنہ اس سے پیشتر تاریخ وقائع نگاری کی حد سے آگے نہ بڑھی تھی) واقعات سے استنباط نتائج، یہ ہے سائنس اسی سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ یعنی ہم نے دیکھا کہ فلاں زمانہ

لہ ہم کن معانی میں اٹل ہیں؛ اس کی طرف ابلیس و آدم عنوان میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔

ہیں فلاں قوم میں اس قسم کی نفسیاتی کیفیات پیدا ہوئیں تو ان سے اس قسم کے نتائج ظہور میں آئے۔ اس کے بعد جب بھی اُس قسم کے اسباب پیدا ہوں گے۔ اسی قسم کے نتائج مرتب ہوں گے اور یہ سب اس لئے کہ یہ کارخانۂ ہست و بود یونہی اتفاقیہ وجود میں نہیں آگیا۔ بلکہ ایک خاص مصلحت و مقصد کے ماتحت عمل میں لایا گیا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو چیز کسی خاص منتہیٰ کو پیشِ نظر رکھ کر پیدا کی گئی ہو اس کی ہر حرکت ایک خاص قاعدہ اور قانون کے ماتحت واقع ہونی چاہیئے۔ اسی کو قانونِ فطرت کہتے ہیں۔ سورۂ انبیاء کی مندرجہ ذیل آیات پر غور فرمایئے اور دیکھئے کہ اس حقیقتِ کبریٰ کو قرآن کریم نے کس حسن و زیبائی سے چند جملوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے فرمایا۔

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۝ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَ مَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ ۝ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ۝ (۲۱/۱۱–۱۵)

اور کتنی ہی بستیاں جو ظلم و فساد میں غرق تھیں ہم نے پامال کر ڈالیں اور اس کے بعد دوسرے گروہوں کو اُٹھا کھڑا کیا۔ جب ہمارا عذاب انھوں نے محسوس کیا تو دیکھو، اچانک بستیوں سے بھاگ رہے ہیں اب بھاگتے کہاں ہو؟ اسی عیش و عشرت میں لوٹو (جس نے تمھیں اس قدر سرشار کر رکھا تھا) اور اپنی مکانوں میں (جن کی مضبوطی کا تمھیں غرہ تھا) وہاں تم سے پوچھا جائے گا کہ تمھیں اس عیش پرستی کا حق کیسے حاصل تھا) بستیوں کے باشندوں نے پکارا، افسوس ہم پر۔ ہم بلاشبہ ظلم کرنے والے تھے۔ تو دیکھو وہ برابر یہی پکارا کئے۔ یہاں تک کہ ہم نے انھیں ہلاک کر دیا۔ کٹے ہوئے کھیت کی طرح، بجھے ہوئے انگاروں کی طرح۔

ان آیات کو سرسری نگاہ سے نہ دیکھئے۔ ان پر ایک مرتبہ پھر بنگاہِ تدبر غور کر لیجئے اس لئے کہ ان میں قانونِ فطرت کا ایک نہایت اہم گوشہ سامنے لایا گیا ہے۔ یعنی قانونِ مکافات جو فطرت کے ہر قانون کی طرح اٹل اور محکم ہے۔ اس کے بعد فرمایا۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ (۲۱/۱۶–۱۷)

اور دیکھو ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، کچھ کھیل تماشہ کرتے ہوئے نہیں بنایا۔

دبلکہ کسی مصلحت و مقصد سے بنایا ہے۔ اگر ہمیں کھیل تماشا بنانا منظور ہوتا تو ہمیں اس سے کون روک سکتا تھا؟) ہم خود اپنی جانب سے ایسا ہی کارخانہ بنا تے۔ مگر ہم ایسا کرنے والے نہ تھے۔

آپ نے غور فرمایا کہ سابقہ آیات اور ان آیات میں کیسا ربط مضمون ہے! کس قدر گہرا تعلق ہے! فرمایا کہ یہ تمام سلسلۂ کائنات ایک خاص مقصد کے ماتحت عمل میں لایا گیا ہے۔ اس لئے یہاں ایک عالمگیر قانون کام کر رہا ہے۔ اور وہ قانون ہے حق و باطل کی باہمی کشمکش کا۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ ○ (۲۱/۱۸)

بلکہ (یہاں حقیقت حال ہی دوسری ہے) ہم حق سے باطل پر چوٹ لگاتے ہیں تو وہ باطل کا سر کچل ڈالتا ہے اور اچانک اسے فنا کر دیتا ہے۔ افسوس تم پر۔ تم کیسی کیسی باتیں بیان کرتے ہو!

دنیا میں جو چیز حق پر ہے (یعنی قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر رہی ہے۔ وہ باقی رہے گی۔ وہ آگے بڑھے گی۔ جو اس کے خلاف روش اختیار کرے گی رک جائے گی۔ مٹ جائے گی۔ فنا ہو جائے گی۔ وہ عالم آفاق کی کوئی شے ہو۔ یا انسانوں کی کوئی جماعت، سب کے لئے ایک ہی قانون نافذ العمل ہے۔ کائنات کیا ہے؟ اس اہم قانون کے زندہ شواہد کا مجموعہ۔ اور سچی تاریخ کیا ہے! اس قانون کی عملی صداقتوں کا صحیفہ! اس لئے قرآن کریم نے جہاں اس عالمگیر قانون کو پیش کیا ہے جس کے ماتحت حق و باطل کے تصادم و تزاحم کے فیصلے ہوتے ہیں، وہاں وہ امم سابقہ کی تاریخ کو بھی سامنے لایا ہے۔ تاکہ اس قانون کی صداقت پر خود انسانی سرگذشت شہادت دیدے۔

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ آيَاتٍ مُبَيِّنَاتٍ وَمَثَلًا مِنَ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ ○ (۲۴/۳۴)

(اے پیروان دعوت ایمانی!) بلاشبہ ہم نے تمہاری طرف واضح کرنے والی آیتیں اور ان قوموں کی مثالیں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں اور تقویٰ شعار لوگوں کے لئے نصیحت کی باتیں، اتار دی ہیں (تاکہ تم ان پر غور کرو اور اس سے فائدہ اٹھاؤ۔)

سُنَّۃُ اللہ یہ عالمگیر قانون جو قوموں کی موت و حیات اور عروج و زوال کو منضبط کرتا ہے سنت اللہ (یعنی خدا کا مقررہ قاعدہ) کہلاتا ہے۔ سورۂ مومن میں ہے۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْهُمْ وَأَشَدَّ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَمَا أَغْنَى عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ○ (۴۰/۸۲)

(اے پیغمبر اسلام!) کیا یہ منکرین دعوت ایمانی) زمین میں گھومے پھرے نہیں کہ ان لوگوں کا انجام دیکھ لیتے جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔ وہ لوگ تعداد میں بھی ان سے زیادہ اور طاقت اور زمینی استحکامات میں بھی ان سے بڑھ کر مضبوط تھے (مگر کیا ہوا؟ جب خدا کا فیصلہ یعنی مکافات عمل کا وقت آیا) تو جو کچھ (استحکامات وغیرہ) وہ کرتے رہتے تھے (خدا کے عذاب کے مقابلہ میں) ان کے کسی کام نہ آسکے۔

ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (۸۳/۴۰)

چنانچہ جب ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیوں کو لے کر آئے (تو ان پر غور و خوض کرنے کے بجائے) اپنے اس (ناقص و ناکارہ) علم پر اترانے لگے جو ان کے پاس (آباؤ اجداد سے چلا آرہا) تھا اور ان کی وہ باتیں خود انہی پر مسلط ہو کر رہیں جن کے ساتھ وہ لوگ (انبیاء کا) مذاق اڑایا کرتے تھے۔

اس پر جب ان کے اعمال کے ظہور نتائج کا وقت آگیا تو چلا اٹھے کہ۔

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝ (۸۴/۴۰)

پھر جب انھوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا تو چلانے لگے کہ ہم خدائے یکتا و یگانہ پر ایمان لائے اور ہم نے ان (جھوٹے خداؤں) کا انکار کیا جن کو ہم خدا کے ساتھ شریک کرنے والے تھے۔

لیکن مہلت کا وقفہ گزر جانے کے بعد نتائج برآمد ہو کر رہتے ہیں۔ یہ اللہ کا مقررہ قاعدہ (سنت اللہ) ہے۔

فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۸۵/۴۰)

(اب) جبکہ وہ ہمارا عذاب (کھلی آنکھوں) دیکھ چکے تھے تو ان کا یہ ایمان انھیں نفع دینے والا نہیں تھا۔ یہی اللہ کا قانون ہے جو اس کے بندوں میں چلا آرہا ہے۔ اور یہاں (یعنی اس حد تک) پہنچ کر انکار کرنے والے (ہمیشہ) خسارہ ہی میں رہے۔

یہ سنت اللہ (مقررہ قاعدہ) کسی ایک جماعت۔ ایک زمانہ یا ایک جگہ تک محدود نہ تھا۔ یہ مکافاتِ عمل کا عالمگیر قانون ہے۔ اس لئے جہاں جہاں انسان تھا، یہ قاعدہ کارفرما رہا۔ اُمم گذشتہ میں بھی اور آج بھی۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ

لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ٥ (۳۳/۶۲)

ان لوگوں میں جو پہلے گذر چکے ہیں، اللہ کا مقررہ قانون یہی تھا، اور (اے پیغمبر اسلام! آئندہ بھی) تم اللہ کے مقررہ قانون میں ہرگز ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے!

اس لئے کہ اللہ کے قوانین محکم اور اٹل ہوتے ہیں۔

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا (۳۳/۳۸)

ایسا کام کر گزرنے میں نبی پر کوئی مضائقہ نہیں ہے جسے اللہ نے اس کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ ان لوگوں میں جو پہلے ہو گزرے ہیں یہی اللہ کا مقررہ قانون رہا ہے۔ اور اللہ کا ہر کام اندازہ پر مقرر کیا ہوا ہے۔

اس قانون میں کبھی تبدل و تحول نہیں ہو سکتا۔

اسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَ مَكْرَ السَّيِّئِ ؕ وَ لَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ؕ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ٥ (۳۵/۴۳)

(خدا کی) زمین میں غرور کرنے اور بدی کی خفیہ تدابیر کی وجہ سے (ان کی بیزاری ہی بڑھتی رہی) اور (یاد رکھو) بدی کی خفیہ تدابیر اپنے کرنے والوں کے سوا کسی اور پر مسلط نہیں ہوتیں۔ تو کیا یہ لوگ پہلے لوگوں کے طریقہ ہی کا انتظار کر رہے ہیں (اگر ایسا ہے تو اے پیغمبر!) تم ہرگز ہرگز خدا کے مقررہ قانون میں نہ کوئی تبدیلی اور نہ ہی اس کے مقررہ قاعدے میں کسی قسم کا تغیر پاؤ گے۔

۔ حق پرستوں کی جماعت کے متعلق۔

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَ لَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ٥ (۱۷/۷۷)

ہم تجھ سے پہلے، جو پیغمبر بھیج چکے ہیں، ان سب کے معاملہ میں ہمارا ایسا ہی قاعدہ رہا ہے، اور تو ہمارے ٹھہرائے ہوئے قاعدوں کو کبھی بدلتا ہوا نہ پائے گا!

۔ ان کی مخالفت کرنے والے سرکشوں کے متعلق۔

وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَ يَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ

قُبُلًا ۞ (۱۸ نیز ۳۴)

اور جب لوگوں کے سامنے ہدایت آگئی، تو ایمان لانے اور طلب گار مغفرت ہونے سے انھیں کونسی بات روک سکتی ہے؟ مگر یہی کہ اگلی قوموں کا سا معاملہ انھیں بھی پیش آجائے۔ یا ہمارا عذاب سامنے آکھڑا ہو۔

اس لئے کہ زمانہ کے بدل جانے سے طریق کار کی شکلوں میں تبدیلی ہوسکتی ہے۔ اصل روح ہر جگہ وہی رہتی ہے سورۂ ذاریات میں ہے۔

كَذٰلِكَ مَا أَتَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ۞ أَتَوَاصَوْا بِهِ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ ۞ (۵۱ – ۵۳)

بالکل اسی طرح، ان سے پہلی قوموں کے پاس کوئی رسول نہیں آیا مگر انھوں نے (ہمیشہ) یہی کہا کہ یہ جھوٹا ہے یا کوئی پاگل ہے۔ کیا اسی ایک جواب کی یہ ایک دوسرے کو نصیحت کرتے چلے آئے ہیں؟ (نہیں)، بلکہ یہ لوگ دراصل سرکش قوم کے افراد ہیں (اور خوئے سرکشی ان سب کی گفتگو تک میں یکسانیت پیدا کرتی چلی آئی ہے)۔

یعنی اس کی ضرورت نہیں کہ پہلی سرکش اور گمراہ قومیں آنے والی قوموں کے لئے وصیت چھوڑ جائیں کہ جب تمھیں حق کی دعوت دی جائے تو تم اس قسم کی روش اختیار کرنا۔ سرکش جذبات کا ہر جگہ تقاضا ہے کہ وہ اسی قسم کی روش اختیار کریں۔ سانپ کا بچہ کتابیں پڑھ کر ڈسنا نہیں سیکھتا۔ یہ اس کی فطرت کی گہرائیوں میں مضمر ہوتا ہے۔ اس لئے حق و باطل کے معرکہ میں ہر مقام پر اور ہر زمانہ میں تزاحم و تصادم بھی ایک جیسا ہوگا اور نتیجہ بھی یکساں۔ فرق صرف طریق کار میں ہوگا۔

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی۔ نہ حریف پنجہ شکن نئے
وہی فطرت اسد اللہی۔ وہی مرحبی وہی عنتری

ایک بنیادی اصول

یہ سنت اللہ کیا ہے؟ بالکل سیدھی سادی بات۔ واضح بین غیر مبہم اور نہایت آسانی سے سمجھ میں آجانے والی۔

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۙ وَأَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۞ (۸)

(اور) یہ بات اس لئے ہوئی کہ اللہ کا مقررہ قانون ہے کہ جو نعمت وہ کسی گروہ کو عطا فرماتا ہے اسے پھر کبھی نہیں بدلتا۔ جب تک کہ اس گروہ کے افراد اپنی نفسیاتی کیفیت نہ بدل لیں۔ اور

اس لئے بھی کہ اللہ (سب کی) سنتا اور (سب کچھ) جانتا ہے!

نعمتیں ملتی اُسے ہیں جو اس کا اہل ہوتا ہے۔ پھر جب تک کوئی قوم اپنے اندر اہلیت رکھتی ہے ان نعمتوں سے سرفراز رہتی ہے۔ لیکن جب وہ اپنے تصورات زندگی (مَا بِاَنْفُسِہِمْ)۔ آئینِ حیات (مَا بِاَنْفُسِہِمْ) نفسیاتی کیفیات (مَا بِاَنْفُسِہِمْ) کو بدل ڈالتی ہے اور اسے قوانینِ خداوندی کے بجائے انسانوں کے خودساختہ، آئین کے تابع لے آتی ہے، تو اس تبدیلی کا فطری نتیجہ انعاماتِ الٰہیہ سے محرومی ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (۱۳/۱۱)

اللہ کبھی اس حالت کو نہیں بدلتا جو کسی گروہ کو حاصل ہوتی ہے، جب تک کہ وہ خود ہی اپنی صلاحیت نہ بدل ڈالے۔

ایمان کا مفہوم

یہی نفسیاتی کیفیت (مَا بِاَنْفُسِہِمْ) ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں ایمان کہا جاتا ہے۔ خارجی تبدیلی اس داخلی تبدیلی کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ ذہنی تصورات اور قلبی کیفیات کے بدل جانے سے باہر کی پوری دنیا بدل جاتی ہے۔ اس لئے جسے "خدا کا عذاب"[1] کہا جاتا ہے، وہ کہیں خارج سے نازل نہیں ہوتا۔ انھیں داخلی کیفیات و تصورات کے بدل جانے سے صلاحیت اور اہلیت ختم ہو جاتی ہے اور خارج کی وہ معاندانہ قوتیں جو اس سے پیشتر ان کی داخلی صلاحیت و قوت سے دبی ہوئی تھیں اُبھر کر سامنے آجاتی ہیں اور غلبہ پالیتی ہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک قوم اپنے اندر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیتیں رکھے اور وہ ہلاک کر دی جائے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ○ (۱۱/۱۱۷)

(اور دیاد رکھو) ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ تمہارا پروردگار آبادیوں کو ناحق ہلاک کر دے اور اس کے باشندے سنوارنے والے ہوں!

ہلاکت کیسے ہوتی ہے

ہلاکت تو ہوتی ہی اس وقت ہے جب وہ قوم سلامتی کی راہ کو چھوڑ کر غیر خداوندی راہیں (فسق) اختیار کر لیتی ہے۔

فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (۴۶/۳۵)

تو کیا غیر خداوندی راہیں اختیار کرنے والی قوم کے سوا کوئی اور بھی ہلاک کئے جا سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں

---

[1] اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات یہ عذاب حوادث ارضی و سماوی کی شکل میں بھی آتا ہے، مثلاً سیلاب۔ زلزلہ۔ کوہ آتش فشاں کی ہلاکت لیکن اس کی وجہ جسے نور میں (عنوان حضرت نوحؑ میں) بیان کی جا چکی ہے۔ وہاں دیکھ لیجئے۔ یہ ضروری ہے۔

اس حقیقت کو اچھی طرح یاد رکھئے کہ اس کارگہ سعی و عمل میں جو زندہ رہتا ہے، دلیل و برہان کے ماتحت زندہ رہتا ہے جو ہلاک ہوتا ہے وہ بھی قاعدہ اور قانون کے ماتحت ہلاک ہوتا ہے۔

لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ط وَ اِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ (۴۲)

اس لئے کہ جسے ہلاک ہونا ہے، اتمام حجت کے بعد ہلاک ہو، اور جو زندہ رہنے والا ہے، اتمام حجت کے بعد زندہ رہے، بلاشبہ اللہ سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے!

نہ یونہی (بلا ایمان اور سعی و عمل) سرفرازیاں حاصل ہوتی ہیں نہ (معاذ اللہ) اندھا دھند نکبت و زوال کا رسوا کن عذاب نازل ہو جاتا ہے۔ یہ نظام کائنات، عدل و انصاف پر چل رہا ہے۔ ظلم و جور پر نہیں چل رہا۔

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○ (۹/۷۰)

اور ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ اللہ ان پر ظلم کرتا، مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔

سورۂ ہود میں اس اصول کی تشریح ان الفاظ میں آئی ہے:۔

وَ اُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ○ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِيْدٌ ○ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ○ (۱۱/۹۹-۱۰۱)

اور اس دنیا میں بھی محرومی ان کے پیچھے لگی اور قیامت میں بھی (کہ عذاب آخرت کے مستحق ہوئے) تو دیکھو کیا ہی بُرا صلہ ہے جو ان کے حصے میں آیا۔

(اے پیغمبر!) یہ پچھلی آبادیوں کی خبروں میں سے کچھ کا بیان ہے جو ہم تجھ کو سنا رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو اس وقت تک قائم ہیں۔ کچھ بالکل اجڑ گئیں۔ اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ بلکہ خود انھوں نے ہی اپنے اوپر ظلم کیا۔ تو دیکھ، جب تیرے پروردگار کی (ٹھہرائی ہوئی بات) آ پہنچی، تو ان کے وہ معبود کچھ بھی کام نہ آئے جنھیں اللہ کے سوا پکارا کرتے تھے۔ انھوں نے کچھ فائدہ نہ پہنچایا۔ بجز اس کے کہ ہلاکی کا باعث ہوئے!

ہلاکت اور تباہی ہمیشہ اپنے کاموں کی وجہ سے ہوتی ہے۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ يَعْفُوْا عَنْ

کٹیرہ (۲۲)

اور (یاد رکھو) جو کچھ مصیبت تمھیں پہنچتی ہے وہ خود تمھارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوئی ہوتی ہے۔ اور بہت سی باتوں کو تو خدا معاف کر دیتا ہے۔

اگر قوم نوح غرق ہوئی تھی تو اپنی ہی خطاؤں کے باعث۔

مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا (۲۵)

(دیکھو) وہ خود اپنی ہی خطاؤں کے باعث غرق کئے گئے۔

اور اگر قوم ثمود تباہ ہوئی تھی تو اپنے ہی جرائم کی وجہ سے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا (۹۱/۱۴)

پھر انھوں نے اللہ کے رسول کو جھٹلایا۔ چنانچہ ناقہ کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ پس ان کے پروردگار نے ان کو ملیامیٹ کر دیا اور (زمین کے) برابر کر ڈالا۔

وقس علی ہذا۔ ورنہ اگر کوئی قوم صحیح راہوں پر چلتی جائے تو اللہ کو کیا پڑی ہے کہ انھیں خواہ مخواہ تباہ و برباد کردے۔ یہ اس کے قانون عدل و انصاف کے خلاف ہے۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا (۴/۱۴۷)

(لوگو!) اگر تم شکر کرو (یعنی خدا کی نعمتوں کی قدر کرو اور انھیں ٹھیک ٹھیک کام میں لاؤ) اور خدا پر ایمان رکھو، تو خدا کو تمھیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے؟ (یعنی وہ کیوں خواہ مخواہ تمھیں عذاب دے؟) خدا تو (انسانی اعمال کا) قدرشناس اور (ان کی حالت کا) علم رکھنے والا ہے۔

ہلاکت و بربادی تو آتی ہی اس وقت ہے جب کوئی قوم قوانین الٰہیہ سے منہ موڑ کر اپنے آپ کو اللہ کی حفاظت و صیانت سے باہر لے جاتی ہے اور پھر دنیا میں کوئی ایسی قوت نہیں ہوتی جو ان کی پشت و پناہ بن سکے۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا

ﷺ معاف کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ کوئی صحیح عمل اس طرح کیا جائے کہ اس کے اچھے اثرات، مضر اثرات پر غالب آجائیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ٥ (۴۷/۱۱)

کیا وہ لوگ زمین میں گھومے پھرے نہیں کہ (اچھی طرح نگاہِ عبرت سے) دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں کیسا (دردناک) انجام رہا ہے۔ خدا نے انھیں تباہ و برباد کر ڈالا۔ اور (یاد رکھو ان) انکار کرنے والوں کے لئے بھی ان ہی جیسا (انجام) ہونا ہے۔ یہ محض اسی لئے ہے کہ خدا (صرف) اُن کا حامی و ناصر ہے جو ایمان لے آئے ہیں اور ان انکار کرنے والوں کا کوئی بھی حامی و ناصر نہیں ہے۔

خدا کے علاوہ کوئی اور نہیں جو ہلاکت سے بچا سکے۔ خواہ عقیدت و عظمت کی کتنی ہی نسبتیں ان کی طرف کیوں نہ کر دی جائیں۔ سورۂ احقاف میں ہے۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَ صَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ٥ فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ۭ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَ ذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ٥ (۴۶/۲۷-۲۸)

اور (دیکھو، اے مخاطبین دعوت ایمانی!) جو جو آبادیاں تمہارے اردگرد تھیں سب ہم نے برباد کر ڈالیں (ان کو دیکھ کر عبرت حاصل کرو) اور ہم نے (اُن برباد شدہ آبادکاروں پر) اپنی نشانیوں کو بار بار دُہرایا ہے کہ شاید وہ حق کی طرف لوٹ آئیں (مگر وہ باز نہ آئے اور بالآخر اپنی مکافات عمل کو پہنچے)۔ تو (اے مخاطبین! غور کرو کہ) ان معبودوں نے ان کی کیوں امداد نہ کی جنہیں انہوں نے خدا کے سوا خدائی تقرب کے لئے گڑھ رکھا تھا (وہ ان کی امداد تو کیا کرتے) بلکہ ان سے کھوئے گئے۔ اور یہ سب کچھ ان کا ایک جھوٹ تھا اور وہ باتیں تھیں جن کو وہ (بلا دلیل) افتراء کیا کرتے تھے۔

فرقہ بندی سب سے بڑا عذاب

اعمال کی یہ سزا مختلف انداز میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ عبرت انگیز صورت یہ ہوتی ہے کہ قوم فرقوں میں بٹ جائے اور باہمی سر پھٹول میں مصروف رہے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ

اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ○ (۶/۶۵)

(اے پیغمبر!) کہہ دو۔ وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے کوئی عذاب بھیجدے، یا تمہارے پیروں تلے سے کوئی عذاب پیدا کردے۔ یا ایسا کرے کہ تم گروہ گروہ ہوکر آپس میں لڑ پڑو، اور ایک (گروہ) دوسرے (گروہ) کی شدت کا مزہ چکھے۔ سو دیکھو! کس طرح ہم گوناگوں طریقوں سے آیتیں بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں بوجھیں!

یہ تشیع و تحزب۔ یہ فرقہ پرستی اور گروہ سازی شیطان کا سب سے بڑا حربہ ہے جو قوموں کی ہلاکت کا باعث بنتا ہے۔

وَ قُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ○ (۱۷/۵۳)

اور (اے پیغمبر!) میرے بندوں سے کہہ دو (یعنی ان سے جو دعوت حق پر ایمان لائے ہیں کہ) جو بات کہو، ایسی کہو کہ خوبی کی بات ہو۔ شیطان لوگوں کے درمیان فساد ڈالتا ہے۔ یقیناً شیطان انسان کا صریح دشمن ہے۔

لیکن عذاب کی صورت کوئی ہو، نتیجہ بہرحال ذلت و رسوائی ہوتا ہے۔ ایسی قوم سے اللہ کی نعمتیں ایک ایک کرکے چھین لی جاتی ہیں۔

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ○ (۱۴/۷)

اور کیا وہ وقت بھول گئے جب تمہارے پروردگار نے (اپنے اس قانون کا) اعلان کیا تھا: اگر تم نے شکر کیا، تو میں تمہیں اور زیادہ نعمتیں بخشوں گا، اور اگر ناشکری کی، تو پھر یاد رکھو، میرا عذاب بھی بڑا سخت عذاب ہے۔

محکومی اور تعطل کی لعنت ان پر مستولی ہوجاتی ہے (ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ) اور یہ تبدیلی اس طرح آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر بتدریج رونما ہوتی ہے کہ اس کا احساس تک بھی نہیں ہوتا کہ وہ نسیاً بدل کیسے گئی۔

فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ۭ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (۶۸/۴۴)

پس (اے پیغمبر اسلام!) مجھے اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس بات (یعنی آیات قرآنی) کو جھٹلاتے ہیں (ہم ان سے خود نپٹ لیں گے) ہم انھیں آہستہ آہستہ ایسی جگہ سے کسیں گے جس کے متعلق وہ (کچھ بھی) نہیں جانتے!

غیر محسوس انقلاب

کسی درخت کے پاس عمر بھر کھڑے رہیئے اس طرح بیج پھوٹنے سے پھل لانے تک کے تمام مراحل آپ کی آنکھوں کے سامنے طے پائیں۔ لیکن آپ کبھی محسوس نہ کر سکیں گے کہ یہ تبدیلیاں ہو کیسے رہی ہیں اور ایک حالت سے دوسری حالت کب بدلتی ہے۔ آہستہ آہستہ۔ بتدریج۔ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ (۱۶/۴۵) ان راہوں سے جن کا تمھیں شعور تک نہ ہو، بیج، پھل کی صورت اور عمل، نتیجہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب اس سطوت و حکومت کی مالک قوم کی جگہ ایک دوسری قوم لے لیتی ہے۔ یوں دبے پاؤں۔ چپکے چپکے۔ جیسے سینۂ صحرا سے مہتاب کی چادر لپٹتی اور اس کی جگہ اندھیرے کی چادر بچھتی چلی جائے۔ کس قدر المناک ہے یہ کیفیت اور کیسی عبرت انگیز یہ تبدیلی!

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ إِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ۚ أَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ إِلَّا قَلِيْلٌ ○ إِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (۹/۳۸-۳۹)

مسلمانو! تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے۔ کہ اللہ کی راہ میں قدم اٹھاؤ، تو تمھارے پاؤں بوجھل ہو کر زمین پکڑ لیتے ہیں! کیا آخرت چھوڑ کر صرف دنیا کی زندگی ہی پر ریجھ گئے ہو؟ (اگر ایسا ہی ہے تو یاد رکھو) دنیا کی زندگی کی متاع تو آخرت کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے مگر بہت تھوڑی!۔ اگر قدم نہ اٹھاؤ گے، تو یاد رکھو، وہ تمھیں ایک ایسے عذاب میں ڈالے گا جو دردناک ہوگا اور تمھاری جگہ کسی دوسرے گروہ کو لا کھڑا کرے گا، اور تم (دفاع سے غافل ہو کر) اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گے (اپنا ہی نقصان کرو گے) اور اللہ تو ہر بات پر قادر ہے۔

ایک کی جگہ دوسری قوم

یہ نہیں کہ اندھیرے کی جگہ اندھیرا آجائے۔ یعنی جو نئی قوم مٹنے والی قوم کی جگہ لے وہ بھی انہی جیسی خصوصیات کی مالک ہو۔ اگر ایسا ہو تو پھر یہ تبدیلی ہی کیوں ہو؟ وہ مٹے ہی کیوں اور یہ بڑھے کیسے؟ مٹتی تو وہ ہے جس میں زندہ رہنے کی

صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ آگے وہ بڑھتی ہے جس میں حرکت اور حرارت کے چشمے ابلتے ہیں۔ اس لئے یہ آنے والی قوم۔ جانے والی قوم کے مثل نہیں ہوتی۔

هَآاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ؀ (۴۷/۳۸)

دیکھو، تم ہی تو وہ لوگ ہو جن کو دعوت دی جا رہی ہے کہ اپنی دولت کو اللہ کی راہ میں کھلا رکھو۔ (مگر) تم میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بخل کرتے ہیں۔ اور (یاد رکھو) جو بخل کرتا ہے وہ خود اپنی جان کے خلاف بخل کرتا ہے (کیونکہ خدا کی راہ میں جو روپیہ خرچ کیا جاتا ہے وہ در اصل تمہارے ہی اجتماعی مصالح پر خرچ ہوتا ہے) اور اللہ تو (تمہارے اس روپیہ سے) بے نیاز ہے اور (در اصل، تم خود ہی اس کے) محتاج ہو۔ (یاد رکھو! اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) اگر تم منہ موڑ لوگے تو تمہاری جگہ خدا کوئی دوسری قوم لے آئے گا۔ پھر وہ تمہارے جیسے نہیں ہوں گے!

مشارق و مغارب اس پر شاہد ہوتے ہیں کہ وہ ان سے بہتر ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۙ عَلٰٓي اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ؀ (۷۰/۴۰-۴۱)

پس (اس حقیقتِ کبریٰ پر) مشارق و مغارب کا پروردگار شاہد ہے کہ ہم یقیناً اس پر قادر ہیں کہ ان سے بہتر (اقوام) کو ان کی بجائے بدل کر لے آئیں، اور ہم عاجز کئے ہوئے نہیں ہیں!

یہ قوم صالح بڑھتی پھیلتی جاتی ہے۔ اور اس غیر صالح قوم پر چاروں طرف سے زمین تنگ ہوتی جاتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ پورے طور پر مغلوب و محکوم ہو جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ اور بتدریج۔ اس لئے کہ قوموں کی زندگیاں صبح اور شام کے پیمانوں سے نہیں ناپی جاتیں۔ ان کے بننے اور بگڑنے کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ؀ (۲۲/۴۷)

اور (اے پیغمبر!) یہ لوگ تجھ سے عذاب کے مطالبہ میں جلدی مچا رہے ہیں (یعنی کہتے ہیں، کہ اگر سچ مچ کو عذاب آنے والا ہے تو کیوں نہیں آ چکتا؟) اور اللہ کبھی ایسا کرنے والا نہیں کہ اپنا وعدہ پورا نہ کرے مگر تیرے پروردگار کے یہاں ایک دن کی مقدار ایسی ہے جیسے تم لوگوں کی گنتی میں ایک ہزار برس۔

ظہورِ نتائج کا وقت

لیکن صدیاں ہوں یا الوف، جب اعمال کے ظہورِ نتائج کا وقت آجاتا ہے تو پھر ایک ثانیہ بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ○ (۱۰/۴۸-۴۹)

اور یہ لوگ کہتے ہیں "اگر تم سچے ہو تو بتلاؤ، یہ بات (یعنی انکارِ حق کی پاداش) کب ظہور میں آئے گی؟"

(اے پیغمبر!) تم کہدو (یہ معاملہ کچھ میرے اختیار میں نہیں کہ بتلا دوں، کب واقع ہوگا) میں تو خود اپنی جان کا بھی نفع نقصان اپنے قبضہ میں نہیں رکھتا۔ وہی ہوتا ہے جو اللہ نے چاہا ہے۔ ہر امت کے لئے (پاداشِ عمل کا) ایک مقررہ وقت ہے، اور جب وہ وقت آپہنچتا ہے، تو پھر نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں، نہ ایک گھڑی آگے۔

اُس وقت تقدیم و تاخیر کسی کے بس میں نہیں ہوتی۔ مٹنے والی قوم اپنے وقت پر مٹ کر رہتی ہے۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ○ (۲۳/۴۳)

کوئی قوم اپنے مقررہ وقت سے نہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔

اس لئے کہ یہ سب کچھ ایک مقررہ قاعدہ اور قانون کے ماتحت ہوتا ہے۔

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ○ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ○ (۱۵/۴-۵)

ہم نے کبھی کسی بستی کے باشندوں کو ہلاک نہیں کیا۔ مگر اسی طرح کہ اس کے لئے ایک ٹھہرائی بات تھی (یعنی ایک مقررہ قانون تھا کہ جب کوئی حالت اس طرح کی ہوگی، اور اس مقدار میں ہوگی، تو ایسا نتیجہ ضرور نکلے گا) کوئی امت نہ تو اپنے وقت سے آگے بڑھ سکتی ہے، نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔

اس "وقتِ معین" کے معنی یہ نہیں کہ ان کی "تقدیر" میں پہلے ہی سے یہ لکھا ہوتا ہے کہ انھوں نے فلاں وقت پر تباہ ہو جانا ہے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ ہر عمل کے ظہور کا ایک وقت ہوتا ہے۔ جیسے بیج سے کھیتی پکنے تک کی مدت معین ہوتی ہے۔ جب اعمال کے نتائج ظاہر ہونے کا وقت آجاتا ہے، تو پھر اس میں ایک ثانیہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ یہ وقت اُس قوم کی ہلاکت کا ہوتا ہے۔ اسی کو "آنے والی گھڑی" کہتے

ہیں۔ جو قوم اس آنے والی گھڑی کو جھٹلاتی ہے اور اپنے آپ کو فریب دے کر سمجھ لیتی ہے کہ ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا وہ سب سے زیادہ بدبخت ہے۔

فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ یَّوْمِهِمُ الَّذِیْ یُوْعَدُوْنَ ۝ (۵۱/۶۰)

تو افسوس ہے ان لوگوں پر جو اپنے اس (ظہور نتائج اعمال کے) دن سے انکار کردیں جس سے وہ ڈرائے جارہے ہوں۔

ظہور نتائج کی ساعت (آنے والی گھڑی) آکر رہتی ہے۔ اس وقت قوموں کی موت و حیات کے فیصلے ہوجاتے ہیں سورۂ جاثیہ کے آخری رکوع کو دیکھئے۔ اس حقیقت عظمیٰ کو کس قدر واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یَوْمَئِذٍ یَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ (۴۵/۲۷)

اور (دیکھو) آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے۔ اور (یاد رکھو) جس دن الساعت[1] قائم ہوگی اس روز یہ بیہودہ باتیں کرنے والے خسارہ اٹھا کر رہیں گے۔

جب ہر قوم کے "مقدرات" کے فیصلے ان کے اعمال کے مطابق کئے جائیں گے۔

وَ تَرٰی كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِیَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤی اِلٰی كِتٰبِهَا ؕ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ هٰذَا كِتٰبُنَا یَنْطِقُ عَلَیْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۴۵/۲۸-۲۹)

اور (اے پیغمبر!) تم ہر قوم کو سرنگوں (و شرمسار) دیکھو گے، ہر قوم اپنی کتاب (نامۂ اعمال) کی طرف بلائی جائے گی (اور ان سے کہا جائے گا "ہوشیار ہوجاؤ) آج تمہیں ان تمام اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے۔ یہ ہماری کتاب سچائی کے ساتھ تمہارے خلاف بول رہی ہے جو کچھ تم کیا کرتے تھے ہم سب کچھ لکھ لیا کرتے تھے

جنہوں نے اپنے اعمال سے اپنے اندر شادکامی و کامرانی کی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا کرلی ہوگی۔ وہ کھلی ہوئی کامیابی سے بہرہ اندوز ہوں گے

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِیْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِیْنُ ۝ (۴۵/۳۰)

---

[1] الساعۃ کے معنی انقلاب کی گھڑی ہیں خواہ وہ اس زندگی میں ہو یا آخرت میں۔

لیکن جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور نیک کام کئے ہوں گے ان کا پروردگار انہیں اپنی رحمت میں داخل کر لے گا۔ اور یہی (درحقیقت) کھلی کامیابی ہے۔

لیکن جنہوں نے قوانین الٰہیہ سے سرکشی برتی ہو گی وہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے

وَ اَمَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَفَلَمْ تَکُنْ اٰیٰتِیْ تُتْلٰی عَلَیْکُمْ فَاسْتَکْبَرْتُمْ وَ کُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ ○ (۴۵/۳۱)

اور (یاد رکھو) جن لوگوں نے انکار کی راہ اختیار کی (ان سے پوچھا جائے گا) "کیا تمہارے سامنے میرے قوانین پیش نہیں کئے جاتے تھے؟ (ضرور کئے جاتے تھے، مگر) پھر تم نے تکبر کیا (اور غرور کی وجہ سے انہیں قبول نہیں کر سکے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ) تم تھے ہی مجرم قوم (کے افراد)

وہ لوگ کہ

وَ اِذَا قِیْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ السَّاعَةُ لَا رَیْبَ فِیْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِیْ مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ ○ (۴۵/۳۲)

اور جب تم سے (اے جماعت منکرین!) کہا گیا کہ "(دیکھو) خدا کا وعدہ (قطعی) سچا ہے اور الساعۃ میں کوئی شک و شبہ (کی گنجائش) نہیں ہے" تو تم نے (جواب میں) کہا "ہم نہیں جانتے الساعۃ کیا ہوتی ہے ہم بعض ایک خیال کے درجہ میں اس کا تصور کر سکتے ہیں (لیکن) ہم اس پر (کسی طرح بھی) یقین لانے والے نہیں ہیں"

لیکن اُس وقت ان کے اعمال کے نتائج محسوس و مشہود پیکروں میں ان کے سامنے ہوں گے۔ ہجوم بلا کی طرح انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے۔

وَ بَدَا لَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ○ (۴۵/۳۳)

اور ان کے اعمال کی برائیاں (یعنی ان کے نتائج) ان پر ظاہر ہو چکے ہوں گے اور جن باتوں کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہی باتیں ان پر چھا چکی ہوں گی۔

جب فیصلہ کی گھڑی آپہنچتی ہے تو اس وقت بے بسی اور بے چارگی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ سیلاب کو دیکھتے ہیں کہ اُمنڈے چلا آرہا ہے لیکن اسے روکنے کی طاقت نہیں۔ مدد کے لئے چلاتے ہیں لیکن کوئی مددگار نہیں۔

فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَ هُمْ یَنْظُرُوْنَ ○ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِیَامٍ وَّ مَا كَانُوْا مُنْتَصِرِیْنَ ○ (۵۱/۴۴-۴۵)

تو (دیکھو) انہوں نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی، بالآخر کڑک نے (انہیں آپکڑا) اور وہ

دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ پھر نہ تو وہ اٹھ کر کھڑے ہی ہو سکے اور نہ ہی اپنی مدافعت کر سکے۔

بے بسی ہی نہیں بلکہ بدبختی۔ ایسی بدبختی کہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں سے اجاڑتے ہیں تاکہ بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہو جائیں۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۝ (۵۹/۲)

خدا ہی وہ ذات ہے جس نے اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو جنھوں نے انکار کی راہ اختیار کی تھی پہلی جلاوطنی کے وقت انھیں ان کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ (اے جماعت مومنین!) تم خیال بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ (یوں) نکل جائیں گے۔ اور وہ خود بھی سمجھے بیٹھے تھے کہ (خدا کی گرفت سے) انھیں ان کے قلعے بچا لیں گے۔ پھر (دیکھو) خدا (کا عذاب) ایسی جگہ سے ان پر آیا جہاں سے انہیں سان گمان بھی نہیں تھا، اور اُن کے دلوں میں (ایسا) رعب ڈال دیا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے اپنے ہی گھروں کو برباد کرنے لگے۔ تو اے نگاہوں والو! (اس دردناک واقعہ سے کچھ تو) عبرت و نصیحت حاصل کرو۔

اس طرح یہ حکومت و سطوت اور شوکت و ثروت کی مالک قوم ذلت و خواری کے عذاب میں مبتلا ہو کر تپ دق کے مریض کی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ ہلاکت خود اپنے ہی ہاتھوں کی خریدی ہوتی ہے اس لئے اس پر کسی کی آنکھ نمناک نہیں ہوتی۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاۗءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ۝ (۴۴/۲۹)

چنانچہ نہ تو ان (کے اس دردناک انجام) پر آسمان و زمین (کی آنکھ) روئی اور نہ ہی انھیں (کوئی) مہلت نصیب ہوئی۔

اور جب کوئی قوم اس طرح تباہ ہو جاتی ہے تو پھر دوبارہ نہیں اُبھر سکتی۔

وَحَرٰمٌ عَلٰي قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (۲۱/۹۵)

اور اس آبادی کے لئے جسے ہم نے تباہ کر دیا ہو یہ حتمی فیصلہ ہے کہ وہ (دوبارہ) نہیں لوٹیں گے (یعنی حیات تازہ حاصل نہیں کر سکیں گے)۔

ہلاکت کے معنی آگے بڑھنے سے پیشتر ایک نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن کریم میں قوموں کی تباہی و بربادی کے لئے ہلاکت اور ان کی سرفرازی و کامرانی کے لئے حیات کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ہلاکت کے یہ معنی نہیں کہ وہ قوم طبیعی طور پر (Physically) اس دنیا سے مٹ جاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قوم کی قوم صفحۂ ارض سے مٹ جائے۔ لیکن ہلاکت کے معنی بہت وسیع ہیں۔ قرآن کریم کی رُو سے قوموں کی ہلاکت کے یہ معنی ہیں کہ وہ حکومت و سطوت عزت اور اقبال کی بلندیوں سے گر کر نکبت اور زوال کے جہنم میں جا گرتی ہیں۔ اس قوم کے افراد جیتے ہیں۔ سانس لیتے ہیں۔ چلتے پھرتے ہیں۔ لیکن ان کی حیات اجتماعیہ (ملی زندگی) مٹ چکی ہوتی ہے۔ خواہ تعداد کے اعتبار سے وہ کروڑوں ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ ہے قوموں کی ہلاکت۔ سو جہاں جہاں قوموں کی ہلاکت کا ذکر آئے۔ اس مفہوم کو ہمیشہ سامنے رکھئے۔ اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس آئینے میں آپ کو اپنے متعلق کیا دکھائی دیتا ہے۔

جرائم کی فہرست یہ جرائم جن کا لازمی نتیجہ ہلاکت اور تباہی تھا، کیا تھے؟ یوں تو ان کی فہرست بڑی لمبی چوڑی مرتب ہو سکتی ہے۔ لیکن جس طرح نیکی سے مراد قانونِ خداوندی کی اطاعت ہے، اسی طرح برائی سے مفہوم اس قانون کی خلاف ورزی ہے۔ اس لئے ان جرائم کی نوعیتیں کتنی ہی مختلف ہوں، حقیقت سب جگہ ایک ہی تھی۔ یعنی قوانینِ الٰہیہ سے روگردانی۔ کفر۔ شرک۔ تکذیب۔ گناہ۔ جُرم۔ ظلم۔ فسق۔ فساد۔ سب اسی شجرۂ ملعونہ کی شاخیں ہیں (ان کا باریک فرق اپنے اپنے مقام پر آئے گا) سورۂ تغابن میں ہے۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ز فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ز فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ (۶۴/۵-۶)

(اے افرادِ نسلِ انسانی!) کیا تمہارے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو (اب سے) پہلے (ربّانی اور صداقت کا) انکار کر چکے ہیں۔ کہ انھوں نے (کس طرح) اپنے کاموں کا وبال چکھا اور یہ کہ ان کے لئے بڑا ہی دردناک عذاب ہے۔ یہ (سب کچھ) محض اس وجہ سے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیوں کے ساتھ آتے رہے (اور وہ ہر ایک کا انکار کرتے اور ایک ایک کو جھٹلاتے رہے) چنانچہ کہنے لگے "کیا (اب) انسان ہماری رہنمائی کیا کریں گے!" پس انھوں نے انکار کیا

اور (صداقت سے) روگردانی کرنے لگے۔ تو اس سے اللہ کا کچھ نہ بگڑا۔ اور اللہ تو (پہلے ہی) بے نیاز اور تمام محامد کا مستحق ہے۔

کفر یعنی اس حقیقت کے تسلیم کرنے سے انکار کہ صحیح روش زندگی قوانین خداوندی کی اتباع ہے، یہ ہے کفر۔ اور اس کا مآل تباہی۔ اس انکار سے سرکشی اور روگردانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَ رُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ○ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَ كَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ○ (۶۵ / ۹)

اور (اے افرادِ نسلِ انسانی!) کتنی ہی آبادیاں ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار اور اپنے رسولوں کے احکام سے سرکشی اختیار کی تو (دیکھو) ہم نے (بھی) ان سے سخت حساب لیا۔ اور انھیں بڑا ہی سخت عذاب دیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے کاموں کا وبال چکھ لیا اور ان کے کاموں کا انجام خسارہ ہی خسارہ ہے۔

تکذیب کفر ہی کا دوسرا نام تکذیب ہے (تفصیل سابقہ عنوان میں گذر چکی ہے) اور اس کا انجام ہلاکت۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّ جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ○ (۲۳ / ۴۴)

پھر ہم نے لگاتار یکے بعد دیگرے اپنے رسول بھیجے۔ لیکن جب کبھی کسی قوم میں اس کا رسول ظاہر ہوا، فوراً وہ جھٹلانے پر آمادہ ہو گئی۔ پس ہم بھی ایک کے بعد ایک کرکے انھیں ہلاک کرتے گئے، اور ان کی ہستیاں (روایت کا) افسانہ بن گئیں۔ تو ان کے لئے محرومی و نامرادی ہو جو آیات حق پر یقین نہیں کرتے۔

---

[1] یاد رکھئے۔ دین میں خواہ مخواہ کی پیچیدگیاں پیدا کرنے سے بھی رفتہ رفتہ کفر (یعنی حقیقت سے انکار) کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ (۵ / ۱۰۲)

(دیکھو) تم سے پہلے ایک گروہ (یعنی بنی اسرائیل) نے ایسی ہی باتیں (کرید کرید کر) پوچھی تھیں، پھر نتیجہ یہ نکلا کہ (سرکشی سے احکام الٰہی کے) منکر ہو گئے

تفصیل اس اجمال کی اپنے مقام پر آئے گی۔

توانین خداوندی بالکل کھلے کھلے اور واضح انداز میں آتے تھے۔ لیکن یہ لوگ پھر بھی ان کی تکذیب کرتے تھے۔

وَ اِنْ یُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ وَ بِالزُّبُرِ وَ بِالْكِتٰبِ الْمُنِیْرِ ۝ ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَكَیْفَ كَانَ نَكِیْرِ ۝ (۳۵/۲۵—۲۶)

اور (اے پیغمبرِ اسلام!) اگر یہ لوگ تمھیں جھٹلا رہے ہیں، تو (یہ کوئی نئی بات نہیں ہے) ان سے پہلے جو لوگ ہو چکے ہیں وہ بھی (اپنے رسولوں کو) جھٹلا چکے ہیں۔ ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل صحائف اور روشن کتاب کے ساتھ آئے (مگر وہ لوگ برابر انکار ہی کرتے رہے) بالآخر میں نے ان لوگوں کو پکڑ لیا جنھوں نے انکار کی روش اختیار کی تھی۔ پھر (دیکھ لو ان کی اس روش کے متعلق) میری ناپسندیدگی کیسی رہی!

تکذیب اس لئے کہ یہ جدید مسلک ان کی اس روش کے خلاف تھا جو ان کے آباؤ اجداد سے متوارث چلی آرہی تھی۔

بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ ۝ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ ۝ وَ عَجِبُوْا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ؗ وَ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝ وَ انْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَ اصْبِرُوْا عَلٰۤی اٰلِهَتِكُمْ ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۝ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚۖ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝ (۳۸/۲—۷)

(نہیں) بلکہ جن لوگوں نے انکار کی راہ اختیار کی ہے وہ خود فریبی اور اختلاف میں مبتلا ہیں۔ (خیال تو کرو) ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی نسلیں تباہ کر دی ہیں (جب ہماری گرفت کا وقت آپہنچا) تو وہ چیخنے لگے حالانکہ (اب) چھٹکارا نصیب ہونے کا وقت گزر چکا تھا۔ اور (دیکھو) انھوں نے (بھی) اس پر تعجب کیا تھا کہ ان کے پاس (کیوں) انہی میں سے (نتائجِ انکار و بدعملی سے) ڈرانے والا آگیا۔ اور صرف تعجب ہی نہیں (بلکہ) انکار کرنے والوں نے تو یہاں تک جسارت کی کہ کہہ دیا "یہ تو ساحر اور بہت ہی جھوٹا آدمی ہے، کیا (خوب!) کہ) اس نے سب معبودوں کو (ملا کر) ایک ہی معبود بنا ڈالا؟ بلاشبہ یہ تو بڑی ہی عجیب بات ہے۔ اور (خواص کی) ایک جماعت (وہاں سے یہ کہہ کر)

جلدی کہ چلو اور اپنے معبودوں سے چپٹے رہو (انھیں مت چھوڑ دینا۔ یقیناً یہ وہی بات ہے جس کا ارادہ کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے اس قسم کی باتیں (جو یہ رسول کہتے ہیں) کسی پچھلے دین میں نہیں سنیں (یہ لوگ تو بالکل ہی نئی نئی باتیں نکال رہے ہیں) یہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ان کی گھڑی ہوئی باتیں ہیں رہیں ان سے ہرگز دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے"

اسلاف پرستی میں ہوتا یہ ہے کہ انسان حق و باطل کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔ یعنی جس چیز کے متعلق متوارث عقیدہ چلا آتا ہے کہ وہ حق ہے اسے بلا سند و دلیل حق سمجھ لیا جاتا ہے۔ اندھی تقلید کی اس فضا میں بقول (HUME) "اعمال اس لئے مقبول نہیں ہوتے کہ وہ نیک ہیں بلکہ انھیں نیک اس لئے کہا جاتا ہے کہ انھیں مقبولیت عامہ کی سند حاصل ہے۔" اسی لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ لوگ حق کی تکذیب[1] بلا علم کرتے ہیں۔

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ○ ([illegible])

نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جس بات پر یہ اپنے علم سے احاطہ نہ کر سکے، اور جس بات کا نتیجہ ابھی پیش نہیں آیا اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے۔ ٹھیک اسی طرح ان لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔ تو دیکھو، ظلم کرنے والوں کا کیسا کچھ انجام ہو چکا ہے۔

تکذیب اور اس کے ساتھ استہزاء۔ یعنی مخالفت میں بدترین دنائت کا مظاہرہ۔

استہزاء

وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ○ فَأَهْلَكْنَا أَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَمَضَىٰ مَثَلُ الْأَوَّلِينَ ○ ([illegible])

اور (دیکھو) اُن کے پاس کوئی نبی نہیں آتا تھا مگر یہ کہ وہ لوگ اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ (نتیجہ وہی ہوا یعنی ہلاکت) چنانچہ انھیں تو کیا، ہم نے تو) ان سے زیادہ قوت و سطوت والوں تک کو برباد کر ڈالا ہے۔ اور پہلے لوگوں کی مثال گذر چکی ہے (جو عبرت حاصل کرنے کے لئے کافی ہے)

قوانین الٰہیہ سے انکار اور تکذیب اور ان کی جگہ انسانوں کے خودساختہ قوانین کی ترویج و تنفیذ کا لازمی نتیجہ ظلم تھا۔ نتیجہ کیا؟ انسانوں کا خودساختہ نظام بذاتِ خود ظلم اور فساد ہے جس کا نتیجہ ہے ہلاکت۔

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ ○ فَلَمَّا أَحَسُّوا بَأْسَنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُونَ ○

---

[1] تکذیب کے سلسلہ میں حسب ذیل آیات بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ۳۹/۲۵ ؛ ۵-۴/۲ ؛ ۵/۱۲ ؛ ۱۱-۱/۲۶ ؛ ۹/۲

وَ تَرْكُضُوْا وَ ارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَ مَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ○ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ○ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ○ (۲۱/۱۵)

اور کتنی ہی بستیاں جو ظلم و شرارت میں غرق تھیں ہم نے پامال کر ڈالیں، اور ان کے بعد دوسرے گروہوں کو اٹھا کھڑا کیا! جب ہمارا عذاب انھوں نے محسوس کیا تو دیکھو، اچانک بستیوں سے بھاگے جا رہے ہیں!

اب بھاگتے کہاں ہو؟ اپنے اُسی عیش و عشرت میں لوٹو (جس نے تمھیں اس قدر سرشار کر رکھا تھا) اور اپنی مکانوں میں (جن کی مضبوطی کا تمھیں غرّہ تھا) وہاں تم سے پوچھا جائے گا کہ تمھیں اس عیش و عشرت کا کیا حق حاصل تھا؟ —

بستیوں کے باشندوں نے پکارا۔ "افسوس ہم پر! بلاشبہ ہم ظلم کرنے والے تھے!" تو (دیکھو) وہ برابر یہی پکارا کئے یہاں تک کہ ہم نے (انھیں ہلاک) کر دیا۔ کٹے ہوئے کھیت کی طرح۔ بجھے ہوئے انگاروں کی طرح!

ظلم و سرکشی

ظلم اور سرکشی

وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَ اَطْغٰى ○ وَ الْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ○ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ○ (۵۳/۵۲-۵۴)

اور (کیا انھیں معلوم نہیں کہ) قوم نوح کو بھی اب سے (بہت) پہلے خدا ہی نے تباہ کیا تھا؟ بلاشبہ وہ تو بہت ہی زیادہ ظالم اور بہت ہی سرکش لوگ تھے۔ اور (پھر) اوندھی کی ہوئی بستیوں کو (ایک تنکے کی طرح) اٹھا کر پھینکدیا، اور (اتنا ہی نہیں) پھر ان پر جو کچھ مسلّط ہوا سو مسلّط ہوا (اُس کا علم تو خدا ہی کو ہے۔)

اور ظلم اور سرکشی پیدا اس وقت ہوتی ہے جب سامان معیشت کی فراوانی ہو۔

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ؕ وَ كُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ○ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَ مَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ○ (۲۸/۵۸-۵۹)

اور (اے غور تو کرو) ہم نے کس قدر بستیاں برباد کر دی ہیں (جن کی آبادیاں) اپنی (سامان معیشت) کی

فراوانی پر اترایا کرتی تھیں - چنانچہ یہ ہیں ان کے مکانات جو بجز تھوڑے سے مکانات کے ان کے بعد سے (آج تک) آباد ہی نہیں ہو سکے - اور (بالآخر) ہم ہی ان کے وارث ہوئے (یعنی ہمارا اقتدار ہی ان پر غالب آکر رہا) اور (اے پیغمبر اسلام!) تیرا پروردگار ان بستیوں کو اس وقت تک برباد کرنے والا نہیں تھا جب تک ان کے کسی مرکزی مقام پر کوئی رسول نہ بھیج دیتا جو ان پر ہماری آیتیں تلاوت کر دیتا (اور حجت پوری کر دیتا) - اور (یاد رکھو) ہم (یونہی) آبادیوں کو برباد کرنے والے نہیں ہیں مگر یہ کہ ان کے باشندے ہی ظالم ہوں (اور اعمال سے اس بربادی کے فیصلہ کو اپنے اوپر لازم کر لیں -)

اس سے یہ مطلب نہیں کہ مال و دولت کی فراوانی اور فارغ البالی قابلِ نفرت چیز ہیں۔ کیونکہ ان سے ظلم و سرکشی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں - مال و دولت تو خدا کی نعمتیں ہیں - اس لئے نعمت - قابلِ مذمت کس طرح ہو سکتی ہے قابلِ مذمت ہے یہ روش کہ مال و دولت اور قوت و حشمت کو قوانین الٰہیہ کے تابع نہ رکھا جائے بلکہ انھیں اپنی خواہشات کے مطابق صرف کیا جائے جس کا نتیجہ خدا فراموشی اور خود فریبی ہو - اس جذبہ کی ابتداء اس خیالِ باطل سے ہوتی ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ مجھے جو کچھ ملا ہے اپنی تدبیر و ہنر سے ملا ہے۔

وَ بَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○ فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ز ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ ؕ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ؕ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ○ (۳۹/۴۸-۵۱)

اور (دیکھو) ان کے اعمال کی برائیاں ان پر (اچھی طرح) واضح ہو جائیں گی اور جن باتوں کا وہ مذاق اڑاتے رہے تھے وہ ان پر مسلط ہو جائیں گی - جب کسی آدمی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے - پھر جب ہم اپنی طرف سے اسے کوئی نعمت عطا کرتے ہیں تو کہتا ہے "اس کے سوا اور کیا ہے، کہ مجھے اپنے علم و بصیرت کی وجہ سے یہ نعمت مل گئی ہے" (اے خود فریب انسان! یاد رکھ، ایسا نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ (بھی) ایک آزمائش ہے - لیکن اکثر آدمی اس حقیقت کو جانتے نہیں)۔ اس قسم کی ڈینگیں وہ بھی مار چکے ہیں جو ان سے پہلے ہو چکے ہیں - مگر جو کچھ وہ کرتے رہے، تھے،

انھیں کچھ بھی کام نہ آیا۔ چنانچہ ان کے اعمال کی برائیاں انھیں پہنچ کر رہیں۔ اور (اے افراد نسل انسانی! یاد رکھو) ان (موجودہ) لوگوں میں سے جو لوگ ظلم (و سرکشی) کی راہ اختیار کر رہے ہیں انھیں بھی اُن کے اعمال کی برائیاں پہنچ کر رہیں گی۔ اور وہ (کسی طرح بھی خدا، اور اس کے قوانین کو) ہرانے والے اور عاجز کر دینے والے نہیں ہیں؛

جب انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ قوت و دولت۔ حکومت و سطوت میری ہی قوت بازو کا نتیجہ ہے تو اپنی قوت و دولت پر نازاں ہو کر جور و استبداد پر اتر آتا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ○ (۶/۴۲)

اور (اے پیغمبر) یہ واقعہ ہے کہ جو امتیں تم سے پہلے گذر چکی ہیں، ہم نے ان کی طرف (اپنے رسول) بھیجے اور انھیں (اپنے مقررہ قانون کے مطابق) سختی اور محنت میں گرفتار کیا کہ عجب نہیں (بدعملیوں سے باز آجائیں، اور اللہ کے حضور) عجز و نیاز کریں۔

یہ خدا کی طرف سے پہلی تنذیر (warning) ہوتی ہے تاکہ اس سے عبرت حاصل کر لیں۔ لیکن وہ اس سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔

فَلَوْلَاۤ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (۶/۴۳)

پھر (دیکھو) ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی، تو وہ (بدعملیوں سے باز آتے اور) گڑگڑاتے؟ اس لئے کہ اُن کے دل سخت پڑ گئے تھے، اور جو کچھ بدعملیاں کر رہے تھے، انھیں شیطان نے ان کی نظروں میں خوشنما کر دکھایا تھا۔

اور جس تعلیم کی انھیں یاد دلائی جاتی ہے اُسے بھلا دیتے ہیں اور اپنی خوش حالی اور عیش پسندی میں بدمست ہو جاتے ہیں تو پھر قانونِ مکافات کی محکم گرفت آپکڑتی ہے جس سے اس قوم کی جڑیں کٹ جاتی ہیں۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَیْءٍ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ○ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (۶/۴۴-۴۵)

پھر جب ایسا ہوا کہ جو کچھ نصیحت انھیں کی گئی تھی، اُسے انھوں نے بھلا دیا، تو ہم نے (بظاہر) ان پر ہر طرح (کی خوش حالیوں) کے دروازے کھول دیئے۔ یہاں تک کہ جب اُن (کامرانیوں) پر خوشیاں منانے لگے جو (بظاہر) انھیں حاصل ہوئی تھیں، تو اچانک (مکافاتِ عمل کا قانون حرکت میں آگیا، اور) ہم نے انھیں پکڑ لیا۔ پس ناگہاں وہ ناامید ہو کر رہ گئے۔ تو (دیکھو) اس طرح اس گروہ کی جڑ کاٹ دی گئی جو ظلم کرنے والا تھا۔ اور تمام ستائشیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

سورۂ اعراف میں اسی حقیقت کو تصریفِ آیات سے یوں دہرایا گیا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ○ (۷/۹۴)

اور ہم نے جب کبھی کسی بستی میں کوئی نبی بھیجا، تو ہمیشہ ایسا کیا کہ اس کے باشندوں کو سختیوں اور نقصانوں میں مبتلا کر دیا تاکہ (سرکشی سے باز آئیں، اور) عاجزی و نیازمندی کریں۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ لوگ قوانینِ الٰہیہ پر ایمان لے آتے اور تقویٰ شعار بن جاتے تو ان پر زمین و آسمان سے برکات کے دروازے کھول دیئے جاتے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ (۷/۹۶)

اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے (جن کی سرگزشتیں بیان کی گئی ہیں) ایمان لاتے اور برائیوں سے بچتے، تو ہم آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے ضرور ان پر کھول دیتے۔ لیکن انھوں نے جھٹلایا۔ پس اس کمائی کی وجہ سے جو اُنھوں نے (اپنے اعمال کے ذریعہ) حاصل کی تھی، ہم نے اُنھیں پکڑ لیا (اور وہ مبتلائے عذاب ہوئے۔)

غور کیجئے۔ ایک رزق کی فراوانی وہ تھی جس نے خدا بھلا دیا اور ایک فراوانی یہ ہے جسے قرآن نے زمین و آسمان کی برکات قرار دیا ہے۔ لیکن یہ فراوانی ایمان و تقویٰ سے ملتی ہے۔ قوانینِ الٰہیہ کی تکذیب و انکار سے نہیں۔ تکذیب و انکار کا نتیجہ تو بہرکیف ہلاکت ہے۔ ایسی ہلاکت جس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ○
اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ○
اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ○ (۷/۹۷-۹۹)

کیا شہروں کے بسنے والوں کو اس بات سے امان مل گئی ہے کہ ہمارا عذاب (راتوں رات آ نازل ہو اور

وہ پڑے سوتے ہوں؟ یا انھیں اس بات سے امان مل گئی ہے کہ دن دھاڑے عذاب نازل ہو جائے اور وہ (بے خبر) کھیل کود میں مشغول ہوں؟ کیا انھیں خدا کی مخفی تدبیروں سے امان مل گئی ہے؟ (اور وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے خلاف کچھ ہونے والا نہیں؟) تو یاد رکھو، خدا کی مخفی تدبیروں سے بے خوف نہیں ہوسکتے، مگر وہی، جو تباہ ہونے والے ہیں!

سورۂ اعراف کی تین اگلی سورتوں پر بھی ساتھ کے ساتھ ہی غور کرتے جائیے کہ ان میں بھی اسی حقیقت کی تبیین ہے۔ فرمایا۔

أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ أَهْلِهَا أَنْ لَوْ نَشَاءُ أَصَبْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ○ تِلْكَ الْقُرَىٰ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَائِهَا ۚ وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ۚ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ○ وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ مِنْ عَهْدٍ ۖ وَإِنْ وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ لَفَاسِقِينَ ○ (۷: ۱۰۰-۱۰۲)

پھر جو لوگ (پہلی جماعتوں کے بعد) ملک کے وارث ہوتے ہیں، کیا وہ یہ بات نہیں پاتے کہ اگر ہم چاہیں تو پہلوں کی طرح (انھیں بھی گناہوں کی وجہ سے مصیبتوں میں مبتلا کر دیں، اور ان کے دلوں پر مہر لگا دیں کہ کوئی بات سنیں ہی نہیں؟

(اے پیغمبر!) یہ ہیں (دنیا کی پرانی) آبادیاں، جن کے حالات ہم تمھیں سناتے ہیں۔ ان سب میں ان کے پیغمبر (سچائی کی) روشن دلیلوں کے ساتھ آئے، مگر ان کے بسنے والے ایسے نہ تھے کہ جو بات پہلے جھٹلا چکے تھے، اسے سچائی کی نشانیاں دیکھ کر مان لیں۔ سو دیکھو اس طرح خدا ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جو (ہٹ دھرمی سے) انکار کرتے ہیں!

اور ان میں سے اکثروں کو ہم نے ایسا پایا کہ اپنے عہد پر قائم نہ تھے۔ اور اکثروں کو ایسا ہی پایا کہ یک قلم نافرمان تھے!

یہ وہ قومیں تھیں جنھیں بہت کچھ فراغت حاصل تھی لیکن ان لوگوں نے خدا کی ان نعمتوں کا غلط استعمال شروع کر دیا اور تباہ ہو گئے۔

فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ ۖ فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنْبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ○ أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ

قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَ اَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ۪ وَّ جَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ (۶/۶)

چنانچہ جب سچائی ان کے پاس آئی (یعنی قرآن کی دعوت نمودار ہوئی) تو انھوں نے اسے جھٹلایا۔ سو جس بات کی یہ ہنسی اڑاتے رہے ہیں، عنقریب اُس کی حقیقت انھیں معلوم ہو جائے گی!

کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ان سے پہلے قوموں کے کتنے ہی دور گزر چکے ہیں جنھیں ہم نے ہلاک کر دیا؟ یہ وہ قومیں تھیں جنھیں ہم نے اس طرح (طاقت و تصرف کے ساتھ) ملکوں میں جمایا تھا کہ اس طرح تمھیں نہیں جمایا ہم نے ان پر آسمانی بارش اس طرح بھیجی تھی کہ پے درپے برستی رہتی۔ اور ان کی آبادیوں کے نیچے نہریں رواں کر دی تھیں (کہ ہمیشہ جاری رہتی تھیں) لیکن پھر ہم نے (اپنے مقررہ قانون کے بموجب) ان کے گناہوں کی وجہ سے انھیں ہلاک کر دیا۔ اور ان کے بعد دوسری قوموں کے دور پیدا کر دیئے۔

قصۂ قارون کے ضمن میں فرمایا۔

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۪ وَ اٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ۗ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ۝ وَ ابْتَغِ فِيْمَاۤ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَ لَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَ اَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَ لَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (۲۸/۷۶-۷۷)

(اور دیکھو) حقیقت حال یہ ہے کہ قارون موسیٰ ہی کی قوم (کے افراد میں) سے تھا مگر وہ اُن پر (یعنی اپنی قوم پر) بھی زیادتیاں کرنے لگا اور بات صرف یہ تھی کہ) ہم نے اسے کچھ خزانے عطا کر دیئے تھے جن کی کنجیاں (خود اتنی وزنی تھیں کہ) طاقتور آدمیوں کی ایک جماعت پر (اپنے وزن کی وجہ سے اٹھانے میں) بھاری ہو جایا کرتی تھیں۔ (یاد کرو) جب اس کی قوم نے اس سے کہا کہ "اترامت۔ بلاشبہ خدا اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور خدا نے جو کچھ تجھے دے رکھا ہے اس میں عالم آخرت (کو سنوارنے) کا بھی خیال کر اور اپنا حصّہ دنیا میں سے نہ بھول اور جیسا کہ خدا نے تجھ پر احسان کیا ہے تو (بھی اس کے بندوں پر) احسان کر اور زمین میں فساد (پھیلانے) کی تلاش میں نہ رہا کر۔ بلاشبہ خدا فساد

کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

لیکن وہ نشۂ دولت میں بدمست تھا۔ جیسے ہر سرمایہ دار (capitalist) ہوتا ہے۔ اس نے ان باتوں کو نگاہ کے تبسّم سے سُنا اور لب کی ہنسی سے ٹھکرا دیا، یہ کہتے ہوئے کہ (معاذ اللہ) کہاں کا خدا اور کونسا اس کا فضل! میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اپنی تدابیر سے کیا ہے۔ اس لئے جس طرح میرا جی چاہے اسے صرف کروں۔

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ ؕ اَوَلَمْ یَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ اَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَ لَا یُسْــٴَـلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ○ (۲۸/۷۸)

قارون بولا "یہ تو مجھے اس علم و بصیرت کی وجہ سے دیا گیا ہے جو میرے پاس موجود ہے" کیا خوب! اس نے اتنا بھی نہ جانا کہ اس سے پہلے خدا ان نسلوں تک کو تباہ کر چکا ہے جو قوت کے اعتبار سے اس سے زیادہ مضبوط اور جمعیت کے اعتبار سے بھی اس سے زیادہ تعداد میں تھیں؛ اور ان غلط کار لوگوں سے (ان کی کھلی ہوئی) غلط کاریوں کے متعلق سوال کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔

سمجھنے بوجھنے والے

اور پھر طرفہ تماشہ یہ کہ یہ ہلاک ہونے والے سب کچھ سمجھتے بوجھتے۔ دیکھتے بھالتے تھے۔ علم و ہنر کے مدعی۔ ایجادات و انکشافات میں سب سے آگے۔ تہذیب و تمدن کے اجارہ دار۔ دانش و بینش میں اپنے ہم عصروں پر فوقیت رکھنے والے۔ لیکن با ایں ہمہ اپنے ہاتھوں سے اپنی ہلاکت کے سامان فراہم کرنے پر مُصر۔ سب کچھ سوچتے سمجھتے، تباہی کے جہنم کی طرف کشاں کشاں جا رہے ہیں اس لئے کہ

عقل کو تابعِ فرمان نظر کر نہ سکے

قرآن کریم نے اس حقیقت کو ایک لفظ کے اندر اس حسن و خوبی سے مرکوز کر دیا ہے کہ بصیرت اس پر وجد کرتی ہے۔ فرمایا

وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَا۟ وَ قَدْ تَّبَیَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۫ وَ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ ○ (۲۹/۳۸)

اور ہم نے عاد اور ثمود کو تباہ کر دیا اور (یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے) ان کے مکانات کے کھنڈر خود اس کے شاہد ہیں۔ اور بات یہ تھی شیطان نے ان کے لئے ان کے اعمال کو مزین بنا رکھا تھا چنانچہ انہیں راہِ حق سے روک دیا۔ اور (یہ لوگ اندھے نہیں تھے) سب کچھ دیکھنے بھالنے والے تھے۔

بس "مستبصرین" کی تشریح دوسری جگہ ان الفاظ میں فرما دی۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَةً ﺯ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ٥ (۲۶/۴۶)

اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے انھیں ان معاملات میں قدرت دے رکھی تھی جن میں ہم نے تمھیں بھی قدرت نہیں دی اور انھیں سمع اور بصر اور قلب (سب ہی کچھ) عطا کر رکھے تھے۔ مگر ان کے کان اور نگاہیں اور دل ان کے کچھ بھی کام نہ آئے (اور ہمارے عذاب نے انھیں آکر پکڑ لیا) کیونکہ وہ قوانین خداوندی کا انکار کیا کرتے تھے (اور پھر نتیجہ یہ ہوا کہ) انھیں انہی باتوں نے آکر گھیر لیا جن کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔

یوں ہی آگے نہ بڑھ جائیے۔ اس آیہ جلیلہ کے مفہوم پر غور کیجئے اور اتنا غور کیجئے کہ یہ آپ کے قلب کی گہرائیوں میں اُتر جائے۔ اس لئے کہ آج جو کچھ یورپ کے لالہ زاروں میں ہو رہا ہے وہ اسی حقیقتِ کبریٰ کی تفسیر ہے۔ بصارت و سماعت۔ دانش و بینش۔ علم و ہنر۔ سب کچھ موجود ہے لیکن چونکہ تو انین خداوندی سے انکار وجحود ہے اس لئے عقل و تدبر کی فسوں کاریاں بے بس ہو کر ٹھٹھر گئی ہیں اور جن حقائق ابدی کی ہنسی اڑائی جاتی تھی وہ پھانسی کا پھندا بن کر پورے یورپ (اور اس کے ساتھ اس کے ملحقین) کے گلے میں پڑا ہے جس سے نجات کی کوئی صورت نہیں۔ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ اس لئے کہ قوانین خداوندی کی خلاف ورزی سے سر کی آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں۔ دل کی آنکھوں کی روشنی کم ہوا کرتی ہے فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ (۲۲/۴۶) یاد رکھئے۔ تنہا عقل و دانش عالم آفاق کے انکشافات و اختراعات میں ضرور رہنمائی کرتی ہے لیکن انسانی ہیئت اجتماعیہ میں جہاں انسانوں کے حقوق و مفاد کا باہمی تصادم و تزاحم ہو تنہا عقل کبھی صحیح راستہ نہیں دکھا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ باوجود مستبصرین ہونے کے انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے معاملہ میں اندھے کے اندھے رہ جاتے ہیں۔

عیوب عام ہو جائیں

اور یہ حالت اس وقت ہوتی ہے جب کسی سوسائٹی میں عیوب اس درجہ عام ہو جائیں کہ عیب، عیب ہی نہ سمجھا جائے۔ سب ایک ہی رنگ میں رنگے جائیں اور قوم کو فتنہ و فساد سے کوئی روکنے والا نہ ہو۔ یعنی ان کی زندگی کی پوری عمارت غیر صالح بنیادوں

پر استوار ہو جائے اور فکر و نظر کے تمام گوشے اسی عمارت کے مختلف شعبے بنتے چلے جائیں۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا أُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ○

پھر (دیکھو) ایسا کیوں نہیں ہوا کہ جو عہد تم سے پہلے گزر چکے ہیں، ان میں اہل خیر باقی رہے ہوتے اور لوگوں کو ملک میں شر و فساد کرنے سے روکتے؟ ایسا نہیں ہوا مگر بہت تھوڑے عہدوں میں جنہیں ہم نے نجات دی۔ ظلم کرنے والے تو اسی راہ پر چلے جس میں انہوں نے (اپنی نفس پرستیوں کی) آسودگی پائی تھی۔ اور وہ سب (احکام حق کے) مجرم تھے۔

یہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں بچنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ اس لئے تباہ ہو جاتے ہیں۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّأَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ○ (۱۱/۱۱)

اور (یاد رکھو) ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ تمہارا پروردگار آبادیوں کو ناحق ہلاک کر دے اور اس کے باشندے سنوارنے والے ہوں!

وہ مصلحین کی جماعت کے ہاتھوں تباہ ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ موجود نہ ہوں تو خود ایک دوسرے سے ٹکرا کر تباہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے بڑے بڑے طاغوت اپنی ابلیسی تدابیر سے ساری دنیا پر چھا جانے کے منصوبے باندھتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ ان کی سب تدابیر خود ان کی ہلاکت کے سامان فراہم کرنے کے لئے ہیں۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ أَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ۚ وَمَا يَمْكُرُوْنَ إِلَّا بِأَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ○ (۶/۱۲۳)

اور (دیکھو جس طرح آج مکہ کے رئیس دعوت حق کی مخالفت میں سرگرم ہیں) اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بدکردار آدمیوں کے سردار پیدا کر دیئے، تاکہ وہاں مکر و فریب کے جال پھیلائیں۔ اور فی الحقیقت وہ مکر و فریب نہیں کرتے مگر اپنے ہی ساتھ (کیونکہ وہ حق کو تو کچھ نقصان پہنچا سکتے نہیں، اپنے ہاتھوں اپنا ہی نقصان کرتے ہیں) لیکن اس کا شعور نہیں رکھتے۔

اکابر مجرمین؟

اس آیت جلیلہ کے مفہوم پر پھر غور کیجئے۔ اکابر مجرمین۔ یعنی قومی تدبیر و سیاست کے ارکین و معتمدین۔ عمائد سلطنت و حکومت۔ ارباب سطوت و حکمت۔ نظام حکومت کے واضعین۔ سب مل کر بیٹھتے ہیں اور دوسری قوموں کی ہلاکت و بربادی کے لئے خفیہ تدابیر سوچتے ہیں (لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا) (مکر کے معنے خفیہ تدبیر کے ہیں) لہٰذا وہ چپکے چپکے سوچتے ہیں۔ اندر ہی اندر دوسروں کی

ہلاکت کے منصوبے باندھتے اور (secret weapons) تیار کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جس وقت ادھر یہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے عین اسی وقت دوسری قوم کے ارباب حل و عقد بھی اسی قسم کے منصوبوں میں منہمک ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی خفیہ تدابیر، جو ان کے نزدیک بزعم خویش دوسروں کی ہلاکت کا ذریعہ بننے والی ہوتی ہیں درحقیقت خود انہی کی ہلاکت کا سامان لئے ہوتی ہیں۔ وَمَا یَمْکُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ لیکن ان بدنصیبوں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے اور نہیں جانتے کہ ہم خودکشی کی کن جانکاہ تدبیروں میں مصروف ہیں۔ وَمَا یَشْعُرُوْنَ۔ چنانچہ یہ سب کچھ اندر ہی اندر ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ یہی قوتیں آپس میں اس انداز سے متصادم ہو جاتی ہیں کہ ساری دنیا ان زلزلوں کے دھماکے سے کپکپا اٹھتی ہے۔

وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (۶/۱۲۹)

اور (دیکھو) اس طرح ہم بعض ظالموں کو بعض ظالموں پر مسلط کر دیتے ہیں۔ ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے۔

عبرت آموزی جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ ان واقعات و کوائف کی طرف توجہ اس لئے منعطف کرائی جاتی ہے کہ ان سے عبرت حاصل کی جائے۔ یعنی وہ فائدہ اٹھایا جائے جو تاریخ امم کی ترتیب و تحفظ سے مقصود ہے۔ ہر آنے والی قوم یہ سمجھ لے کہ فلاں قوم نے فلاں روش زندگی اختیار کی تو ان کا یہ انجام ہوا اور اگر اسی قسم کی روش زندگی ہم اختیار کریں گے تو ہمارا بھی یہی حال ہوگا۔ نزول قرآن کریم کے وقت بنی اسرائیل کی قوم جیتی جاگتی سامنے موجود تھی۔ یہ وہ قوم تھی جس کی عظمت و شوکت کی وارث امت محمدیہ ہونے والی تھی۔ اس لئے جماعت مومنین سے کہا گیا کہ بنی اسرائیل سے پوچھو کہ خدا کی نعمتوں کی ناسپاسی کرنے والی قوم کا انجام کیا ہوا کرتا ہے؟

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَ مَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (۲/۲۱۱)

(اے پیغمبر! چاہیئے کہ یہ لوگ پچھلی امتوں کی سرگزشتوں سے عبرت پکڑیں۔ ان سے کہو کہ بنی اسرائیل سے پوچھو، ہم نے انھیں (علم و بصیرت کی) کتنی روشن نشانیاں دیں (اور کس طرح فلاح و سعادت کی تمام راہیں ان پر کھول دیں؟ لیکن اس پر بھی راہ ہدایت پر قائم نہ رہے اور نعمت الٰہی کی قدرشناسی نہ کی) اور جو کوئی خدا کی نعمت پا کر پھر اسے (محرومی و شقاوت سے) بدل ڈالے، تو یاد رکھو خدا (کا قانون مکافات) بھی سزا دینے میں بہت سخت ہے۔

یہ قوم تو سامنے موجود تھی اس لئے ان کی پریشان حالی اور تباہی و بربادی محسوس شکل میں چلتی پھرتی نظر آ رہی تھی۔ لیکن ان سے پیشتر اور متعدد اقوام ایسی گذر چکی تھیں جن کی عبرت داستانیں باقی تھیں۔ اس لئے ان کے حالات بیان کر دیئے تاکہ ان سے عبرت حاصل کی جائے۔ اس عبرت آموزی کے لئے سب سے پہلے عرب کے ان کفار سے مخاطب کیا گیا جو اپنی قوت و سطوت کے نشہ میں قوانین الٰہیہ کی اطاعت سے سرکشی برتتے تھے۔ ان سے کہا گیا کہ ذرا اقوام گذشتہ کے حالات پر نگاہ ڈالو اور سوچو کہ کیا تم ان سے بھی زیادہ قوت و حشمت کے مالک ہو۔ جب قوانین خداوندی سے انکار و عدوان سے ان کا انجام ہلاکت اور تباہی ہوا تو کیا تمہارا بھی وہی انجام نہ ہوگا۔

اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَّ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ اَهْلَكْنٰهُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝ (۴۴)

(اے پیروان دعوت اسلامی! غور تو کرو) کیا یہ (یعنی منکرین دعوت) بہتر حالت میں ہیں یا قوم تبع اور وہ قومیں جو ان سے بھی پہلے گزر چکی ہیں بہتر حالت میں تھیں؟ (مگر تمہیں خوب معلوم ہے کہ ہم نے ان کی قوت کی ذرا پرواہ نہیں کی) ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ (کیونکہ) بلاشبہ وہ (ہمارے قوانین کے اعتبار سے) مجرم لوگ تھے[1]

سورۂ محمد میں ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ۝ (۴۷)

(اے پیغمبر اسلام!) کتنی ہی آبادیاں تھیں جو قوت (و شوکت) کے اعتبار سے تمہاری اس آبادی (والوں)

---

[1] اس آیت سے متصل اور آیات پر مزید غور کیجئے اور دیکھئے کہ ان میں مکافات عمل کے عالمگیر قانون کا فلسفہ کس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۴۴: ۳۸-۳۹)

اور دیا در کھو) ہم نے آسمان و زمین کو اور ان تمام چیزوں کو جو آسمان و زمین میں ہیں کھیل کود کے خیال سے پیدا نہیں کیا۔ (اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ہم نے انہیں حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ لیکن (افسوس کہ) اکثر لوگ (اس حقیقت کو) جانتے نہیں۔

یعنی تمام کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے۔ محض کھیل تفریح کے لئے پیدا نہیں کی گئی۔ یہ سب کچھ ایک عظیم الشان مقصد کے حصول کی خاطر ہو رہا ہے اور کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب تک تمام اعمال اپنے نتائج ٹھیک ٹھیک مرتب نہ کریں۔

سے زیادہ مضبوط تھیں جنھوں نے تمھیں (اے پیغمبر شہر مکہ سے) باہر نکال دیا ہے (مگر جب ہمارا قانون مکافات حرکت میں آیا تو ان کی قوت کچھ بھی کام نہ آئی۔ نتیجہ یہی ہوا کہ) ہم نے (جب) ان کو ہلاک کر دیا تو ان کا کوئی مددگار بھی نکل کر نہ آسکا (اور ایک نہ ایک دن یہی ان لوگوں کا بھی انجام ہو کر رہتا ہے۔)

اور یہ اس لئے کہ

أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ كَمَن زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُم ۝ (۴۷/۱۴)

(خیال تو کرو) کیا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل پر چل رہا ہو اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے (جس کے پاس دلیل و برہان تو کچھ نہیں، البتہ) اس کی بدعملیاں اس کے واسطے مزین کر دی گئی ہیں اور (یہ لوگ صرف خواہشات (نفسانی) کی پیروی کرتے ہیں؟ (ظاہر ہے کہ دونو کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

جو کچھ عرب کے مستبد اور سرکش کہتے تھے وہی کچھ ان سے پہلے لوگ کہا کرتے تھے۔

فَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۖ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۖ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ ۝ (۴۱/۱۵)

پس (دیکھ لو) عاد نے (خدا کی) زمین میں بلاوجہ غرور و تکبر کیا اور کہنے لگے "ہم سے بڑھ کر قوت میں زیادہ مضبوط کون ہو سکتا ہے؟" (اور اس انا ولا غیری کا نعرہ لگانے سے پہلے) کیا انھوں نے (اتنا بھی) نہ دیکھا کہ جس خدا نے انھیں پیدا کیا ہے وہ ان سے بھی بڑھ کر قوت کے اعتبار سے زیادہ مضبوط ہے! (سب کچھ جانتے ہوئے بھی) وہ لوگ (ضد اور عناد کے ساتھ) ہماری آیتوں کا انکار کرنے کے عادی ہو گئے تھے!

عاد اور ثمود تو کیا۔ فرعون جیسے استکبار و فرعونیت کے مجسموں کو قانون مجازات کی محکم گرفت نے نہ چھوڑا۔

وَلَقَدْ جَاءَ آلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ۚ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كُلِّهَا فَأَخَذْنَاهُمْ أَخْذَ عَزِيزٍ مُّقْتَدِرٍ ۝ أَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ أُولَٰئِكُمْ أَمْ لَكُم بَرَاءَةٌ فِي الزُّبُرِ ۝ أَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِيعٌ مُّنتَصِرٌ ۝ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ۝ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ

أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ ○ إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ○ (۵۴/۴۳-۴۷)

اور (دیکھو) قوم فرعون کے پاس بھی (انکار و بد عملی کے نتائج سے ڈرانے والے آچکے تھے (مگر) انھوں نے ہماری آیتوں کو (یکے بعد دیگرے) جھٹلادیا۔ پھر (انجام یہی ہوا کہ) ہم نے انھیں ایک غالب قدرت والے کی طرح پکڑ لیا۔ (تو اب بتلاؤ کہ) کیا تمھارے انکار کرنے والے ان انکار کرنے والوں سے بہتر ہیں یا (خدا کی طرف سے) صحیفوں میں تمھارے لئے کوئی براءت (لکھ دی گئی) ہے۔ یا وہ کہتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کی مدد کرنے والی جمعیت ہیں؟ (شاید انھیں معلوم نہیں کہ) بہت جلد ان کی اس جمعیت کو شکست دیدی جائے گی اور وہ سب پیٹھ موڑ جائیں گے۔ (اور صرف اتنا ہی نہیں) بلکہ قیامت کا دن اُن کے وعدہ کا دن ہے، اور (شاید تمھیں معلوم نہیں) کہ قیامت کا دن بہت ہی خوفناک اور بہت ہی تلخ دن ہوگا۔ بلاشبہ مجرم لوگ ہیں ہی ہلاکت اور مصیبت میں۔

سورۂ مزمل میں ہے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا ۵ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۔ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا ○ فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ۝ السَّمَاءُ مُنْفَطِرٌ بِهِ ۚ كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا ○ إِنَّ هَٰذِهِ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ○ (۷۳/۱۵-۱۹)

(اے مخاطبین دعوتِ اسلامی!) بلاشبہ ہم نے تمھاری طرف بھی ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر نگران ہے (بالکل اسی طرح) جیسے ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا۔ پس فرعون نے اس رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے بھی اسے سخت گرفت کے ساتھ پکڑ لیا تو اگر تم انکار کروگے تو اس دن (کی گرفت سے) کس طرح بچ سکتے ہو (جس کی ہولناکی) بچوں کو بوڑھا کردے گی۔ آسمان اس پر پھٹ پڑنے والا ہوگا۔ اور خدا کا یہ وعدہ پورا ہوکر رہے گا۔

(یاد رکھو) بلاشبہ یہ تو ایک (فراموش کردہ حقیقت کی) یاد دہانی ہے۔ سو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرلے۔ (اور جو نہ چاہے نہ اختیار کرے۔)

آخری آیت کی حکمتِ بالغہ پر غور کیجئے۔ کیسے واضح الفاظ میں بیان کردیا کہ قرآن تو فقط قانونِ مکافاتِ عمل اور اس کے اٹل اور محکم نتائج و عواقب کی یاد دہانی ہے۔ سو جس کا جی چاہے اس سے عبرت حاصل کرکے اپنے اللہ کے قانون کی اتباع کرے اور یوں زندگی کی سیدھی راہ پر ہولے۔ ورنہ اس کے لئے ہلاکت منتظر

کھڑی ہے۔ فرعون کی سرکشی اور فتنہ سامانی کا انجام تمام پس آمندگان کے لئے عبرت و موعظت کی زندہ داستان ہے۔

فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّ مَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ۝ (۴۳/۵۵-۵۶)

سو جب انھوں نے ہمیں ناراض کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا۔ چنانچہ ان سب کو (دریائے نیل میں) غرق کر دیا اور اس طرح ہم نے انھیں بعد میں آنے والوں کے لئے نمونہ اور مثال بنا دیا۔

پھر جو قوم ان اقوام گذشتہ کے احوال و عواقب سے عبرت حاصل نہیں کرتی وہ درحقیقت خدا کے قانون مجازات کی تکذیب کرتی ہے اور نہیں سمجھتی کہ اس قانون کی ہمہ گیری انھیں چاروں طرف سے محیط ہے۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۝ فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ ۝ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ۝ وَّ اللّٰهُ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ مُّحِيْطٌ ۝ (۸۵/۱۷-۲۰)

(اے پیغمبر اسلام!) کیا تم تک فرعون اور ثمود کی فوجوں کی باتیں پہنچی ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے کفار کا رستہ اختیار کیا ہے وہ (سچائی کو) جھٹلانے ہی میں لگے رہتے ہیں اور اللہ (کا قانون مکافات) انھیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے (جس سے بچ کر وہ کہیں نکل نہیں سکتے)

حالانکہ قانون ایسے محفوظ مقام (علم الٰہیہ) میں رکھا گیا ہے جہاں کسی کی دسترس نہیں ہو سکتی کہ اس کے نتائج و اثرات میں کسی قسم کا رد و بدل کر سکے۔

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝ (۸۵/۲۱-۲۲)

اصل بات یہ ہے کہ وہ سچائی (جسے) یہ لوگ جھٹلانے میں لگے رہتے ہیں، بڑی شان والا قرآن ہے جو محفوظ تختی میں ہے۔

ان لوگوں سے کہا کہ دُور مت جاؤ۔ خود اپنے گرد و پیش کی اُجڑی ہوئی بستیوں کی طرف دیکھو اور غور کرو کہ ان کا انجام کیا ہوا۔

وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَ صَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ (۴۶/۲۷)

اور (اے مخاطبین دعوت اسلامی!) ہم نے تمہارے آس پاس اور اردگرد کی بہت سی بستیوں کو برباد کر دیا۔ اور اپنی آیات کو (برباد کرنے سے پہلے) بار بار دُہرایا کہ ممکن ہے (یہ لوگ) لوٹ

آئیں (اور اپنی بدعملیوں سے باز آجائیں)۔

یہ وہ قومیں ہیں جو اپنی مرکزیت کھو بیٹھنے کے بعد "ایں سو راندہ، زآں سو درماندہ"۔ دربدر، خاک بسر، ماری ماری پھر رہی ہیں اور زمین کے کسی گوشہ پر انھیں تمکن حاصل نہیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا بھی یہی مآل ہو۔؟

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ؕ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ۝ (۵۰/۳۶)

اور (اے مخاطبینِ دعوتِ اسلامی!) ان (منکرینِ دعوت) سے پہلے ہم نے کتنی ہی نسلیں برباد کردی ہیں جو ان سے زیادہ طاقت وقوت میں مضبوط تھیں۔ چنانچہ انھوں نے تمام شہروں کو چھان مارا (مگر جب ہمارا قانونِ مکافات حرکت میں آیا) تو کیا (ان کے لئے) کوئی بھی بھاگنے کی جگہ تھی؟

حیرت ہے کہ تم ان واقعات کو اپنے کانوں سے سنتے اور ان تباہ حال اقوام کے پس ماندگان کی عبرت انگیز حالت کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو لیکن پھر بھی اپنی روش میں اصلاح نہیں کرتے۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ۝ (۷/۱۰۱-۱۰۲)

(اے پیغمبر!) یہ ہیں (دنیا کی پرانی) آبادیاں، جن کے حالات ہم تمھیں سناتے ہیں۔ ان سب میں ان کے پیغمبر (سچائی کی) روشن دلیلوں کے ساتھ آئے، مگر ان کے بسنے والے ایسے نہ تھے کہ جو بات پہلے جھٹلا چکے تھے، اسے (سچائی کی نشانیاں دیکھ کر) مان لیں۔ سو دیکھو، اس طرح خدا ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جو (ہٹ دھرمی سے) انکار کرتے ہیں۔

اور ان میں سے اکثروں کو ہم نے ایسا پایا کہ اپنے عہد پر قائم نہ تھے اور اکثروں کو ایسا ہی پایا کہ یک قلم نافرمان تھے!

تم اس سے عبرت حاصل نہیں کرتے کہ تم قانونِ مکافاتِ عمل پر (جس کا منتہی، حیاتِ اخروی پر) ایمان سے یقین نہیں رکھتے۔

وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْۤ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ۝ (۲۵/۴۰)

اور یہ حقیقت ہے کہ وہ لوگ (بارہا) اس آبادی پر گزر چکے ہیں جس پر (پتھروں وغیرہ کی) بُری طرح بارش برسائی جا چکی ہے مگر ان لوگوں نے کوئی عبرت حاصل نہ کی، تو کیا ان لوگوں نے اس آبادی کو دیکھا ہی نہیں (اور آنکھیں بند کرکے ہمیشہ وہاں سے گزر گئے)؟ نہیں، بات در اصل یہ ہے کہ انھیں دوبارہ زندہ ہونے (اور اعمال کی جواب دہی) کی کوئی امید ہی نہیں ہے۔

لیکن نصیحت تو وہ حاصل کرے جو ان تاریخی امثال و نظائر کو بہ نگاہ بصیرت دیکھے۔ بگوش ہوش سُنے اور پھر انھیں قلب کی گہرائیوں میں اتار کر ان پر غور و فکر کرے۔ ورنہ اگر انھیں اساطیر الاولین (پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں) سمجھ کر سُن لیا اور پڑھ لیا تو ظاہر ہے کہ اس "داستاں گوئی" سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ ○ (۵۰/۳۷)

بلاشبہ اس میں اُن ہی لوگوں کے لئے نصیحت ہے جن کے پاس (صداقت آشنا) دل ہو، یا یہ کہ وہ (بات کی طرف) کان بھی لگائیں اور خود (اپنے ہوش و حواس کے ساتھ) موجود بھی رہیں (یہ نہیں کہ کان تو یہاں ہیں اور دھیان کہیں اور۔)

یہ ہو نہیں سکتا تا وقتیکہ انسان پاداشِ عمل سے خوف نہ کھائے۔ جو جلنے کی تکلیف سے نہیں ڈرتا اس کے سامنے جلے ہوئے لوگوں کی درد و کرب کی اندوہناک داستانیں ہزار دُہرائیے، اس کے دل پر اس سے کیا اثر ہو سکتا ہے؟ اس لئے فرمایا۔

وَتَرَکْنَا فِیْهَاۤ اٰیَةً لِّلَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ○ (۵۱/۳۷)

اور ہم نے اس میں ان لوگوں کے لئے جو دردناک عذاب سے ڈرتا ہو ایک نشانی چھوڑ دی۔

لہٰذا تاریخی حقائق کیسی ہی عظیم الشان حکمت بالغہ پر منتج ہوں، قانونِ مکافات کی دار و گیر سے اعراض برتنے والی قوم پر اس کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِیْهِ مُزْدَجَرٌ ○ حِکْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ○ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ یَوْمَ یَدْعُ الدَّاعِ اِلٰی شَیْءٍ نُّکُرٍ ○ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ کَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ○ (۵۴/۴-۷)

اور ان کے پاس وہ وہ خبریں آچکی ہیں جن میں دھمکیاں۔ اور حکمت بالغہ (سب کچھ موجود تھیں)
مگر (نتائج اعمال سے) ڈرانے والے کچھ کام نہ آسکے۔ سو (اے پیغمبر) تم ان کی پرواہ نہ کرو، (اور
اس دن کا انتظار کرو) جس دن بلانے والا سخت چیز کی طرف بلائے گا۔ آنکھیں (شرم و ندامت
سے) جھکی ہوئی ہوں گی۔ (اپنی) قبروں سے وہ اس طرح نکل رہے ہوں گے جیسے پراگندہ
اور منتشر ٹڈیاں۔

اس لئے قرآن اسی کے لئے باعثِ نصیحت و وجہِ اصلاح ہو سکتا ہے جو اس سے نصیحت حاصل کرنے کا متمنی ہو۔ سورۂ قمر کی جو آیاتِ جلیلہ اوپر گزر چکی ہیں ان کے بعد، مختلف اقوام و ملل گذشتہ کے کوائفِ زندگی، ان کے فساد انگیز اعمالِ حیات اور ان اعمال کے تباہ کن نتائج و عواقب کا بیان ہے ان میں سے ہر، قوم کے عبرت انگیز انجام کے بعد اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ

وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۵۴/۱۷)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نصیحت حاصل کرنے کے لئے قرآن کو آسان کر دیا ہے۔ تو کیا کوئی
نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟

قرآن کریم کھول کر ان آیات کو بہ نگاہِ تدبر دیکھئے۔ حکمت و موعظت کے نئے نئے باب کھلتے نظر آئیں گے۔

اب تک تاریخی نظائر پر غور و تدبر کے دو طریقے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی مٹی ہوئی قوم کے پریشان حال افراد کی حالتِ زبون و نزار پر غور کر کے سوچا جائے کہ یہ چلتے پھرتے جنازے کس شاندار ماضی کے افسانے ہیں؟ اور دوسرے یہ کہ امم سابقہ کے عروج و زوال کی داستانیں جو زبان زد خلائق ہوں یا تاریخ کے صفحات، میں محفوظ ہوں ان پر نگاہ بنائی جائیں۔ لیکن تاریخی حقائق کی نقاب کشائی اور ان سے عبرت آموزی کا

اثری انکشافات

ایک اور طریق بھی ہے جسے اثری انکشافات (Archaeological Discoveries) کہا جاتا ہے۔ دنیا نے یہی سمجھا ہے کہ یہ عظیم المنزلت علمی کارنامہ عصر حاضر ہی کی ایجاد ہے لیکن جس کی نگاہیں قرآن پر ہیں وہ جانتا ہے کہ اس کی اولیت کا سہرا بھی اسی جامع علوم و حکم کے سر ہے۔ قرآن کے اوراق کو الٹئے اور دیکھئے کہ اس نے کس کس انداز سے کہا ہے کہ ان لوگوں سے کہو کہ جاؤ۔ زمین میں چلو پھرو اور جن اقوام گذشتہ کے افسانے تمہارے کانوں تک پہنچے ہیں ان کی اجڑی ہوئی بستیوں میں پہنچو اور ان کی مٹی ہوئی عظمت اور چھنی ہوئی سطوت کے کھنڈرات پر غور کرو، اور دیکھو کہ ان کی بکھری ہوئی پرانی ٹھیکریوں

عبرت و موعظت کی کتنی اثر انگیز اور دل دوز داستانیں منقوش ہیں۔ ان نقوش کو دیکھو اور ان کے آئینے میں ماضی کے واقعات اور سوانح کا مطالعہ کرو۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ○ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ○ (۳/۱۳۷-۱۳۸)

اور دیکھو، تم سے پہلے بھی دنیا میں (قوموں کی حیات و ممات اور عروج و زوال کے) دستور و قوانین رہ چکے ہیں۔ (اور وہ تمہارے لئے معطل نہیں ہو جائیں گے) پس دنیا کی سیر کرو اور دیکھو کہ جو لوگ احکامِ حق کو جھٹلانے والے تھے، ان کا انجام کیا ہوا اور پاداشِ عمل میں کیسے نتائج پیش آئے؟ یہ لوگوں (کے فہم و بصیرت) کے لئے ایک بیان ہے، اور ان لوگوں کے لئے جو متقی ہیں ہدایت اور موعظت ہے!

اس سے ایک ہی آیت بعد فرمایا کہ وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔ تم مداولتِ ایام پر غور کرو اور دیکھو کہ تاریخ کس طرح اپنے آپ کو دُہراتی ہے؟ اقوام و ملل کے عروج و زوال کا قانون کس طرح عالمگیر اور جزرس ہے؟۔ سورۂ یوسفؑ میں ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ○ (۱۲/۱۰۸)

(اے پیغمبر!) تم کہہ دو "میری راہ تو یہ ہے میں اس روشنی کی بنا پر جو میرے سامنے ہے، اللہ کی طرف بلاتا ہوں، اور (اس راہ میں) جن لوگوں نے میرے پیچھے قدم اٹھایا ہے وہ بھی (اسی طرح) بلاتے ہیں۔ اللہ کے لئے پاکی ہو میں شرک کرنے والوں میں نہیں ہوں!"

دعوت الی اللہ علیٰ وجہ البصیرت۔ اس کے بعد فرمایا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۲/۱۰۹)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم سے پہلے کسی رسول کو نہیں بھیجا ہے، مگر اسی طرح کہ وہ باشندگان شہر ہی میں سے، ایک آدمی تھا اور ہم نے اس پر وحی اتاری تھی (ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آسمان سے فرشتے اُترے ہوں) پھر کیا یہ لوگ (جو تمہارے اعلانِ رسالت پر متعجب ہو رہے ہیں) زمین میں چلے پھرے

نہیں کہ دیکھتے کہ ان لوگوں کا انجام کیسا کچھ ہو چکا ہے جو پہلے گذر چکے ہیں؟ اور جو لوگ (برائیوں سے) بچتے ہیں، تو یقیناً آخرت کا گھران کے لئے کہیں بہتر ہے۔ پھر (اے گروہِ مخاطب:) کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں؟

سورۂ نحل میں اسی قانون اور اس کے اثرات و عواقب کے متعلق فرمایا۔

وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ۝

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے (دنیا کی) ہر اُمت میں کوئی نہ کوئی رسول ضرور پیدا کیا (تاکہ اس پیامِ حق کا اعلان کر دے) کہ اللہ کی محکومیت و اطاعت اختیار کرو اور ہر غیر خدائی نظام سے منہ موڑو۔ پھر ان امتوں میں سے بعض ایسی تھیں جن پر اللہ نے (کامیابی کی) راہ کھول دی۔ بعض ایسی تھیں جن پر گمراہی ثابت ہو گئی۔ پس ملکوں کی سیر کرو اور دیکھو، جو قومیں (سچائی کی) جھٹلانے والی تھیں، انھیں بالآخر کیسا انجام پیش آیا؟

تم نے قومِ عاد و ثمود کے تذکرے سُنے۔ اُن کے مٹنے کی داستانیں تمہارے کانوں تک پہنچیں۔ اٹھو اور دیکھو۔

فَتِلْكَ بُیُوْتُهُمْ خَاوِیَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝ (۲۷/۵۲)

چنانچہ یہ ان کے مکانات موجود ہیں جو اوندھے پڑے ہیں۔ (کیوں؟) اس وجہ سے کہ انھوں نے ظلم اور ناانصافی کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ بلاشبہ (اس صورتِ حال) میں ان لوگوں کے لئے (بڑی) نشانی ہے جو (ذرا بھی) علم (و شعور) رکھتے ہیں۔

ان اُجڑے ہوئے دیار سے ان شوریدہ بخت اقوام کی تباہی پر غور کرو۔ ان مساکن سے ساکنین کی حالت کا اندازہ لگاؤ۔ ان کے کھنڈرات سے ان کی عمارات کی رفعت و شوکت پر قیاس کرو۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ۝ وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَا۠ وَ قَدْ تَّبَیَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۫ وَ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ ۝ (۲۹/۳۷-۳۸)

چنانچہ اُنھوں نے شعیب کو جھٹلایا اور (اس کے نتیجہ میں) ایک ہولناک زلزلے نے اُنھیں آپکڑا۔ پس وہ اپنے گھروں میں (مُنہ کے بل) اوندھے پڑے رہ گئے۔ اور (یہی حال) عاد و ثمود کا ہوا۔ اور (عاد و ثمود کا حال تو تمھیں خود معلوم ہے، کیونکہ) یہ حقیقت ہے کہ تم پر اُن کے (اُجڑے ہوئے اور برباد شدہ) مکانات سے ان کی بربادی (کی داستان) بخوبی واضح ہو چکی ہے۔ اور (وجہ یہ ہوئی کہ) شیطان نے ان کی بداعمالیوں کو ان کی آنکھوں میں مزین کر رکھا تھا۔ چنانچہ شیطان نے انہیں (صحیح) راستہ سے (آخر تک) روکے رکھا۔ حالانکہ وہ (اگر صحیح طریقہ پر اپنے اعمال کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے تو اپنی بے راہ روی کو بخوبی سمجھ سکتے تھے، کیونکہ) آخر وانا وبینا آدمی تھے۔!

تم صبح و شام آنکھیں بند کر کے ان کھنڈرات سے گزر جاتے ہو اور نہیں سوچتے کہ ان کے اندر ماضی کے کتنے کتنے بڑے قد آور آئینے مدفون ہیں جن میں حال کے خد و خال نمایاں طور پر دکھائی دے سکتے ہیں۔ ان پر سے گزرتے ہوئے اندھوں کی طرح مت گذر جاؤ۔ آنکھیں کھول کر چلو اور ان ٹھیکریوں میں آنے والے دور کی عبرت آموز تصویریں دیکھو۔

وَ اِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ۙ وَ بِالَّيْلِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (۳۷ – ۱۳۸ – ۱۳۷)

اور بلاشبہ تم لوگ ان (برباد شدہ اقوام کی آبادیوں) پر صبح کو اور راتوں کو گذرتے رہتے ہو۔ تو کیا تم (پھر بھی) کچھ سمجھتے نہیں؟

اور یہ اس لئے کہ تمھاری آنکھوں میں دیکھنے کی۔ تمھارے کانوں میں سننے کی اور تمہارے دلوں میں سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ ۝ (۲۲/۴۵)

پھر دیکھو، کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے اُنھیں ہلاک کر دیا۔ اور وہ ظلم کرنے والی تھیں۔ وہ ایسی اُجڑیں کہ اپنی چھتوں پر گر کر رہ گئیں۔ کنویں ناکارہ ہو گئے۔ سر بفلک محل کھنڈر بن گئے۔

اس آیت کو آپ نے دیکھ لیا۔ اب اس کے بعد اس سے اگلی آیت کو دیکھئے۔ اور دل کی آنکھوں سے دیکھئے۔ فرمایا۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَاۤ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى

الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ ۝ (۲۲/۴۶)

کیا یہ لوگ ملکوں میں چلے پھرے نہیں کہ عبرت حاصل کرتے؟ ان کے پاس دل ہوتے تو سمجھتے بوجھتے کان ہوتے تو سنتے اور پاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ (جب کوئی اندھے پن میں پڑتا ہے) تو آنکھیں اندھی نہیں ہو جایا کرتیں (جو سروں میں ہیں) دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر پوشیدہ ہیں!

اس عدیم النظیر ٹکڑے کو جلی حروف میں لکھ کر سامنے آویزاں کر لیجیے کہ اِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ۔

غور کیجیے! ان اثری انکشافات کی تاکید کس قوم سے کی گئی تھی اور اس پر عمل کس نے کیا؟ آج یورپ کے علمائے اثریات نے مدت العمر کی محنت شاقہ اور مسلسل سعی و عمل سے اپنی زمین دوز کھنڈرات سے اقوام سابقہ کے تہذیب و تمدن اور عروج و زوال کی حتی الامکان تاریخ مرتب کر لی ہے۔ اور ایک ہم ہیں کہ خود اپنے کھنڈرات کے آئینے میں اپنی حالت نہیں دیکھتے۔ لیکن یورپ نے یہ تمام سعی و کاوش محض علمی تحقیقات کی غرض

اثری تحقیقات سے غرض؟

سے ہی کی اور ان سے وہ صحیح تاریخی فائدہ نہ اٹھایا جس کی طرف قرآن کریم کی حکمت بالغہ راہ نمائی کرتی ہے۔ اگر یہ تمام کد و کاوش قرآنی روشنی میں کی جاتی تو مغرب ان تمام علمی ذخیروں کے بعد اس طرح ہلاکت میں نہ گرتا۔ قرآن کریم میں ان تمام اثری انکشافات اور تاریخی تحقیقات کا منتہیٰ یہ ہے کہ ان سے قوانینِ خداوندی پر چلنے کی دلیل حاصل کی جائے نہ کہ انہیں محض علمی تفنن کا ذریعہ بنا لیا جائے۔ سورۂ سجدہ میں فرمایا۔

اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِىْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ۭ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ۝ (۳۲/۲۶)

کیا اس کتاب (تورات) نے ان پر یہ بات واضح نہیں کر دی تھی کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی نسلیں برباد کر دی ہیں جن کے مکانوں کے درمیان وہ چلتے پھرتے ہیں (اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو) بلاشبہ اس میں بڑی ہی نشانیاں تھیں۔ تو کیا وہ لوگ (ان واقعات کو) سنتے ہی نہیں۔)

ان کھنڈرات کی ٹھیکریاں بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جو قانونِ فطرت کی شکل میں ہر جگہ جاری و ساری ہے۔ اس لئے اس سے اگلی آیت میں فرمایا۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ ۭ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ۝ (۳۲/۲۷)

کیا انہوں نے (اتنا بھی) نہیں دیکھا کہ ہم ہی ہیں جو پانی کو خالی (اور خشک) زمین کی طرف لیجاتے ہیں

اور اس سے کھیتیاں اگا دیتے ہیں جس سے اُن کے چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی کھاتے ہیں۔ کیا وہ (اتنا بھی) نہیں دیکھتے؟

جو شخص اپنا کھیت پانی کے نشیب کی طرف بنائے گا اور اس کی زمین میں پیداوار کی صلاحیت ہوگی وہ فطرت کی گہرباریوں سے بہرہ یاب ہوگا۔ جو ایسا نہ کرے گا پانی کی زرریزی اس کے کسی کام نہ آئے گی خواہ علمی اعتبار سے اسے قانونِ زراعت کی تمام جزئیات تک پر بھی عبور کیوں نہ ہو۔ جو شخص سیاحتِ ارضی اور اثری انکشافات سے اس نتیجہ تک نہیں پہنچا کہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا انجام کیا ہوتا ہے اس کے سر کی آنکھیں کھلی لیکن دل کی آنکھیں اندھی رہتی ہیں۔ سورۂ نمل میں ہے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ (۲۷/۶۹)

(اے پیغمبر سلام! ان لوگوں سے) کہدو کہ ذرا زمین میں چلیں پھریں اور دیکھیں کہ مجرموں کا انجام کیسا کچھ ہو چکا ہے۔!

اور اس سے ذرا آگے چل کر فرمایا کہ

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (۲۷/۸۰-۸۱)

(اے پیغمبر سلام!) یہ حقیقت ہے کہ تم مردوں کو (اپنی باتیں) نہیں سنا سکتے اور نہ ہی اپنی پکار بہروں کو سنا سکتے ہو (خصوصاً) جبکہ وہ پیٹھ موڑ کر چل دیں۔ اور نہ ہی تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے رہنمائی کر سکتے ہو۔ تم (اچھی طرح سمجھ لو کہ) ان لوگوں کے سوا جو ہماری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں تم کسی کو (اپنی پکار) سنا ہی نہیں سکتے، چنانچہ وہی لوگ ہیں جو (ہماری) اطاعت (اور تابعداری) کرنے والے ہیں!

سیروا فی الارض

غور فرمایا آپ نے کہ علمی کاوشوں سے صحیح طور پر کون متمتع ہو سکتا ہے؟ وہی جو قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان رکھتا ہے۔ جو قوانینِ فطرت پر اس انداز سے غور نہیں کرتا اُسے اس کا علم ہلاکت سے نہیں بچا سکتا۔ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ کو تو مبدأ و معاد کی دلیلِ راہ بن جانا چاہیے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۲۹/۲۰)

(اے پیغمبر سلام!) کہدو کہ زمین میں گھومو پھرو پھر دیکھو کہ خدا نے (اپنی مخلوق کو ابتداءً کس طرح پیدا

کیا ہے۔ اور خدا کی خلاقیت ختم نہیں ہوگئی) پھر (اس کے بعد) خدا ایک دوسری مخلوق پیدا کریگا۔
بلاشبہ خدا ہر چیز پر قادر ہے!

اور اس سے اللہ کے اس قانون مشیت کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے جس کے ماتحت قوموں کے اعمال کی جزا و سزا مرتب ہوتی ہے۔

يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَإِلَيْهِ تُقْلَبُونَ ○ (۲۹/۲۱)

(یاد رکھو) وہ جسے چاہتا ہے (اپنے قانون مشیت کے مطابق) عذاب دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے رحم کرتا ہے۔ (یہ سب کچھ قانون مکافات کے مطابق ہوتا ہے) اور (خوب طرح سمجھ لو کہ) اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے!

اس قانون کی ہمہ گیری سے کائنات کے کسی گوشے میں چھپ کر بھی انسان بچ نہیں سکتا۔

وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۖ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ○ (۲۹/۲۲)

اور (ساتھ ہی یہ بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ) تم خدا کو نہ زمین میں عاجز کر سکتے ہو نہ آسمان میں اور خدا کے سوا کوئی قوت بھی تمہاری دوست اور مددگار نہیں بن سکتی!

اسی کا نام مبدأ و معاد پر ایمان ہے۔ سورۂ روم میں فرمایا۔

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنْفُسِهِمْ ۗ مَا خَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُسَمًّى ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ لَكَافِرُونَ ○ (۳۰/۸)

کیا انھوں نے خود اپنے آپ (کی تخلیق) پر غور نہیں کیا؟ (یقیناً نہیں کیا۔ کیونکہ اگر وہ غور کر لیتے تو صاف سمجھ میں آجاتا کہ) خدا نے آسمانوں اور زمین کو اور ان تمام چیزوں کو جو ان دونوں کے درمیان ہیں پیدا نہیں کیا ہے مگر حق کے ساتھ اور مدّتِ معینہ کے لئے، (مگر یہ لوگ ان حقائق پر غور ہی نہیں کرتے، سچ تو یہ ہے کہ بہت سے لوگ اپنے پروردگار سے ملنے ہی کا انکار کرنے والے ہیں!

عالمِ انفس و آفاق میں غور کرو اور دیکھو کہ کس طرح ایک محکم قانون ہر شعبۂ حیات میں نافذ العمل ہے۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَأَثَارُوا الْأَرْضَ وَعَمَرُوهَا أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (پ۲۱ — ۳۰/۹)

اور (اے پیغمبر!) کیا یہ لوگ زمین میں گھومے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ ان سے پہلے لوگوں کا انجام کیسا کچھ ہو چکا ہے۔ وہ لوگ ان لوگوں سے قوت کے اعتبار سے زیادہ مضبوط تھے اور انھوں نے زراعت کے لئے) زمین کو ان سے زیادہ پھاڑا اور آباد کیا تھا اور اُن کے پاس اُن کے رسول بھی واضح اور کھلی نشانیاں لے کر آچکے تھے۔ پھر خدا بھی (خواہ مخواہ) ان پر ظلم کرنے والا نہیں تھا۔ مگر وہ لوگ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کیا کرتے تھے۔ پھر جن لوگوں نے برائیاں کی تھیں ان کا انجام بھی بُرا ہی ہو کر رہا (کیوں؟ کیا خواہ مخواہ؟ ہرگز نہیں! بلکہ) اس لئے کہ انھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا۔ اور (صرف جھٹلایا ہی نہیں۔ بلکہ) وہ ان کا مذاق اُڑانے کے عادی ہو چکے تھے!

تاریخ واشر کے حقائق پر غور کرو اور سوچو کہ کس طرح وہی عالمگیر اور محکم قانون انسان کی حیات اجتماعیہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور اس کے بعد سوچو کہ مبدا و معاد کا قانون حق ہے یا نہیں۔

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ (پ۲۱ — ۳۰/۱۲)

اللہ ہی ابتداءً مخلوق کو پیدا کرتا ہے پھر وہی اسے دوبارہ پیدا کرتا ہے۔ پھر (اے افرادِ نسلِ انسانی!) تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے، اور (یہ اگلا سفر مکافاتِ عمل کے قانون کے ماتحت ہوگا، چنانچہ) جس دن قیامت قائم ہو جائے گی (اور ہر شخص کو اپنے اعمال کے نتائج قطعی طور پر معلوم ہو جائیں گے) اس دن یہ مجرم لوگ قطعاً مایوس ہو جائیں گے!

مبداء و معاد

یعنی یہ قانون مشیت ہے کہ ہر شئے کی تخلیق (ابتدا) ایک خاص مقصد کے ماتحت ہوتی ہے اور اس مقصد کے حصول کی خاطر وہ ایک خاص نظام اور قاعدہ کے مطابق مختلف مراحل طے کرتی آگے بڑھتی ہے حتیٰ کہ اس مقام تک پہنچ جاتی ہے جو اس کے لئے منزل قرار دیا گیا ہے۔ یہی حالت انسان کی ہے۔ لہٰذا عالم انفس و آفاق کے مشاہدات و تجارب ہوں یا انسان کی عمرانی و اجتماعی زندگی (تاریخ) کے امثال و نظائر۔ ان سب پر غور و فکر کو ایک ہی حقیقت کی طرف منجر ہونا چاہیئے۔ اور وہ مبدا و معاد کی حقیقت ہے۔ وہ قانونِ مکافاتِ عمل کی ہمہ گیری کی واقعیت ہے۔ اور اسی کا نام ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ہے۔

اگر باین نرسیدی تمام بولہبی است

پھر جیساکہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ قوانین الہیہ سے سرکشی، قوت کے گھمنڈ پر کی جاتی ہے۔ اس لئے اس حقیقت کی طرف خاص طور پر توجہ مرتکز کرائی گئی کہ سیاحت ارضی اور اثری تحقیقات سے یہ دیکھو کہ امم گزشتہ قوت و ثروت میں کچھ کم نہ تھیں۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ كَانُوا مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ وَمَا كَانَ لَهُم مِّنَ اللَّهِ مِن وَاقٍ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانَت تَّأْتِيهِمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَكَفَرُوا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّهُ قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ (۴۰/۲۱-۲۲)

اور (اے پیغمبر!) کیا وہ زمین میں گھومے پھرے نہیں کہ دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہو چکا ہے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ وہ لوگ زمین میں طاقت اور دیگر استحکامات کے لحاظ سے ان سے بہت زیادہ مضبوط تھے (مگر ان کی طاقت کچھ بھی آڑے نہ آسکی) چنانچہ خدا نے ان کے جرائم کی وجہ سے انھیں پکڑ لیا اور خدا (کے قانون مکافات کی گرفت) سے انھیں کوئی بھی بچانے والا نہ ہوا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ ان کے پاس (یکے بعد دیگرے) ان کے رسول واضح دلائل کے ساتھ آتے رہتے تھے (مگر ان کی ضد اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ کان لگا کر ان کی دعوت کو سمجھنے اور قبول کرنے کی تکلیف گوارا نہ کی) پس وہ انکار ہی کرتے رہے۔ پھر آخر۔ ایک دن وہ بھی آیا، کہ) اللہ نے انھیں پکڑ لیا (اور جسے اللہ پکڑ لے اُسے کون چھڑا سکتا ہے)۔ بلاشبہ وہ بڑی قوت کا مالک اور سخت عذاب والا ہے۔

علم و قوت کا غلط استعمال

قوت و سطوت میں ہی کم نہ تھیں بلکہ علم و دانش میں بھی۔ اسی لئے وہ اپنے علم و عقل پر اس قدر نازاں تھے کہ انھوں نے قوانین الہیہ کی پرواہ نہ کی اور یہ نہ سمجھے کہ علم بھی وہی نافع ہوتا ہے جس کا ماحصل تابع قوانینِ خداوندی رہے۔ ورنہ اگر علم و عقل انسان کی اپنی خواہشات کے تابع رہیں تو دنیا کو بدترین جہنم بنا دیتے ہیں۔ یقین نہ ہو تو پوچھو یورپ کے مدبرین سے کہ ان پر کیا گزر رہی ہے[1]؟

---

[1] اس کے لئے "انسان نے کیا سوچا" دیکھئے۔

ے أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِندَهُم مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ (۴۰: ۸۲-۸۳)

(اے پیغمبر اسلام!) تو کیا یہ لوگ زمین میں گھومے پھرے نہیں کہ دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا انجام کیسا کچھ ہو چکا ہے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ وہ لوگ زمین میں طاقت اور دیگر استحکامات کے لحاظ سے ان سے بہت زیادہ مضبوط تھے۔ مگر جو کچھ (قوت و شوکت اور سطوت و حکومت کے اعتبار سے) اُنھوں نے حاصل کر رکھا تھا، وہ ان کے کچھ بھی کام نہ آسکا۔ چنانچہ جب ان کے پاس اُن کے رسول واضح دلائل لے کر آئے، تو ران کی دعوت پر انھوں نے مطلق کان نہ لگائے، بلکہ) جو کچھ (ناقص اور شیطانی) علم ان کے پاس تھا اسی پر اکڑنے اور اترانے لگے۔ اور (آخر کار) جس چیز کا (یعنی خدا کے قانون مکافات کا) وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہ اُن پر مسلط ہو کر رہا۔

جب انھیں عذاب الٰہی گھیر لیتا ہے تو اس وقت کسی قدر جھکتے ہیں اور ایک جدید نظام عالم (New World order) کی سوجھتی ہے۔ لیکن اعمال کے ظہور نتائج کے وقت اس قسم کی اصلاحات کا خیال نفع مند نہیں ہو سکتا۔

فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَحْدَهُ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ مُشْرِكِينَ ۝ فَلَمْ يَكُ يَنفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا ۖ سُنَّتَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ ۖ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ ۝ (۴۰: ۸۴-۸۵)

پھر جب وہ عذاب دیکھ لیتے ہیں تو پکارتے ہیں کہ ہم خدائے یکتا و یگانہ پر ایمان لے آئے اور اُن (معبودان باطل) کا انکار کر دیا جنھیں ہم خدا کے ساتھ شریک کرنے والے تھے۔ مگر (اب) جبکہ وہ ہمارا عذاب دیکھ چکے ان کا یہ ایمان اُنھیں نفع نہیں دے سکتا۔ یہی خدا کا طریقہ (اور قانون) ہے جو اس کے بندوں میں ہمیشہ سے چلا آرہا ہے۔ اور اس حد پر پہنچ کر یہ انکار کرنے والے ہمیشہ خسارہ ہی میں رہتے ہیں۔

اُس وقت تباہی لازمی ہے۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۖ دَمَّرَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۖ وَلِلْكَافِرِينَ أَمْثَالُهَا ۝ ذَٰلِكَ

بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝ (۴۷/۱۱)

(اے پیغمبر اسلام!) تو کیا یہ لوگ زمین میں گھومے پھرے نہیں کہ دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا انجام کیسا کچھ ہو چکا ہے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ خدا ان پر تباہی و بربادی لے آیا۔ اور (اس کے قانونِ مکافات کے مطابق) ان انکار کرنے والوں کے لئے بھی ان ہی جیسا (انجام) ہو کر رہے گا۔ یہ اس لئے کہ اللہ صرف انہی لوگوں کا مددگار ہے جو ایمان لے آئے ہوں۔ اور (اللہ کے عذاب سے صرف اللہ ہی بچا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان انکار کرنے والوں کا کوئی مددگار ہی نہیں ہوتا۔

ہلاکت اور بربادی سے بچنے کا تو ایک ہی طریق تھا کہ یہ تومیں اپنی روشِ زندگی کو اس نظامِ الٰہیہ کے تابع رکھتیں جسے اَلدِّیْنُ الْقَیِّمُ کہا گیا ہے۔ خدائی قوانین سے انحراف یا اس کے ساتھ انسانی قوانین کا التباس کفر و شرک ہے جس کا فطری نتیجہ ہلاکت ہے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ۝ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ ۝ مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ۝ (۳۰/۴۲-۴۴)

(اے پیغمبر اسلام! ان لوگوں سے) کہہ دو کہ زمین میں گھومو، پھرو، اور دیکھو اُن کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ ان میں سے اکثر لوگ شرک کرنے والے تھے۔ تو (اے پیغمبر!) تم اپنے آپ کو دینِ قیم پر قائم رکھو، اس سے پہلے کہ خدا کی طرف سے وہ دن آ جائے جس کی واپسی (کی کوئی صورت ہی) نہیں۔ اس روز (ان کی اجتماعیت پارہ پارہ ہو جائے گی، اور) وہ سب ایک دوسرے سے الگ الگ ہو جائیں گے۔

جو حق سے انکار کرے گا تو اس کے کفر کے نتائج بھی اسی پر پڑیں گے۔ اور جو لوگ نیک کام کریں گے تو وہ اپنے لئے ہی تیاری کریں گے، (یعنی ان کے فوائد انھیں ہی حاصل ہوں گے)

جوئے رواں

پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ یہ ہلاکت اور بربادی اسی دنیا کی زندگی تک ختم نہیں ہو جاتی۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے۔ موت سے اس کا خاتمہ نہیں ہو جاتا بلکہ زندگی اس سے اگلی منزل میں قدم رکھتی ہے۔ اس لئے جس قوم پر اس زندگی میں ذلت و رسوائی کا ہلاکت آمیز

عذاب مسلط ہو جائے وہ اس سے اگلی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہو گی۔ بلکہ وہاں کی ذلت و رسوائی اس سے بھی زیادہ درد انگیز ہو گی اس لئے کہ وہاں اعمال کے نتائج زیادہ محسوس شکل میں سامنے آجائیں گے۔

كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَأَتٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ۝ فَأَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ أَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۳۹/۲۵-۲۶)

جو لوگ ان سے پہلے گزر چکے ہیں انھوں نے بھی (سچائی کو) جھٹلایا تھا چنانچہ (نتیجہ یہ) ان پر ایسی جگہ سے عذاب آگیا جہاں سے انھیں خیال بھی نہیں تھا۔ پس خدا نے انھیں زندگی میں (بھی) رسوائی (کے عذاب کے مزہ) کو چکھایا۔ اور آخرت کا عذاب تو بلا شبہ اس سے بہت بڑا ہو گا۔ کاش وہ (اس حقیقت کو) سمجھتے ہوں۔

حیاتِ اُخروی وہ آخرت کی زندگی جس میں تمام قومیں اپنے اپنے اعمالِ حیات کو ساتھ لئے نتائج کی منتظر ہوں گی۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ (۴۵/۲۷)

اور (یاد رکھو) آسمانوں اور زمین کی بادشاہت خدا ہی کے لئے ہے اور جس دن (مکافاتِ عمل کے لئے) قیامت قائم ہو جائے گی اُس دن کھلی آنکھوں نظر آجائے گا کہ باطل پرست لوگ ہی خسارہ میں ہوں گے۔

اس وقت۔

وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۣ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۴۵/۲۸-۲۹)

اور (اے پیغمبر اسلام!) تم (اس دن) ہر جماعت کو مُنہ کے بل پڑا پاؤ گے۔ ہر جماعت اپنے نامۂ اعمال کی طرف بلائی جائے گی اور (اُن سے کہا جائے گا) "جو کچھ تم کرتے رہے تھے، آج تمھیں اس کا بدلہ دیا جائے گا۔ یہ ہماری کتاب تمھارے خلاف سچائی کے ساتھ فیصلہ دے رہی ہے۔ جو کچھ تم کرتے رہتے تھے ہم لکھ لیا کرتے تھے۔

سو جن کے اعمال نے ان میں ارتقائی منازل طے کر کے بلند و بالا زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی ہو گی وہ سفرِ زندگی کے اگلے درجہ میں پہنچا دیئے جائیں گے۔

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِي رَحْمَتِهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ○ (۴۵/۳۰)

لیکن جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک کام کئے تو ان کا پروردگار انہیں اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا اور یہی کھلی ہوئی کامیابی ہے۔

اور جنہوں نے قوانین الٰہیہ سے انکار و استکبار کی روش اختیار کی ہوگی وہ مجرمین کی صف میں ہوں گے۔

وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا أَفَلَمْ تَكُنْ آيَاتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ○ (۴۵/۳۱)

لیکن جن لوگوں نے انکار کی راہ اختیار کی ہوگی (ان سے جواب طلب کیا جائے گا اور کہا جائے گا) کیا تم پر میری آیتیں نہیں پڑھی جاتی تھیں؟ (ضرور پڑھی جاتی تھیں، مگر تم نے ان کے ساتھ) غرور اور تکبر کا برتاؤ کیا اور تم تھے ہی مجرم قوم (کے افراد)

اس وقت ہر ایک کی آنکھیں دیکھ لیں گی کہ کس طرح اللہ کی جبروت و کبریائی، اس کے قوانین کی ہمہ گیری، تمام کائنات پر چھائی ہوئی ہے۔

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ○ (۴۵/۳۷)

اور (یاد رکھو) آسمانوں اور زمین میں اسی کے لئے بڑائی ثابت ہے۔ اور وہ بڑا ہی غالب اور حکمت والا ہے۔
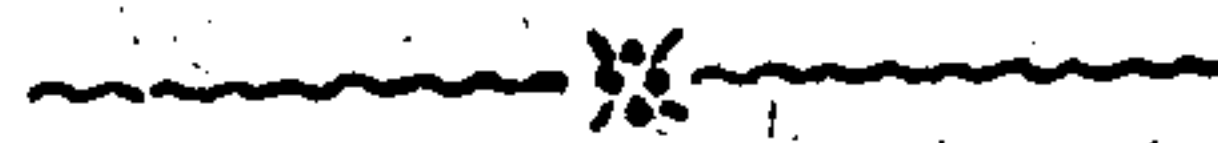
تدبر فی القرآن سے دور نگہی

ہم نے یہ دیکھ لیا ہے کہ جس طرح عالم طبیعی (physical world) میں اٹل قوانین فطرت نافذ العمل ہیں اسی طرح انسانی حیات اجتماعیہ کے متعلق بھی قوانین الٰہیہ جاری و ساری ہیں اور زندگی کا کوئی گوشہ اور کارگہ حیات کا کوئی شعبہ ان قوانین کی حدود ریاست سے باہر نہیں۔ قرآن کریم انہی احکام کا مکمل اور آخری ضابطہ ہے۔ قوانین فطرت پر گہری نگاہ رکھنے والا بیج سے پھل کا پتہ دے سکتا ہے۔ وہ سیاروں کی رفتار دیکھ کر سو سال پہلے بتا سکتا ہے کہ سورج کو گہن کب اور کس وقت لگے گا۔ ایک حکیم حاذق، مریض کی نبض کو چھو کر اور بعض اوقات فقط اس کے چہرے پر نگاہ ڈال کر اس کے مرض کے مآل و انجام کے متعلق صاف صاف بتا دیتا ہے۔ یہ سب اس لئے کہ فطرت کے قوانین اٹل ہیں۔ اٹل قوانین کے نتائج کے متعلق پہلے سے بتایا جا سکتا ہے۔ اس میں "علم غیب" کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ان قوانین کے متعلق گہری نگاہ کی ضرورت ہے۔

اور بس۔ یہی کیفیت انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے قوانین کی ہے۔ جس شخص کی نگاہ ان قوانین پر ہو وہ کسی قوم کی موجودہ روش سے بتا سکتا ہے کہ اس قوم کا انجام کیا ہوگا۔ اور چونکہ یہ قوانین، قرآن کے اندر منضبط ہیں۔ اس لئے جس دیدہ ور کی نگاہیں قرآنی حقائق کی گہرائیوں تک اُتر چکی ہوں اس میں ایسی فراست پیدا ہو جاتی ہے جس سے اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

گُلے را دید و احوالِ چمن گفت

اسی فراست کا نتیجہ ہے کہ وہ عین اُس وقت جبکہ ساری دُنیا کسی نظام تہذیب و تمدن کی تعریف و ستائش میں قصیدہ خواں ہو۔ اس کی چمک دمک سے بڑے بڑے دیدہ وروں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا ہو رہی ہو۔ عظیم الشان دانایانِ روزگار اُسے تمام انسانی مصائب و نوائب کے لئے مسیحا تصور کر رہے ہوں۔ چھوٹے بڑے اس نسخۂ کیمیا کی برکات کے معترف ہوں۔ دُنیا بھر کی قومیں اس تہذیبِ نو کی نقالی میں فخر و سعادت محسوس کر رہی ہوں۔ غرضیکہ انسان یہ سمجھ رہا ہو کہ اُس نے اس فردوسِ گم گشتہ کو پا لیا جس کی تلاش میں اُس نے ساری عمر دشت پیمائیوں اور صحرا نوردیوں میں گذاری تھی۔ وہ مردِ مومن جس کی نگاہوں میں بصیرتِ قرآنی کی روشنی جلوہ بار ہو۔ پورے حتم و یقین کے ساتھ پکار اٹھتا ہے اور اس تہذیب جدید کے جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری سے فریب کھانے والوں سے للکار کر کہہ دیتا ہے کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اس میں کسی کشف و کرامت کا دخل نہیں۔ یہ علم غیب نہیں۔ وحی و الہام نہیں۔ یہ نتیجہ ہے قرآنی حقائق پر غور و تدبر کا فرقانی معارف پر ایمان و ایقان کا۔ جس طرح ایک طبیب حاذق کی نگہ ژرف بیں فوراً بھانپ لیتی ہے کہ فلاں شخص کے چہرہ کی سرخی، خون صالح کا نتیجہ ہے یا سنکھیا کا اثر۔ اسی طرح ایک حکیم مومن کی دیدہ وری دیکھ لیتی ہے کہ فلاں قوم کے نظامِ تمدن کی چمک دمک ہیرے کی تابناکی ہے یا کانچ کی نگاہ فریبی۔ قرآن یہی نور عطا کرتا ہے جس سے انسان حق و باطل میں تمیز کر لیتا ہے اور معرکۂ حیات میں بلاخوف و خطر بڑھے چلا جاتا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِن رَّحْمَتِهِ وَيَجْعَل لَّكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○ (۵۷/۲۸)

اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو خدا کا تقویٰ حاصل کرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ خدا

تمہیں اپنی رحمت سے دوہرا حصہ دے گا اور تمہارے لئے ایک نور پیدا کر دے گا جس (کی روشنی) میں تم چل سکو گے۔ اور تمہیں بخش دے گا۔ اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا اور بہت ہی مہربان ہے۔

خود تخریبی

آگے بڑھنے سے پیشتر تہذیب حاضرہ کی خودکشی کے متذکرہ صدر "خواب" پر ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈالئے اور اس کے بعد دیکھئے کہ آج لالہ زاران مغرب میں اس خواب کی تعبیر کس طرح تڑپتی پھڑکتی انسانیت کی صورت میں محسوس و مشہود دکھائی دے رہی ہے۔ دیکھئے اور غور کیجئے کہ اس تہذیب نو کا قصر رشید کس طرح خود اپنے بوجھ سے نیچے گرا ہے اور اس گرنے میں کس طرح اس کی اینٹ سے اینٹ بج رہی ہے۔ یہ تخریب و انہدام کسی خارجی اسباب و ذرائع سے ظہور پذیر نہیں ہوا بلکہ اس حقیقت ثابتہ کی گواہی دے رہا ہے کہ اس کی تعمیر ہی خود تخریب مضمر تھی۔ اور صرف ایک تہذیب حاضرہ پر ہی کیا موقوف ہے؟ ہر وہ تہذیب جس کی بنیادیں غیر فطری خطوط پر تھیں اس کا یہی انجام ہوا۔ تاریخ انسانی پر نگاہ ڈالئے تو وہ اسی تعمیر و تخریب کی مسلسل داستان نظر آئے گی۔ قرآن کریم نے اس عظیم الشان حقیقت کو ایک نہایت لطیف استعارہ کی صورت میں بیان فرمایا ہے جہاں ارشاد ہوا ہے کہ

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَى مِنْ أُمَّةٍ إِنَّمَا يَبْلُوكُمُ اللَّهُ بِهِ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ○ (۱۶/۹۲)

اور دیکھو تمہاری مثال اس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا۔ پھر توڑ مروڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تم آپس کے معاملہ میں اپنی قسموں کو مکر و فساد کا ذریعہ بناتے ہو۔ اس لئے کہ ایک گروہ (کسی) دوسرے گروہ سے (طاقت میں) بڑھ چڑھ گیا ہے (یاد رکھو) اللہ اس معاملہ میں تمہاری راست بازی و استقامت کی) آزمائش کرتا ہے (کہ تم طاقتور گروہ کا پاس کرنے لگتے ہو یا اپنے قول و قرار کا) جن جن باتوں میں تمہارے اختلافات ہیں، ضرور ایسا ہو گا کہ وہ قیامت کے دن (حقیقت حال) تم پر آشکارا کر دے۔

ایک عجیب حقیقت

قرآن کریم کی اس چھوٹی سی مثال کو سامنے رکھئے اور پھر تاریخ کے اوراق پر غور کر کے دیکھئے کہ عبرت و موعظت کی کتنی داستانیں ہیں جو

اس کے اندر لپٹی ہوتی ہیں۔ اور انسانی نامرادیوں اور ناکامیوں کے کتنے وقائع و حوادث ہیں جو اس میں پوشیدہ ہیں۔ ہر دور کے انسان کی مساعی اور جد و جہد کی تاریخ پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ انسان اپنے لئے ایک عظیم الشان نظام تمدن تعمیر کرتا ہے۔ اس فلک بوس عمارت کی تکمیل کے لئے قسم قسم کے نوادرات جمع کرتا ہے۔ وہ عمارت اس کے تمام حسین تصورات کی مرکز۔ اس کی آرزوؤں کی محور اور اس کی تمناؤں کی آماجگاہ بنتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس عمارت کی تکمیل میں انسانیت کی تکمیل کا راز مضمر ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا وجود نوعِ انسانی کے لئے آیۂ رحمت ہے جو ان کے عدم سکون کی آگ کو تسکین و طمانیت کی جنت سے بدل دے گا۔ وہ ایک عرصہ تک اپنے تصورات کی دنیا میں محو اور اس قصر رفیع المنزلت کی تکمیل میں سرگرداں رہتا ہے۔ اور جوں جوں اس کی دیواریں اوپر کو ابھرتی ہیں اس کی مسرتوں میں بالیدگی پیدا ہوتی جاتی ہے لیکن وہ عمارت ابھی تکمیل کو بھی نہیں پہنچنے پاتی کہ دنیا اس عبرت انگیز تماشا کو اپنی آنکھ سے دیکھتی ہے کہ وہی انسان خود اپنے ہاتھوں سے اس عمارت کو زمین پر گرا دیتا ہے اور اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا وہ حسین و جمیل مرقع خاک کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے اس کی ٹھیکریاں اپنے مٹے ہوئے نقوش سے آنے والوں کو اپنی حدیثِ الم سے آگاہ کرنے کے لئے باقی رہ جاتی ہیں۔ بابل اور نینوا۔ مصر اور یونان۔ چین اور ایران کے کھنڈرات کو چشم عبرت سے دیکھئے اور پہچانئے کہ وہ کیسے کیسے عظیم المرتبت تمدنوں کے بھیانک مدفن ہیں۔ پہچانئے اور سوچئے کہ انسانوں نے اپنی محنت سے کاتے ہوئے سوت کو کس طرح بار بار خود اپنے ہاتھوں سے بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ سطح بیں نگاہوں نے ان تعمیرات کو ابھرتے دیکھا تو یقین کر لیا کہ یہ اس قدر محکم اور پائیدار ہیں کہ حوادث زمانہ کا کوئی طوفان انہیں متزلزل نہیں کر سکتا۔ لیکن حقیقت بیں نگاہوں نے ان کے ابھرنے کے ساتھ ہی محسوس کر لیا کہ یہ عمارتیں خود اپنے بوجھ سے نیچے آ گریں گی۔ اس لئے کہ ان کی بنیادیں بڑی کمزور تھیں۔ یہ وہ عمارتیں تھیں جو ہر دیکھنے والے کو پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

اس لئے کہ جس تمدن کی بنیادیں خدا شناسی و خود آگاہی پر نہیں وہ دنیا میں کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کی تعمیر میں تخریب اور آبادی میں ویرانی کے آثار موجود ہوتے ہیں۔ انسان کی بے بصری یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد کی دھن میں تخریب اور ویرانی کے ان آثار کو نہیں دیکھتا اور سمجھتا ہے کہ میری ہر کوشش نتیجہ خیز اور ہر اسکیم کامیاب ہو رہی ہے۔ ازمنۂ گزشتہ کے بعد عصر حاضر میں پہنچئے تو یہاں بھی وہی تماشا نظر آئے گا۔ جیسا کہ ابھی ابھی اوپر لکھا جا چکا ہے۔ اس زمانہ کے نظام تہذیب و تمدن کا بھی وہی حشر ہو رہا ہے جو اس سے پیشتر اس قسم کے نظامہائے زندگی کا ہوا۔ آج ساری دنیا ایک مہیب جہنم میں تبدیل ہو رہی ہے۔ خاک ارضی کا ایک ایک ذرہ انسانی خون کی

ارزانی کی زندہ شہادت بن رہا ہے۔

کیا یہ انسانیت کا خاتمہ ہے؟ تو سوال یہ ہے کہ کیا اب نوعِ انسانی کا خاتمہ ہونے والا ہے یا اس درد و کرب کے بعد دنیا کو ایک نئی زندگی (نشاۃ ثانیہ) ملنے والی ہے! کیا یہ کشت و خون اور سلب و نہب، سکراتِ موت کی ہچکیاں ہیں یا ایک عملِ جراحی ہے جس سے فاسد مادوں کے استیصال کے بعد انسانیت کی رگوں میں صالح خون دوڑایا جائے گا؟۔ اس سوال کا جواب دنیا اپنی اپنی عقل سے کچھ ہی دے۔ لیکن جس کی نگاہ قرآن پر ہے وہ پورے حتم و یقین کے ساتھ کہہ دے گا کہ یہ انسانیت کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک اور قدم اٹھ رہا ہے اس منزل کی طرف جو تمدنِ انسانیت کی معراج ہے۔ قرآن کا اعلان ہے کہ خدائی نظام کو دنیا میں بھیجا اس لئے گیا ہے کہ وہ تمام انسانی نظامہائے زندگی پر غالب آکر رہے (لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ) سو جب تک اس نظامِ خداوندی کا غلبہ نہیں ہوگا، کتابِ کائنات کا یہ باب ختم نہیں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کائنات اور اس کے مادی ارتقاء کی آخری کڑی (انسان) اس لئے نہیں بنائی گئی کہ انسانیت تجربہ کرتے کرتے ختم ہی ہو جائے۔ ہر تجربہ انسان کو اپنے بنائے ہوئے نظام کی خرابیوں سے آگاہ کر کے اس سے اعلیٰ نظام کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اور انسانیت کی تکمیل ہو نہیں سکتی جب تک وہ اعلیٰ و ارفع نظام انسانی زندگی پر مسلط نہیں ہو جاتا۔ اس نظام کے تابع انسانیت وہ ارتقائی منازل طے کرلے گی جس کے بعد وہ اس دنیا کی زندگی سے اگلی زندگی (حیاتِ اخروی) کما حقہٗ بسر کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرلے گی۔ اُس وقت یہ باب اُلٹ دیا جائے گا۔ اس سے پہلے نہیں۔ قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں اس حقیقتِ کبریٰ کی طرف اشارہ کیا ہے جب فرمایا۔

وَالْعَصْرِ ۝ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۝ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (۱۰۳)

زمانہ اس پر شاہد ہے کہ انسان یقیناً ناکام رہنے والا ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اعمالِ صالحہ کئے اور وہ ایک دوسرے کو حق اور استقامت کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔

زمانہ شاہد ہے کہ انسان نے جو نظام بھی خود وضع کیا اس کا انجام ناکامیوں اور نامرادیوں کے تلخ تجارب کے سوا کچھ نہ ہوا۔ تو سوال پیدا ہوا کہ کامیابی اور کامرانی کی کوئی صورت بھی ہے؟ جواب ملا کہ یقیناً ہے۔ اور وہ صورت یہ ہے کہ وہ نظامِ زندگی نافذ ہو جس کی بنیادیں ایمان پر مستحکم ہوں

اور جس کی تعمیر اعمال صالحہ اور حق و استقامت کی باہمی تلقین کے اجزا پر مشتمل ہو۔ یہاں پہنچ کر انسان کی ناکامیاں، کامیابیوں میں اور نامرادیاں، بہرہ مندیوں میں بدل جائیں گی یہ نظام قائم ہو کر رہے گا۔ اس لئے کہ قرآن کو دنیا میں اسی غرض کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس نظام کے علیٰ وجہ البصیرت تمام نظامہائے انسانی پر غالب آنے کے لئے تجزیاتی طریق یہ ہے کہ انسان ایک ایک نظام کو اپنے ہاتھوں سے بنائے اور خود ہی ڈھائے۔ دن بھر سوت کاتے اور شام کو خود ہی بکھیر دے۔ جب انسان خود آزما کر دیکھ لے گا کہ فی الواقع (اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ) تنہا عقل انسانی ناکامیوں کی طرف ہی لیجانے والی ہے تو اس وقت وہ اِلّا کی طرف آئے گا۔ جیسا کہ ہم "ابلیس و آدم" میں وحی کے عنوان میں بہ تفصیل لکھ چکے ہیں، انسانیت آگ اور خون کا بپتسمہ لے کر ہر بار یہ رنگ نو ابھرتی ہے۔ اور دیکھنے والی آنکھیں دیکھتی ہیں کہ اس ابھار کا رُخ ان قوانین خداوندی کی طرف ہوتا ہے جو قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں اور جو تکمیلِ شرفِ انسانیت کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہیں۔ آج بھی دنیا اس ورطۂ لَا سے اِلّا کی طرف آنے کے لئے مضطرب و بے قرار ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ سعادت کس جماعت کے حصہ میں آتی ہے کہ وہ دنیا کو اس جہنم سے کھینچ کر نجات و سعادت کی طرف لے جائے۔ پہلے خود اِلّا کا پیکر بنے اور اس کے بعد ساری دنیا کو اس قالب میں ڈھال لے۔

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر

اُمم سابقہ کے ماجریات و کیفیات کا عبرت آموز منظر دیکھتے دیکھتے۔ ہم خود اپنے احوال و ظروف میں گم ہو گئے لیکن چونکہ ان کی تفاصیل کا ابھی وقت نہیں اس لئے ہم رُکتے ہیں تاکہ اتنی مسافت سے جو نقوش ہمارے آئینۂ قلب پر مرتسم ہوئے ہیں وہ اچھی طرح ثبت ہو جائیں تو پھر آگے بڑھیں۔ بہر حال یہ تھیں اُمم سابقہ کی وہ وادیاں جن سے وہ کاروانِ رشد و ہدایت گزرا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ان اُمم و اقوام سے ہمارا اتنا ہی واسطہ ہے کہ ان کے احوال و کوائف سے ہم عبرت حاصل کریں اور دیکھیں کہ جنہوں نے اپنی روشِ زندگی آسمانی نظام کے تابع رکھی ان کا انجام کس قدر حسین و شاداب تھا اور جنہوں نے قوانین انسانی کو خضرِ راہ بنایا ان پر ہلاکت و تباہی کا رسوا کن عذاب کس طرح مسلط ہوا۔ ہمارا ان سے اتنا ہی واسطہ ہے۔ ورنہ نہ تو مٹنے والی قوموں کے اعمال کا وبال

ہم پر پڑ سکتا ہے اور نہ ہمارے اسلاف کا دور عروج و سطوت ہمارے لئے وجۂ سرفرازی ہو سکتا ہے
انھیں جو کچھ ملا ان کے اعمال کی بدولت ملا۔ ہمیں جو کچھ ملے گا ہمارے اعمال کی بدولت ملے گا۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (۲/۱۴۱)

(اور پھر جو کچھ بھی ہو) یہ ایک امت تھی جو گذر چکی۔ اس کے لئے وہ تھا جو اس نے اپنے عمل سے کمایا۔ تمھارے لئے وہ ہوگا، جو تم اپنے عمل سے کماؤ گے۔ تم سے کچھ اس کی پوچھ گچھ نہیں ہوگی کہ اُن کے اعمال کیسے تھے۔

حضراتِ انبیائے کرام کا تذکارِ جلیلہ جس کی ابتداء حضرت نوحؑ سے ہوئی تھی، جوئے نور۔ برقِ طور اور زیر نظر مجلد میں، حضرت عیسیٰؑ تک پہنچ گیا۔ اب اس کے بعد، اُس ذاتِ گرامیؐ کا اُسوۂ حسنہ وجہِ تازگیٔ نظر ہوگا۔ جس پر اس سلسلۂ (نبوت) کا اختتام ہو گیا۔ اس کے لئے اس سلسلہ کی اگلی کڑی (معراجِ انسانیت) ملاحظہ فرمایئے۔ اس سے اس آسمانی دعوت کی مکمل تاریخ آپ کے سامنے آجائیگی۔

والسلام

اتحاد پریس نبل روڈ لاھور میں چھپا

کتبہٗ سعید

25

باسمہٖ تعالیٰ

سلسلۂ معارف القرآن

شعلۂ مستور

حضرت زکریا۔ حضرت یحییٰ۔ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کا تذکار جلیلہ۔
سلسلۂ انبیائے کرام پر نگہ باز گشت۔ اور اقوام عالم کے عروج و زوال کے
ابدی اصول

پرویز

شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام۔ لاہور